MAUL - 502

ایم.اے.اُردو

سمسٹر اوّل

MASTER OF ARTS (URDU)

FIRST SEMESTER

نظم – ۱

NAZM - 1

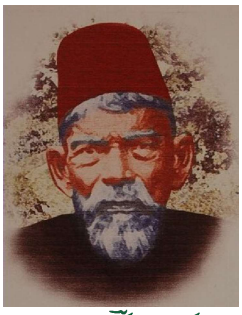

اکبر حسین اکبرالہ آبادی

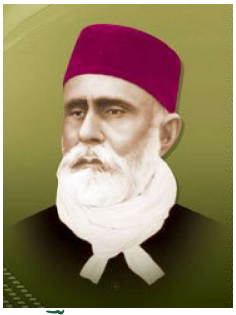

خواجہ الطاف حسین حالی

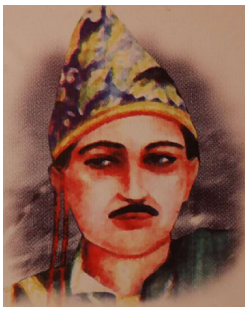

نظیر اکبرآبادی

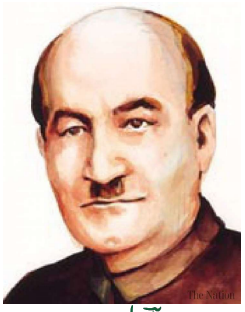

جوش ملیح آبادی

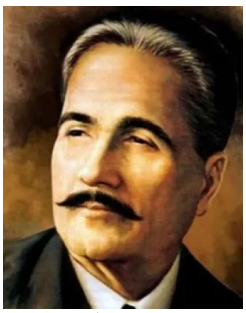

ڈاکٹر محمد اقبال

پنڈت برج نرائن چکبست

دُرگا سہائے سرور جہان آبادی

اُترا کھنڈ اوپن یونی ورسٹی، ہلدوانی (نینی تال)

SCHOOL OF HUMANITIES

UTTARAKHAND OPEN UNIVERSITY

HALDWANI (NAINITAL) - 263139

ایم.اے.اُردو

MASTER OF ARTS (URDU)

سالِ اوّل

FIRST YEAR

سمسٹر اوّل

FIRST SEMESTER

ایم.اے.یو.ایل. - ۵۰۲ - نظم - ۱

MAUL - 502 - NAZM - 1

اُترا کھنڈ اوپن یونی ورسٹی، ہلدوانی (نینی تال)

SCHOOL OF HUMANITIES

UTTARAKHAND OPEN UNIVERSITY

HALDWANI (NAINITAL) - 263139

سرپرستِ اعلیٰ:

پروفیسر او. پی. ایس. نیگی، وائس چانسلر، اُترا کھنڈ اوپن یونی ورسٹی، ہلدوانی۔

کمیٹی بورڈ آف اِسٹڈیز:

پروفیسر رینو پرکاش (ڈائریکٹر اسکول آف ہیومنٹیز (SOH) اُترا کھنڈ اوپن یونی ورسٹی (UOU)، ہلدوانی۔

پروفیسر توقیر احمد خاں، ریٹائرڈ پروفیسر شعبۂ اردو، دہلی یونی ورسٹی، دہلی۔

پروفیسر سید محمد ارشد رضوی، گورنمنٹ رضا پی. جی. کالج، رام پور۔

شہپر شریف، اسسٹنٹ پروفیسر شعبۂ اردو، اُترا کھنڈ اوپن یونی ورسٹی، ہلدوانی۔

محمد افضل حسین، اسسٹنٹ پروفیسر و کورس کوآرڈِنیٹر شعبۂ اُردو، اُترا کھنڈ اوپن یونی ورسٹی، ہلدوانی۔

رجسٹرار:

پروفیسر پی. ڈی. پنت، اُترا کھنڈ اوپن یونی ورسٹی، ہلدوانی۔

کورس کوآرڈِنیٹر وایڈیٹر:

محمد افضل حسین (اُستاد بریلوی)

صدرِ شعبۂ اردو، اُترا کھنڈ اوپن یونی ورسٹی، ہلدوانی

C جملہ حقوق بحقِ ناشر محفوظ ہیں

اس کتاب کا کوئی بھی حصّہ کسی بھی شکل میں یونی ورسٹی کی تحریری اجازت کے بغیر شائع نہ کیا جائے۔ یہ کتاب ''اُترا کھنڈ اوپن یونی ورسٹی، ہلدوانی'' کے ایم.اے. اردو سالِ اوّل، سمسٹر اوّل، نظم-۱ کے نصاب کا جزو ہے۔ مزید معلومات یا کسی بھی وضاحت کے لئے یونی ورسٹی حکّام یا صدرِ شعبۂ اردو سے یونی ورسٹی کے حسبِ ذیل پتے پر رابطہ قائم کیا جا سکتا ہے۔

DEPARTMENT OF URDU

UTTARAKHAND OPEN UNIVERSITY

UNIVERSITY ROAD, BEHIND TRANSPORT NAGAR (Teenpani Bypas)

HALDWANI-263139 Phone:05946-261122

پیش لفظ

اُترا کھنڈ اوپن یونی ورسٹی کا قیام اُترا کھنڈ قانون ساز اسمبلی کے ایک ایکٹ کے تحت ۳۱/اکتوبر ۲۰۰۵ء کو عمل میں آیا جس کا مقصد آبادی کے بڑے حصے کی تعلیمی ضرورتوں کی تکمیل اور فاصلاتی طریقۂ تعلیم کے ذریعے اُن لوگوں تک تعلیم پہنچانا ہے جو کسی مصروفیت یا مجبوری کے سبب کالجز یا یونی ورسٹیز تک نہیں پہنچ پاتے ہیں۔ یونی ورسٹی کے تعلیمی پروگرام ''ماسٹر آف آرٹ'' کے تحت ''ایم.اے. اردو'' بھی شامل ہے۔ یہ کتاب ایم.اے. اردو سالِ اوّل، سمسٹر اوّل، نظم-۱ کے نصاب میں شامل ہے جس کا نام ''ایم.اے. یو.ایل-۵۰۲-نظم-۱ ہے۔ یہ کتاب ۸/۱ اکائیوں پر مشتمل ہے جو الگ الگ موضوعات پر مختلف اسباق ہیں۔

عزیز طلبا و طالبات!

فاصلاتی طریقۂ تعلیم کی کتابوں کو {خودتدریسی مواد، SLM}(Self Learning Materials) کہا جاتا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ طالبِ علم کو یہ مواد خود ہی پڑھنا ہوتا ہے۔ روایتی درس گاہوں کے خلاف اِسے پڑھانے کے لئے آپ کے سامنے استاد موجود نہیں رہے گا بلکہ آپ یہ مواد خود ہی پڑھیں گے اور سمجھیں گے۔ اِس صورتِ حال کے تحت اسباق کو اِس طرح تیار کیا گیا ہے کہ آپ کو کلاس میں موجودگی کا احساس ہو اور کلاس میں نہ ہونے کی کمی کافی حد تک دُور ہو سکے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر اکائی کا آغاز اغراض و مقاصد سے کیا گیا ہے تاکہ آپ کو اندازہ ہو سکے کہ اُس اکائی کو پڑھنے کا مقصد کیا ہے؟ اُس کے بعد تمہید دی گئی ہے جس میں سبق کو مختصر انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ اکائی کے درمیان ''اپنے مطالعے کی جانچ'' کے تحت کچھ سوالات بھی دِیے گئے ہیں تاکہ آپ نے جو کچھ پڑھا ہے اُسے کس حد تک ذہن نشین کیا ہے؟ اِس بات کا اندازہ ہو سکے۔ اُن سوالات کے جوابات آخر میں دِیے گئے ہیں لیکن آپ کو چاہیے کہ پہلے خود اُن سوالات کے جوابات دیں پھر آخر میں دِیے گئے جوابات سے اپنے جوابات ملالیں تاکہ آپ کو اپنی صلاحیت کا اندازہ ہو اور آپ کی ذہنی ورزش بھی ہو جائے۔ امتحان میں آپ سے جس طرح کے سوالات پوچھے جائیں گے اُس کے نمونے بھی دِیے گئے ہیں۔ ساتھ ہی ہر اکائی کے آخر میں مشکل الفاظ کے معانی اور حوالہ جاتی کتب کے نام بھی دِیے گئے ہیں تاکہ آپ اُن کے مطالعے سے اپنی معلومات میں مزید اضافہ کر سکیں۔

ہم آپ کی کامیابی کے لئے دعائیں اور نیک خواہشات پیش کرتے ہیں۔

ایڈیٹر

ایم.اے.اُردو

(M.A.URDU)

سالِ اوّل

FIRST YEAR

سمسٹر اوّل

FIRST SEMESTER

ایم.اے. یو.ایل.-۵۰۲-نظم-۱

MAUL - 502, NAZM - 1

اکائی نمبر	مضمون	مضمون نگار	صفحہ
بلاک نمبر01:			**05**
اکائی 1	اردو نظم: تعریف اور تاریخی ارتقا	محمد افضل حسین	06
اکائی 2	شیخ ولی محمد نظیر اکبر آبادی.....آدمی نامہ''	محمد افضل حسین	42
اکائی 3	خواجہ الطاف حسین حالی.....'برکھا رُت''	محمد افضل حسین	58
اکائی 4	اکبر حسین اکبر الہ آبادی.....''فرضی لطیفہ''	پروفیسر محمد نعمان خاں	82
اکائی 5	دُرگا سہائے سرور جہان آبادی.....''مادرِ ہند''	ڈاکٹر شریف احمد قریشی	96
بلاک نمبر02:			**117**
اکائی 6	پنڈت برج نرائن چکبست.....''آوازۂ قوم''	ڈاکٹر شریف احمد قریشی	118
اکائی 7	شیخ محمد اقبال.....''ساقی نامہ، جبریل و ابلیس''	محمد افضل حسین	139
اکائی 8	جوش ملیح آبادی..''بدلی کا چاند، شکستِ زنداں کا خواب''	محمد افضل حسین	165

بلاک نمبر 01

اکائی 01	اردو نظم: تعریف اور تاریخی ارتقا	محمد افضل حسین
اکائی 02	شیخ ولی محمد نظیر اکبر آبادی.....''آدمی نامہ''	محمد افضل حسین
اکائی 03	خواجہ الطاف حسین حالی.....''برکھا رُت''	محمد افضل حسین
اکائی 04	اکبر حسین اکبر الہ آبادی.....فرضی لطیفہ''	پروفیسر محمد نعمان خاں
اکائی 05	دُرگا سہائے سرور جہان آبادی.....''مادرِ ہند''	ڈاکٹر شریف احمد قریشی

اکائی 01 : اُردو نظم: تعریف اور تاریخی ارتقا

ساخت :

01.01 : اغراض ومقاصد

01.02 : تمہید

01.03 : نظم کی تعریف

01.04 : دکن میں اردو نظم

01.05 : شمالی ہند میں اردو نظم

01.06 : ۱۸۵۷ء کے بعد اردو نظم

01.07 : جدید نظم کا آغاز

01.08 : ۱۹۳۶ء سے قبل اہم نظم نگار شعرا

01.09 : ۱۹۳۶ء کے بعد ترقی پسند تحریک کے اہم نظم نگار شعرا

01.10 : ۱۹۳۶ء کے بعد حلقۂ اربابِ ذوق کے اہم نظم نگار شعرا

01.11 : ۱۹۶۰ء کے بعد اردو نظم نگاری

01.12 : خلاصہ

01.13 : فرہنگ

01.14 : سوالات

01.15 : حوالہ جاتی کتب

01.01 اغراض ومقاصد

اُردو ادب میں شاعری کا مطالعہ کرتے ہوئے مختلف اصناف کا ذِکر آتا ہے۔ مثلاً غزل، رباعی، قطعہ، مرثیہ، مثنوی اور قصیدہ وغیرہ۔ نظم بھی اردو ادب کی ایک اہم شاخ ہے جسے بطورِ صنف قبول کیا جا چکا ہے۔ جس طرح آپ ناول اور افسانے کا مطالعہ کرتے ہیں۔ اسی طرح نظم کا مطالعہ بھی ضروری ہے۔ انسانی زندگی کے حقایق کو جب فکشن میں پیش کیا جاتا ہے تو اس کے اثرات جس طرح انسانی ذہنوں پر مرتّب ہوتے ہیں اسی طرح شاعری میں بھی ذہنوں پر مرتّب ہوتے ہیں۔ اسی طرح شاعری میں بالخصوص جب آپ نظموں کا مطالعہ کریں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ زندگی اور تہذیبِ انسانی کے کیسے کیسے موضوعات کو نظم کے پیکروں میں پیش کیا جاتا ہے۔ نظم کے مطالعے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ آخر غزل یا دوسری اصنافِ شعر سے، نظم کس طرح اور کن بنیادوں پر مختلف یا ممیّز ہے۔

01.02 تمہید

نظم کو اردو میں ایک خاص اہمیت حاصل ہے جب کہ غزل اردو ادب کی ایک معروف ومقبول ترین صنف ہے۔ اس کے علاوہ قصیدہ، مثنوی اور مرثیہ کو بھی کافی مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔ لیکن یہ سب مروّجہ اور روایتی اصنافِ سخن ہیں۔ نظم میں کسی ایک موضوع پر تسلسل کے ساتھ اظہارِ خیال کیا جاتا ہے اور نظم کے اندر ایک سے زیادہ موضوعات بھی ہو سکتے ہیں لیکن یہ سب ایک بنیادی موضوع کے تحت یا اس سے منسلک ہوتے ہیں۔ نظم کا ایک مرکزی خیال ہوتا ہے جس کے تحت نظم کے تمام اشعار ایک دوسرے سے پیوستہ ہوتے ہیں۔ ارتقا بھی نظم کی ایک خصوصیت ہے۔ طویل نظموں میں یہ ارتقا صاف دکھائی دیتا ہے جب کہ مختصر نظموں میں یہ ارتقا واضح نہیں ہو پاتا اور اکثر وبیش تر ایک تاثر کی شکل میں اُبھرتا ہے۔ اردو شاعری میں موضوعاتی نظمیں آزادی سے قبل بھی تھیں۔ اگر تاریخ کے دامن میں جھانکا جائے تو ماضی کے دامن میں نظم کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں جو کہ اس دور کے مختلف اصنافِ ادب میں بکھری ہوئی ہیں۔ اردو نظم کے سلسلے میں ہم اس بات کو بھی نظر انداز نہیں کر سکتے کہ مغربی شاعری اور نظم نگاری سے متاثر ہونے کے ساتھ ساتھ اس کا رشتہ اردو شاعری کی قدیم روایت سے بھی گہرا رہا ہے۔ اسی لئے اردو شاعری کی قدیم روایت کے وہ حصے خاص اہمیت کے حامل ہیں جو نظم کو جدید صورت میں تشکیل دینے میں مفید و معاون ثابت ہوتے ہیں۔

01.03 نظم کی تعریف

نظم کی کوئی مکمّل تعریف اب تک سامنے نہیں آسکی ہے۔ کبھی نثر کی ضد کے طور پر نظم تو کبھی غزل کے علاوہ دیگر تمام اصناف پر نظم کا اطلاق ہوتا رہا ہے جیسے قصیدہ، مثنوی، شہر آشوب، مسدّس، مخمّس اور مرثیہ وغیرہ، لیکن ہم جس صنف ''نظم'' کی بات کر رہے ہیں اس کی اپنی الگ شناخت ہے۔ نظم کی بنیادی خصوصیت ہے کہ اس میں جذبات یا تاثّرات کی تجزیاتی پیش کش انفرادی اور اجتماعی بھی ہو سکتی ہے۔ اس کی تعریف کچھ یوں ہو سکتی ہے کہ ایک ایسی منظوم تخلیق جس میں ایک مرکزی خیال ہو اور جس میں ارتقائی عمل کارفرما ہو۔ حالاں کہ یہ بحث ہوتی رہی ہے کہ ایک اختتام رکھنے کے باوجود نظم میں ارتقا ضروری نہیں۔ مرکزی خیال کا ہونا نظم کی بنیادی خصوصیت ہے اور ربط و تسلسل بھی، لیکن نئی نظموں میں اس کی نفی بھی ہوتی رہی ہے۔

01.04 دکن میں اردو نظم

اُردو نظم کا پہلا گہوارہ سرزمینِ دکن ہے۔ اس کی ابتدا نویں صدی ہجری میں ہوئی ہے۔ دکنی شاعری کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلا دَور جو چودھویں، پندرھویں صدی عیسوی تک محیط ہے، تاریخ میں بہمنی دور کہلاتا ہے جب کہ دوسرا دَور سولھویں، سترھویں صدی عیسوی پر پھیلا ہوا ہے۔ یہ قطب شاہی دَور کے نام سے مشہور ہے۔ ادبی اور شعری نقطۂ نظر سے یہ دَور بہت اہمیت رکھتا ہے۔ اس دور کے مشہور شعرا میں محمد قلی قطب شاہ، عبداللہ قطب شاہ، وجہی، غواصی، رستمی اور ابنِ نشاطی وغیرہ کے نام اہمیت کے حامل ہیں۔

حضرت بندہ نواز گیسو دراز رحمۃ اللہ علیہ دکن کے مشہور صوفی بزرگ گزرے ہیں۔ آپ نے تصوّف پر کچھ رسالے اور اس کے علاوہ کچھ نظمیں بھی کہیں۔ آپ کا تخلص شہباز تھا۔ آپ کی نظم ''چکّی نامہ'' کا ذکر بخوبی ملتا ہے۔ نظم کے فارم میں چکی کے گیت کی شکل میں عورتوں کو مذہبی عقائد یاد دلائے ہیں۔ بندہ نواز گیسو دراز کے والدِ محترم سید حسینی شاہ راجو کی بھی چند نظمیں ملتی ہیں۔ سلطان محمد قلی قطب شاہ صاحبِ دیوان شاعر گزرا ہے۔ اس کی نظمیں مختلف موضوعات پر ہیں۔ ان نظموں میں صحیح معنوں میں ہندوستانی تہذیب کی ترجمانی ہوتی ہے۔

قلی قطب شاہ کی نظموں میں موضوع کا ربط تو ملتا ہے لیکن منطقی ارتقا اور تعمیر کی کمی صاف جھلکتی ہے۔ان کی نظموں میں گہرائی اور گیرائی نہیں ملتی پھر بھی یہ نظم نگاری کی ابتدائی کوششوں میں سے ہیں۔اس لئے ان کی اہمیت اپنی جگہ قائم ودائم ہے۔

01.05 شمالی ہند میں اردو نظم

شمالی ہند میں افضل جھنجھانوی اور جعفر زٹلی کے یہاں اردو نظم کے ابتدائی نمونے مل جاتے ہیں۔افضل جھنجھانوی کی بکٹ کہانی میں ۱۳۲۵/اشعار ہیں۔یہ ایک منظوم افسانہ ہے جو بارہ ماسہ کے طرز پر لکھا گیا ہے۔افضل کو اپنی جوانی کے آخری دنوں میں ایک ہندو عورت سے محبت ہوجاتی ہے۔وہ اپنے معلّمی کے پیشے کو ترک کردیتے ہیں۔وہ عورت اپنا ہاتھ افضل کے ہاتھ میں دے دیتی ہے۔اس نظم میں افضل نے پتی ورتا عورت کے جذبات وکیفیات کی مکمل تصویر کھینچنے کی کوشش کی ہے،جس میں کسی حد تک وہ کامیاب بھی رہے ہیں۔میر حسنؔ نے اسے شمالی ہند کی نمائندہ اور قابلِ قدر تصنیف قرار دیا ہے۔محمود شیرانی تو اسے اردو نظم کی اہم کڑی شمار کرتے ہیں۔دیگر ناقدین اور تذکرہ نگار بھی اس کی اہمیت کے قائل ہیں۔جعفر زٹلی نے ہجویہ نظموں پر خاص توجہ دی۔ان کی نظم ''انقلابِ زمانہ'' کافی مشہور ومقبول ہوئی۔

01.06 ۱۸۵۷ء کے بعد اردو نظم

تاریخی اعتبار سے دیکھا جائے تو اٹھارہویں صدی کے شروع میں ہی اردو ادب دکن سے شمال یعنی دہلی کی طرف آمادۂ سفر ہوجاتا ہے۔۱۸۵۷ء سے پہلے تک کا دَور نظم کے مقابلے میں غزل کی ترویج وترقّی کا دَور ہے۔غزل داخلی کیفیات واحساسات کی پیش کش کا اہم اور اثر انگیز ذریعہ رہی ہے۔چنانچہ اس زمانے میں نظمیں مختلف ہیئتوں یعنی مثنویوں یا قصیدوں کی شکل میں ضرورت کے تحت لکھی جاتی رہیں لیکن غزل کو عروج حاصل ہوا۔۱۸۵۷ء کی ناکام جنگِ آزادی کے بعد سیاسی،سماجی،،تعلیمی اور اقتصادی ماحول میں تبدیلی پیدا ہوئی۔ہندوستانیوں کے ذہن پر اس کے گہرے اثرات مرتّب ہوئے۔اسی زمانے میں اصلاحی تحریکیں بھی چلتی رہیں۔بہت سے ہندوستانیوں نے انگریزی تہذیب اور زبان سے دوری اختیار کی تو بہتوں نے انگریزوں کی تہذیبی وتعلیمی سطح تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کی۔پروفیسر احتشام حسین لکھتے ہیں:

> ''بنے بنائے راستوں پر چلنا ممکن نہ تھا اور نئے راستے اچھی طرح بنے نہ تھے،پرانے خیالات سے چھٹکارا حاصل نہیں ہوا تھا۔نئے خیالات نے ذہنوں میں جگہ نہیں بنائی تھا۔''
>
> (عکس اور آئینے ۱۹۶۲ء،ص۔۱۵۵)

انیسویں صدی کا یہ دَور کشمکش کا دَور تھا۔جس طرف اوپر کے اقتباس میں اشارہ ملتا ہے۔اسی زمانے میں سرسیّد نے ''تہذیب الاخلاق'' میں اپنے موقف کا اظہار کیا کہ ہمیں یوروپین لٹریچر اور سائنس کی تعلیم حاصل کرنی چاہئے اور اگر ممکن ہو تو آکسفورڈ اور کیمبرج جاکر بھی اعلیٰ ڈگریاں حاصل کریں۔اس ترغیب ومیلان سے ایک طرح کی بیداری پیدا ہوئی اور اس کا اثر ہر میدان میں نظر آنے لگا۔جب انگریزی شاعری سے ہم آہنگی پیدا ہوئی تو اردو شعرا کو اپنی ابتذال پسندی اور فرسودگی کا احساس ہوا۔

01.07 جدید نظم کا آغاز

جدید نظم کے آغاز کا سہرا محمد حسین آزاؔد اور حالؔی کے سر جاتا ہے۔ کرنل ہالرائیڈ کے مشورے اور لاہور کے ہندو مسلم اور سکھ علما و فضلا کی مدد سے ۲۱/جنوری ۱۹۶۵ء کو محمد حسین آزاؔد نے ''انجمنِ پنجاب'' قائم کی۔ تاکہ اپنے مقصد کی کامیابی کے لئے ایک پلیٹ فارم مل سکے۔ انجمنِ پنجاب کا قیام ایک تاریخی قدم تھا۔ کرنل ہالرائیڈ اس انجمن کے صدر تھے۔

اُنہی کی صدارت میں آزاؔد نے ۱۸۶۷ء میں ''انجمنِ پنجاب'' کے جلسے میں انگریزی شاعری سے استفادے اور اس کی افادیت پر روشنی ڈالی لیکن اس سے پہلے غلام مولیٰ قلقؔ کی پندرہ انگریزی نظموں کے منظوم ترجمے ''جواہرِ منظوم'' کے نام سے ۱۸۶۴ء میں شایع ہو چکے تھے۔ اس زمانے میں انگریزی نظموں سے استفادے کی ایک تحریک سی چل پڑی تھی۔ اس حوالے سے آزاؔد، اسماعیؔل میرٹھی، حالؔی اور نظم طباطبائی وغیرہ کے نام اہم ہیں۔ ذرا سا آگے چلیں تو عبدالحلیم شرؔر، ضامؔن، سرؔور جہان آبادی، نادر کاکوروی اور عزیز لکھنوی وغیرہ کے نام آتے ہیں۔ بہرحال انگریزی نظموں کے ترجمے سے اردو شاعری کا میلان اس کی طرف ہوا۔ اسی احساس نے محمد حسین آزاؔد کو بھی ایک باضابطہ تحریک کی طرف مائل کیا اور انہوں نے پہلے تو اگست ۱۸۶۷ء میں ایک تقریر کی جس کا عنوان تھا ''نظم اور کلامِ موزوں کے باب میں خیالات''۔ اس کے بعد ۱۹/اپریل ۱۸۷۴ء میں ایک تقریر کے بعد ''شبِ قدر'' کے عنوان سے ایک نظم مثنوی کے فورم میں سنائی۔

اس جلسے میں کی گئی ان کی تقریر کا یہ اقتباس اہم ہے:

> ''میں نثر کے میدان میں بھی سوار نہیں، پیادہ ہوں اور نظم میں خاک افتادہ، مگر سادہ لوحی دیکھو کہ ہر میدان میں دَوڑنے کو آمادہ ہوں۔ یہ فقط اس خیال سے ہے کہ میرے وطن کے لئے شاید کوئی کام کی بات نکل آئے۔ میں نے آج کل چند نظمیں مثنوی کے طور پر لکھی ہیں۔ جنہیں نظم کہتے ہوئے شرمندہ ہوتا ہوں اور ایک مثنوی جورات کی حالت میں لکھی ہے گزارش کرتا ہوں۔ (مجموعۂ نظم)

01.08 ۱۹۳۶ء سے قبل اہم نظم نگار شعرا

ترقّی پسند تحریک شروع ہونے سے پہلے جن شعرا نے اردو نظم نگاری کے ارتقا میں اہم کردار نبھایا، ان پر مختصر روشنی ڈالی جائے گی۔ مثلاً محمد حسین آزاؔد، خواجہ الطاف حسین حالؔی، شبلی نعمانی، درگا سہائے سرؔور جہان آبادی اور علامہ اقبالؔ یکے بعد دیگرے سب پر اجمالاً تبصرہ کیا جائے گا۔

﴿۱﴾ محمد حسین آزاؔد: سب سے پہلے ہم نظم نگاری کی تحریک کی کامیابی میں محمد حسین آزاؔد پر بات کرتے ہیں۔ محمد حسین آزاد کا دل اپنے دور کی فرسودہ شاعری سے اُچاٹ ہو چکا تھا۔ جس دور میں آزاد لاہور گئے، اس وقت قدیم شاعری کی بنیاد متزلزل ہونے لگی تھی۔ شروع میں وہ کچھ دنوں تک نواب لیفٹیننٹ گورنر پنجاب کے سکریٹری بھی رہے جن کی کوششوں اور کرنل ہالرائیڈ کے مشورے سے وہاں ''انجمنِ پنجاب'' کا قیام عمل میں آیا۔ آزاؔد کے ذہن میں اردو شاعری میں ایک خاص رنگ کے اضافے کا خاکہ پہلے سے موجود تھا۔ انہوں نے ۱۵/اگست ۱۸۶۷ء کے ایک جلسے، منعقدہ زیرِ اہتمام ''انجمنِ پنجاب'' میں ایک تقریر کی تھی جس کا موضوع تھا۔

''نظم اور کلامِ موزوں کے باب میں خیالات''، جس کا اقتباس ذیل میں پیش ہے:

''اکثر اشخاص علی العموم فنِ شعر کو گمراہی خیال کرتے ہیں اور فی الحقیقت حال ایسا ہی ہے.....
شاعروں کی بدزبانی اور بدخیالی سے شعر بھی تہمتِ کفر سے بدنام نہیں ہوسکتا.....خیالاتِ پاک جوں جوں بلند ہوتے ہیں، مرتبۂ شاعری کو پہنچ جاتے ہیں۔ ابتدا میں شعر گوئی حکما اور علمائے متبحر کے کمالات میں شمار ہوتی تھی اور ان تصانیف میں اور حال کی تصانیف میں فرق بھی زمین و آسمان کا ہے۔''

آزاد کے ذہن میں شعر کی تعمیرِ نو کا جو خاکہ موجود تھا وہ ۸/مئی ۱۸۷۴ء والے جلسے میں اور صاف ہوگیا جس میں تقریر کے بعد آزاد نے اپنی نظم ''شبِ قدر'' سنائی تھی جو آئندہ مشاعرے کے لئے ایک نمونہ بن گئی۔ خیال رہے یہ ''شبِ قدر'' وہ نہیں جو رمضان المبارک میں آتی ہے اور جسے لیلۃ القدر سے موسوم کیا جاتا ہے۔ دراصل اس میں رات کی اہمیت اور غرض و غایت بتائی گئی ہے کہ ''رات'' طالب علموں کے لئے کس درجہ مفید و معاون ہے۔ مشہور محقق پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی نے نظم ''شبِ قدر'' کو نئی شاعری کی پہلی نظم قرار دیا ہے۔

چند اشعار ملاحظہ فرمائیے:

ہیں مدرسہ کے طالبِ علم اور ذکر میں — بیٹھے ہیں امتحان کے دینے کی فکر میں
کرتے کبھی سوال ہیں آپس میں دَور سے — کرتے کبھی مطالعہ ہیں اور طور سے
پر دیکھیے کہ لایقِ انعام کون ہو — کل کامیاب کون ہو، ناکام کون ہو
پڑھ لو جو کچھ کہ پڑھنا ہے، شب درمیان ہے — کل اپنی اپنی جان ہے اور امتحان ہے

اسی طرح آزاد نے ''رات'' کی کئی اہم جہتوں کو اس نظم میں سمویا ہے۔ اس نظم کا وہ حصہ بھی کافی اہم ہے جس میں ماں کی بے قراری اپنے شیر خوار بچے کے لئے دکھائی گئی ہے۔ ان اشعار کو ملاحظہ کیجیے:

ماں کو جو اپنے بچے سے الفت کمال ہے — اِس دم بھی دیکھو اُس کو اُسی کا خیال ہے
ہر چند کام کاج میں ہے گھر کے تھک رہی — پر اُس کو ہاتھ سے ہے برابر تھپک رہی
کہتی ہے یہ کہ مجھ کو پڑے یا نہ کل پڑے — ایسا نہ ہو کہ چونک کے بچہ اُچھل پڑے
ماں کو تو سوتے جاگتے اُس کا ہی دھیان ہے — کروٹ نہیں بدلتی کہ ننھی سی جان ہے

آزاد کی اس نظم میں محاکاتی عناصر موجود ہیں۔ اس نظم میں تراکیب سیدھی ہیں۔ کوئی بات حقیقت اور نیچر کے خلاف نہیں ہے۔ نیچرل شاعری میں منظر نگاری اور فطرت کی عکاسی بھی شامل ہے۔ لہٰذا آزاد و حالی یا اس تحریک سے وابستہ دیگر شعرا نے بھی کائنات اور مناظرِ قدرت کو اپنی نظموں کا موضوع بنایا۔ اس طرح ''انجمنِ پنجاب'' کے تحت یا اس کی تحریک پر جن لوگوں نے نظمیں کہیں ان میں مناظرِ قدرت کی تصویر کشی کو زیادہ اہمیت دی گئی۔ ساتھ ہی ہماری زندگی اور معاشرے کی حقیقت کو موضوعِ سخن بنایا گیا۔ مناظرِ فطرت کی عکاسی میں ان کے سامنے انیس و دبیر کی شاعری ممد و معاون ثابت ہوئی۔

دوسری طرف انگریزی شاعری سے بھی آزاد نے استفادہ کیا ہے۔ معلوم نہیں آزاد قوم اور ملک کی قسمت کو بدلنے میں کامیاب ہوئے کہ نہیں لیکن اتنا ضرور ہوا کہ ان کی تحریک اور طرزِ شاعری سے اردو نظم نگاری کو ایک نئی سمت مل گئی اور یہ کہنا بھی بجا ہوگا کہ یہیں سے ایک مستحکم بنیاد تیار ہوئی جس پر نظمِ جدید کی عمارت ٹکی ہوئی ہے۔ شاید آج کے شعرا کو اس فیشن زدہ دَور میں اس کا احساس نہ ہو اور انہیں محسوس نہ ہو کہ آزاد کی شاعری سے آج کی نظم نگاری کا کیا تعلق ہے؟ مگر خیال رہے جس طرح آزاد نے موضوعاتی نظم نگاری کی تحریک چھیڑی تھی اس کی نظیر اُردو شعر و ادب کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ آج جس تحریک کو بے تعلق اور فرسودہ تصوّر کر رہے ہیں وہ اپنے عہد میں جدید تھی۔ شاید اسی لئے آزاد کو مخالفت اور موافقت دونوں طرح کے خیالات کا سامنا کرنا پڑا۔

حاصلِ کلام یہ کہ آزاد نے شعرا کی ایک کھیپ تیار کر دی جس کی مدد سے جدید نظم نگاری کا قافلہ اپنی منزل کی طرف بڑھتا گیا۔ آزاد نے پابند نظموں کے ساتھ ساتھ قوافی کی پابندیوں کے بغیر بھی نظم کہی جو کہ مستقبل کے جدید شعرا کے لئے مشعلِ راہ کا درجہ رکھتی ہے۔ مولوی ذکاء اللہ دہلوی کی فرمائش پر ''جغرافیہ طبعی کی پہیلی'' نظم لکھی جو کہ معرّیٰ نظم ہے۔ تاہم یہ بات مسلم ہے کہ آزاد کی نظموں سے ایک نیا باب کھلا اور زندگی، فرد، معاشرہ، تمدن، تہذیب و ثقافت، قومی و ملی زندگی، جذبۂ حُبّ الوطنی اور عام انسانی جذبات شاعری کا حصہ بنے۔ غزل کی گھسی پٹی لکیر سے ہٹ کر موضوعاتی نظم نگاری کی باضابطہ تحریک آزاد ہی نے شروع کی۔ اردو شعر و ادب میں یہ تحریک بذاتِ خود ایک بڑا کارنامہ ہے۔

﴿۲﴾ خواجہ الطاف حسین حالی: اُنیسویں صدی کی چھٹی، ساتویں دہائی ۱۸۵۷ء کی ناکام جنگِ آزادی کے بعد ہندوستان کے پورے فکری و تمدنی ڈھانچے میں مغربی تہذیب و تعلیم کی کرنیں بکھر رہی تھیں۔ ''انجمنِ پنجاب'' کے قیام کے بعد موضوعاتی نظمیہ شاعری کی تحریک کو حالی نے بھی کھُل کر آگے بڑھایا۔ انجمنِ پنجاب کے مشاعروں کے سب سے اہم شاعر مولانا الطاف حسین حالی ہیں۔ آپ نے قومی اور اصلاحی نظمیں کہیں۔ نظم کو مقبولِ خاص و عام بنانے کی بہت ہی منظّم کوشش حالی نے کی۔ قدیم طرزِ شاعری اور مخربِ اخلاق مضامین سے دل سیر ہو چلا تھا۔ اردو شاعری ایک طرح سے قعرِ ضلالت میں غرق تھی۔ آپ کا خیال تھا کہ دیگر اسباب کے علاوہ غزل اور قصیدہ بھی مسلمانوں کی بربادی کے خاص طور پر ذمّے دار ہیں۔

مقدمۂ شعر و شاعری میں انہوں نے قصیدہ و غزل پر شدید اعتراضات کیے۔ انہیں یقین تھا کہ نظم میں تسلسل کے ساتھ مسلمانوں کو بیدار کرنے کی باتیں کہی جائیں تو ہر دل میں آسانی سے گھر کر سکیں گی۔ حالی قوم اور شاعری دونوں کی صفِ مصلحین میں شامل تھے۔ سرسید کے ایما پر ملّت کی زبوں حالی، اس کے تاب ناک ماضی اور روشن مستقبل کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا اور اس طرح ایک مشہور و معروف تصنیف ''مدّ و جزرِ اسلام'' (مسدس حالی) منظرِ عام پر آئی۔ حالی کے سلسلے میں یہ بات بھی مسلّم ہے کہ اُن کی ابتدائی غزلوں میں بھی عامیانہ اور سوقیانہ عناصر نہیں ملتے۔ اس میں دراصل ان کے سنجیدہ مزاج اور مہذّب و بردبار ہونے کا عمل دخل تھا لہٰذا یہ بات کہہ سکتے ہیں کہ ابتذال پسندی کو ان کی طبیعت سے کوئی علاقہ نہیں ہو سکتا تھا یا یہ کہ ان کی طبیعت مذموم مضامین کی طرف مائل نہیں ہو سکتی تھی۔

ان کی غزل سے کچھ اشعار ملاحظہ ہوں:

اک یہاں جینے سے بیزار ہمیں ہیں یارب! یا اسی طرح سے سب عمر بسر کرتے ہیں
ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں اب ٹھہرتی ہے دیکھیے جا کر نظر کہاں
ہم جس پہ مر رہے ہیں وہ ہے بات ہی کچھ اور عالم میں تجھ سے لاکھ سہی تو مگر کہاں

ان اشعار میں سادگی و پرکاری بھی ہے لیکن حالؔی نے شاعری میں وصلِ صنم کی فرضی تصویر کشی، جدائی میں آنسو بہانے اور اختر شماری کو اردو شاعری کے لئے مہلک تصوّر کیا تھا۔ اگر آزاد، حالؔی، سرسید اور ان کے دیگر رفقا نے یہ کام نہ کیا ہوتا تو آج کی شاعری فحش نگاری کے زمرے میں آ گئی ہوتی۔ ''مسدس حالی'' جو حالؔی کی معرکتہ الآرا تصنیف ہے، اسی دَور کی ہے جس تصنیف کے سلسلے میں سرسید احمد خاں کا خیال ہے:

''بے شک میں اِس کا محرک ہوا ہوں اور اِس کو میں اپنے اعمالِ حسنہ میں سمجھتا ہوں کہ جب خدا پوچھے گا تو دنیا سے کیا لایا؟ میں کہوں گا: میں حالؔی سے مسدس لکھوا لایا ہوں اور کچھ نہیں۔''

اس ''مسدس'' میں حالؔی نے پُر خلوص جذبے کی مدد سے اپنی ملّی و قومی تہذیب اور اس کی زبوں حالی کو پیش کیا ہے۔ یہ بات بھی قابلِ تسلیم ہے کہ اس طرح کا مسدس ایک خاص پس منظر میں وہی شخص لکھ سکتا ہے جس کا تہذیبی اور تاریخی شعور پُختہ و مستحکم ہو، ساتھ ہی جس کی فکری اساس متزلزل نہ ہو۔ بہر حال جب جدید طرز کی شاعری کی بنیاد ''انجمنِ پنجاب'' کے تحت آزاؔد نے ڈالی اور حالؔی جب لاہور تشریف لے گئے تو لاہور میں قیام کا حالؔی کو اصل فائدہ یہ ہوا کہ مولانا آزاؔد سے تبادلۂ خیال کا موقع ملا۔ دوسرے نئے انداز کے مشاعرے میں شریک ہونے اور موضوعاتی نظمیں لکھنے کا موقع ملا۔ ''انجمنِ پنجاب'' کے زیرِ اہتمام موضوعات پر مشتمل چار مشاعروں میں شرکت کر کے حالؔی نے ''برکھا رُت، نشاطِ اُمید، حُبِّ وطن اور مناظرۂ رحم و انصاف'' جیسی نظمیں سنائیں۔ چوں کہ اس وقت شعرا حقائق کے بیان کرنے کو عیب تصوّر کرتے تھے۔ اس لئے نظم نگاری کی تحریک سے ایک نیا باب شروع ہوا۔ اس مشاعرے کی اہمیت اور غرض و غایت پر حالؔی نے یوں روشنی ڈالی:

''اس مشاعرے کا مقصد یہ تھا کہ ایشیائی شاعری جو کہ دروبستِ عشق اور مبالغہ کی جاگیر ہوگئی ہے، اس کو جہاں تک ممکن ہو وسعت دی جائے اور اس کی بنیاد حقائق و واقعات پر رکھی جائے۔''

حالؔی کو براہِ راست انگریزی شعر و ادب سے اکتسابِ فیض کا موقع نہیں ملا تھا لیکن پھر بھی انہوں نے اسمٰعیل میرٹھی اور قلقؔ میرٹھی وغیرہ کے منظوم ترجموں سے فائدہ اُٹھایا۔ اس کے ہی نتائج تھے کہ حالؔی نے اچھی نظمیں کہیں۔ جو لوگ خالص عشقیہ اور قدیم فرسودہ روایت کے دل دادہ تھے وہ بھی اس طرف مائل ہوئے۔ جہاں تک حالؔی کا سوال ہے کچھ تو ان کا میلانِ خاطر فطری طور پر ایسا تھا، دوسرے یہ ہوا کہ لاہور میں انہیں اچھا ماحول مل گیا۔

انجمنِ پنجاب کے پہلے مشاعرے کا موضوع ''برسات'' طے پایا۔ حالؔی نے اس میں ''برکھا رُت'' نظم پیش کی جو جدید نظم کے تقاضوں کو پورا کرتی ہے۔ اس میں فطری پن اور ربط و تسلسل قائم ہے، یہ بھی مثنوی کی ہیئت میں ہے۔ نظم ''برکھا رُت'' کے شروع کے بندوں میں گرمی کی شدّت کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس میں آپ نے کہسار کا تپنا، جانداروں کا پیاس سے تڑپنا، آبِ دریا کا کھولنا، باغ کی ویرانی، چھوٹے بچوں اور عام انسانوں کی بے چینی، لُو کی گرمی جیسے عوامل کو برسات کے پس منظر کے طور پر پیش کیا ہے۔ جزئیات نگاری سے واقعہ نگاری اور منظر نگاری میں وصف پیدا ہو گیا ہے۔ چوں کہ موسم بھی ہندوستانی تہذیب اور یہاں کے تمدنی حالات پر اثر انداز ہوتا ہے اس لئے اس کا ذکر بے جا نہیں ہے۔

اس منظر کی تصویر کشی ملاحظہ کیجیے:

گرمی سے تڑپ رہے تھے جان دار اور دھوپ میں تپ رہے تھے کہسار
تھیں لومڑیاں زباں نکالے اور لُو سے ہرن ہوئے تھے کالے
تھے شیر پڑے کچھار میں سُست گھڑیال تھے رُودبار میں سُست
بچوں کا ہوا تھا حال بے حال کمہلائے ہوئے تھے پھول سے گال
آنکھوں میں تھا ان کا پیاس سے دَم تھے پانی کو دیکھ کرتے مَم مَم

ایسی منظر کشی حالؔی سے پہلے نظیرؔ کے یہاں ملتی ہے۔اس نظم میں رواں بحر کا انتخاب نہیں کیا لیکن پھر بھی اثر آفرینی قائم رہتی ہے۔حالؔی کے ذاتی جذبات اجتماعی ہوگئے ہیں۔اپنی قوم اور تمدنی حالات سے انہیں دل چسپی ہے۔

''برکھا رُت'' کا آخری حصہ غریب الوطنی کے احساس پر مشتمل ہے:

بے زار اک اپنی جان و تن سے بچھڑا ہوا صحبتِ وطن سے
غربت کی صعوبتوں کا مارا چلنے کا نہیں ہے جس کو یارا
ہم تم یوں ہی صبح و شام اکثر تالاب میں تیرتے تھے جاکر
جب پیڑ سے آم ہے ٹپکتا میں تم کو اِدھر اُدھر ہوں تکتا
تم بِن جو ہے بوند تن پہ پڑتی چنگاری سی ہے بدن پہ پڑتی

اس بند میں اس کیفیت کا بیان ہے کہ جب برسات کے موسم میں بارش کی بوندیں پڑتیں ہیں اور ایک غریب الدّیار شخص ہے جسے گھر اور اپنے محبوب یا دوست کی یاد آرہی ہے،اس پر عجیب کیفیت طاری ہے۔اس بند میں ذہنی،نفسیاتی اور جذباتی احساس کو پیش کیا گیا ہے۔

''نشاطِ اُمید'' دوسری نظم ہے۔اس نظم میں ''اُمید'' ایک ایسی غیر مرئی طاقت ہے جو کہ انسانی زندگی کی قدم قدم پہ معاون ثابت ہوتی ہے۔اس کے بغیر انسان کی پیچیدگیاں مزید بڑھ جاتی ہیں۔''اُمید'' کسی خاص قوم،فرقے،زبان یا نسل سے تعلق نہیں رکھتی بلکہ اس میں آفاقیت ہوتی ہے۔اُمید جو ہر آدمی کی ہم سفر ہوتی ہے۔اس کی وضاحت میں حالؔی نے مذہب،تاریخ اور عمرانی و تہذیبی عناصر کا سہارا لیا ہے۔

''حُبِّ وطن'' تیسری نظم ہے۔حب الوطنی کا جذبہ کافی لوگوں نے پیش کیا ہے۔حالی روزی،روٹی کی تلاش میں لاہور میں زندگی گزار رہے تھے اس لئے اس میں ذاتی احساس کا رنگ غالب ہے جو اجتماعی احساس سے ہم آہنگی رکھتا ہے۔حالؔی نے حُبّ الوطنی کے سیاق وسباق میں اپنی دھرتی،مٹی اور یہاں کی روایات کو موضوع بنایا ہے۔اس سے ان کی تہذیبی اور سماجی فکر کی بالیدگی کا پتہ چلتا ہے۔حالؔی ایک سادہ اور سلیم الطبع انسان تھے۔''مناظرۂ رحم وانصاف'' چوتھی نظم ہے جو انجمنِ پنجاب کے مشاعرے میں حالؔی کی آخری نظم ہے۔اس میں حالؔی نے دو مجردات 'رحم وانصاف' کا مکالمہ پیش کیا ہے۔شروع میں ''رحم'' خود کو عظیم ثابت کرتا ہے اور انصاف پر اپنی برتری کو ظاہر کرتا ہے۔رحم وانصاف کا مناظرہ بڑا دل چسپ ہے۔دونوں کا دعویٰ اپنی اپنی جگہ درست ہے۔اس گفتگو میں عقل ثالث کا رول ادا کرتی ہے اس تکرار و بحث کو عقل ختم کر کے دونوں میں صلح کرا دیتی ہے۔عقل کی مداخلت سے تصفیہ ہوتا ہے۔

حالؔی نے صرف چار مشاعروں میں برکھا رُت، نشاطِ اُمید، حُبِّ وطن اور مناظرۂ رحم و انصاف جیسی خوب صورت نظمیں پیش کیں۔ زبان کی صفائی، بندشوں کی چستی اور جذبات و کیفیات کی عکاسی کے اعتبار سے حالؔی کی یہ نظمیں نہایت بلند پایہ ہیں۔ حالؔی نے اپنی نظموں میں نہ صرف قدیم و جدید رنگ کی ہنرمندانہ پیوندکاری کی بلکہ موضوع کی تبدیلی اور نئے خیالات سے اردو نظم کو نئی شاہِ راہ پر گام زَن کر دیا۔ ان موضوعاتی نظموں کی اہمیت سے متعلق پروفیسر آل احمد سرورؔ کا یہ موقف دیکھیے:

> ''برکھا رُت'' اور ''حبِّ وطن'' سے اردو شاعری میں ایک نئے راگ کا اضافہ ہوتا ہے۔ یہ راگ بالکل نیا تو نہ تھا کیوں کہ اُس سے پہلے نظیرؔ اکبرآبادی بھی اسے الاپ چکے تھے مگر ان کی آواز کسی نے بھی نہ سنی۔ حالؔی نے جب یہ نغمہ چھیڑا تو اس کا اثر ہوا اور ان کی اور آزادؔ کی کوششوں سے مقامی رنگ، منظر نگاری، وطن کی محبّت اردو شاعری میں اپنا بہار دکھانے لگی۔''
>
> (مضمون: ہندوستانی ادب میں حالؔی کا درجہ، ماخوذ از تنقیدی اشارے، ۱۹۵۵ء، ص، ۸۰)

حالؔی نے قومی و ملّی احساس، تہذیبی و ثقافتی عناصر کی بازیافت، حُبّ الوطنی کے جذبات، معاشرے اور فرد کے رشتے پر مشتمل شاعری کی ہے۔ آج لوگ حالؔی کی تنقید اور شاعری کو فرسودہ قرار دیتے ہیں۔ انہیں یہ باور ہونا چاہیے کہ اگر حالؔی نے تنقید اور شاعری (نظم) کی فصل کو نہ سینچا ہوتا تو آج تنقید اور نظم کی فصل کب کی سڑ گئی ہوتی بلکہ ادب کی کھیتی سے معدوم ہو چکی ہوتی۔

﴿۳﴾ شبلی نعمانی: ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے بعد ملک و قوم پر جو مایوسی اور اضمحلال کے بادل چھائے تھے وہ آہستہ آہستہ چھٹ رہے تھے۔ ادھر آزادؔ اور حالؔی موضوعاتی نظم نگاری کی تحریک شروع کر چکے تھے، سرسید کی تعلیمی تحریک ذہن و دماغ میں روشنی بکھیر رہی تھی اور شعرا وادبا قومی و ملّی مسائل اور معاشرتی زندگی کی حقیقتوں کو فن پاروں میں پیش کر رہے تھے۔ شبلیؔ پہلے تو روایتی طرزِ شاعری اور فارسی سخن وَری کی طرف مائل ہوئے مگر سرسید، آزادؔ اور حالؔی کی تحریک سے شبلیؔ کے اندر ایک طرح کی تبدیلی ہوئی۔ غزل کے دو اشعار سے ان کے قدیم شعری میلان کا پتہ چلتا ہے:

میں تھا یا دیدۂ خوں نابہ فشاں تھی شبِ ہجر — اُن کو واں مشغلۂ انجمن آرائی تھا
ناتواں عشق نے آخر کیا ایسا ہم کو — غم اُٹھانے کا بھی باقی نہیں یارا ہم کو

شبلیؔ نعمانی نے اپنی خداداد صلاحیتوں کی مدد سے اسلامی لٹریچر اور اردو ادب کو بہت کچھ دیا۔ وہ دراصل تاریخ نگار، سیرت نگار اور مقالہ نگار تھے۔ ان کی تصنیفات میں المامون، الغزالی، اورنگ زیب عالمگیر، سوانحِ مولانا رُوم، الکلام، الفاروق، سیرت النّعمان اور مقالاتِ شبلی وغیرہ اہم ہیں۔ ان کے علاوہ سیرت النبی ایک مبسوط سیرتِ پاک ہے۔ موازنۂ انیس و دبیر اردو میں عملی تنقید کا پہلا نمونہ ہے۔ جہاں تک شعری مذاق کا سوال ہے۔ شبلیؔ فطری طور شاعری سے رشتہ رکھتے تھے۔ غزل کے جو مذکورہ اشعار بطورِ نمونہ پیش ہوئے ہیں، شبلی اس رجحان سے جلد ہی پھر گئے اور اصلاحی، سماجی و مقصدی شاعری کو اپنا شعار بنایا۔ آزاد اور حالؔی کی جدید نظم کے تیور کو انہوں نے بھی سمجھا، انگریزی سے براہِ راست واقفیت نہ ہونے کے باوجود انہوں نے منظوم ترجمہ پیش کیا۔ علی گڑھ قیام کے دوران اس رجحان کو مزید تقویت ملی۔

انگریزی سے منظوم ترجمہ کے ذیل میں سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں:

''ایک چیز رزمیہ کابل وقندھار ہے۔۵/صفر۱۳۰۰ھ یعنی تقریباً ۱۸۸۲ء کی لکھی ہوئی۔اعظم گڑھ میں کوئی انگریز تھا جس نے محاربۂ کابل وقندھار میں شرکت کی تھی اور انگریزی شعر میں اس کا کچھ حال نظم کیا تھا۔اس نے مولانا کے والد سے خواہش ظاہر کی کہ اس کو کوئی نظم میں ترجمہ کردے۔یہ کام مولانا نے اپنے ذمہ لے لیا،اردو ترجمہ نثر میں سن لیتے اور اس کو نظم کر دیتے۔''

نظم ''رزمیہ کابل وقندھار'' کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

والیِ کابل نے کی جب سرکشی ملک میں اپنے سفارت منع کی
غیر سے ڈالا تھا طرحِ آشتی سو چلا تھا کچھ خیالِ خود سری
روس پر تھا جو خیالِ اختیار ہاتھ سے چھوٹی عنانِ اختیار
سنتے ہی فرمانِ دارائے جہاں ہوگئی آراستہ فوجِ گراں

اسی زمانے میں انہوں نے ایک نظم ''صبحِ اُمید'' کہی۔یہ ۱۸۸۴ء کے اوائل کا زمانہ تھا۔اس میں مسلمانوں کے ماضی کی تصویر کھینچی ہے اور اپنے عہد کے زوال وانحطاط اور قوم کی زبوں حالی کو موضوع بنای ہے۔دراصل یہ نظم مثنوی کی ہیئت میں ہے جس میں تہذیبی وتمدنی عناصر کے بکھرنے اور ثقافتی ڈھانچے کے ٹوٹنے کی داستان بیان ہوئی ہے۔یہ نظم ''صبحِ اُمید'' جو ۳۴۵/اشعار پر مشتمل ہے۔اس مثنوی پر ''مسدس حالیؔ'' کا گہرا اثر معلوم ہوتا ہے۔

اس نظم سے چند اشعار پیش کیے جاتے ہیں:

وہ قوم کہ جان تھی جہاں کی جو تاج تھی فرقِ آسماں کی
تھے جس پہ نثار فتح و اقبال کسریٰ کو جو کرچکی تھی پامال
گل کر دیے تھے چراغ جس نے قیصر کو دیے تھے داغ جس نے
وہ نیزۂ خوں فشاں کہ چل کر ٹھہرا تھا فرانس کے جگر پر
روما کے دھوئیں اُڑا دیے تھے اٹلی کو کوئیں جھنکا دیے تھے

اس نظم نے جس عہد کی ترجمانی کی اس عہد میں سرسید کی شخصیت بہت فعّال رہی۔قومی وملّی خسارے کا سرسید کو احساس ہے۔اپنی تہذیب وثقافت کی نشانیاں ناپید ہورہی ہیں اور مسلم قوم خوابِ غفلت میں ہے۔مسلم قوم نے اپنی صنعت وحرفت اور تجارت،جو اسلامی تہذیب کی علامت ہے،سب کو بھلا دیا ہے۔لیکن سرسید کی تحریک اور مسلسل کوششوں سے صورتِ حال میں تبدیلی پیدا ہوئی اور اُمید کی کرن پھوٹی۔حوصلوں کو پر پرواز لگے اور نئی تعلیم وتہذیب کے مثبت پہلو کا انعکاس ہونے لگا۔قدیم خیال کے علما سرسید کی تحریک کی افادیت کو سمجھ رہے تھے۔یہ الگ بات تھی کہ وہ اس جدید طرزِ تعلیم سے خوش نہیں تھے۔شبلی کی تعلیم بھی اگرچہ پرانے طریقے پر ہوئی تھی مگر علی گڑھ آنے کے بعد ان کے مزاج میں قدیم وجدید کا خوش گوار امتزاج پیدا ہوگیا۔

نظم ''صبحِ امید'' کا یہ ٹکڑا ملاحظہ کیجیے جس میں امید کی کرن اُبھرتی ہے:

اسلاف کے وہ اثر ہیں اب بھی اِس راکھ میں شرر ہیں اب بھی
اِس جام میں ہے شراب باقی اب تک ہے گہر میں آب باقی
گو خوار ہیں ، طرز و خو وہی ہے مرجھا گئے پھول ، بُو وہی ہے

کچھ نقادوں کے مطابق مضمون اور اسلوب کے لحاظ سے ''صبحِ اُمید'' پر مسدس حالی کا گہرا اثر ہے۔ کلیم الدین نے ''صبحِ اُمید'' کو زبان واسلوب کے لحاظ سے مسدّس حالی پر فوقیت دی ہے۔ اگر زبان کے لحاظ سے ''صبحِ اُمید'' فائق ہوتی تو اس میں روانی اور چاشنی بھی مسدّس سے زیادہ ہوتی جب کہ ایسا نہیں ہے۔ شبلی کی بیش تر نظموں میں وہی عظمتِ رفتہ کی کہانی یا مسلم قوم کی زبوں حالی کا ذِکر ملتا ہے۔ ان کے سامنے اصلاحی واخلاقی قدروں کی بازیافت اہم تھی۔ ان کی مشہور نظمیں قومی مسدّس، ہجرتِ نبوی ﷺ، مذہب یا سیاست، خلیفہ ابن عبدالعزیز کا انصاف، شہر آشوبِ اسلام اور مساواتِ اسلام وغیرہ ہیں۔ شبلی کی نظموں میں اردو نظم نگاری کے واضح اور مستحکم نقوش نظر آتے ہیں۔ ''کلیاتِ شبلی'' اردو میں جو سیاسی، مذہبی، اصلاحی اور اخلاقی نظمیں ہیں وہ اپنے دَور کی ترجمانی کرتی ہیں۔ شبلی کی نظموں میں جو تہذیبی رنگ ہے وہ اسلامی افکار سے کشید ہوا ہے۔

﴿۴﴾ سرورؔ جہان آبادی: سرورؔ کا نام اردو نظم نگاری میں اہمیت کا حامل ہے۔ سرورؔ کی شاعری کا وہی دَور ہے جو علامہ اقبالؔ، چکبستؔ، نادرؔ کاکوروی اور محرومؔ کا ہے۔ ان شعرا کی ذہنی افتاد میں کہیں کہیں کسی حد تک قدرِ مشترک بھی ہے۔ سرورؔ نے اپنے پیش روؤں کی قائم کردہ ڈگر پر چل کر جدید نظم نگاری کو مزید فروغ دیا۔ جس تہذیبی وثقافتی رنگ کو آزادؔ، حالیؔ، اسمٰعیلؔ میرٹھی، نظمؔ طباطبائی اور شبلیؔ وغیرہ نے اپنی نظموں میں پیش کیا۔ سرورؔ نے بھی اسی رنگ کو اپنایا۔ سرورؔ کی نظموں میں زندگی اور کائنات کے مظاہر ہیں کیوں کہ ان کی ذہنی افتاد زندگی کی صداقتوں اور مظاہرِ کائنات سے گہرا ربط رکھتی ہے۔ حیات کی رعنائی اور چمن کی شگفتگی میں بھی سرورؔ نے زندگی کی تلخ حقیقتوں کی جھلملاتی لویں دیکھی ہیں، جنہیں نظم کے پیکر میں ڈھال کر دنیائے ادب کے لئے سرورؔ نے گنج ہائے گراں مایہ بنا دیا ہے۔ اصلاحی واخلاقی نظم نگاری سرورؔ کا خاص میدان ہے۔ اس کے علاوہ تعلیم وتربیت، سیاسی و مذہبی اُمور، قومی و وطنی عناصر کو بھی سرورؔ نے اپنی نظموں میں پیش کیا ہے۔ یہاں کی مشترکہ تہذیب کی تشکیل میں زبان وادب، موسیقی، شاعری، رقص، فنِ تعمیر، امیر خسرو، شیر شاہ، کبیر داس، تان سین، اکبر اعظم، تاج محل اور لال قلعہ جیسے عوامل اور مظاہر معاون رہے ہیں۔ سرورؔ کے ذہنی وفکری ارتقا میں ہندوستانی آب وہوا اور دوسرے تہذیبی وثقافتی عناصر کارفرما رہے ہیں۔

سرورؔ کی ایک مشہور نظم ''سوزِ بیوہ'' ہے جس میں کل چالیس اشعار ہیں۔ اس نظم کا مرکزی خیال ایک ایسی بیوہ کے احساسات وجذبات پر مشتمل ہے جو کہ عالمِ شباب میں ہی بیوہ ہو جاتی ہے۔ بیوہ کبھی آسمان سے شکایت کرتی ہے تو کبھی اپنی ہی قوم کے ظالم وجابر اور ستم پرور لوگوں سے۔ سرورؔ نے اس بیانیہ نظم میں سوز پیدا کر دیا ہے۔ ہندوستانی سماج میں بیوہ کی زندگی کتنی اجیرن ہوتی ہے، اس کی عکّاسی ان کی نظم ''سوزِ بیوہ'' کے اشعار کی روشنی میں دیکھیے:

پسند آئی نہ آرائش تجھے او آسماں میری اُتاریں بدھیاں بے درد! توڑیں چوڑیاں میری
وہ نقشِ نا مرادی ہوں، سراپا درد ہوں ،غم ہوں مرقّع میں جہاں کے ، آہ! میں تصویرِ ماتم ہوں

سرورؔ نے اس نظم میں ہندوستانی عورت کی تہذیبی اور تمدّنی زندگی کا نقشہ پیش کیا ہے۔ایک بیوہ عورت کی زندگی میں جو طوفان آتے ہیں وہ سب یہاں کی تہذیب کا حصہ ہیں۔ یہاں سماج میں اور بالخصوص ہندوؤں میں بیوہ کی شادی نامسعود تصوّر کی جاتی ہے،خواہ بیوہ ابھی جو ان ہی کیوں نہ ہو۔ ہندو تہذیب میں بیوگی کو نحس مانا جاتا ہے، چوڑیاں توڑ دی جاتی ہیں اور سہاگ کی تمام آرائشیں ختم کر دی جاتی ہیں۔اس نظم میں اسی تہذیبی پس منظر کو سرورؔ صاحب نے ہدفِ تنقید بنایا ہے۔ان کی شاعری میں حزن وملال کی جو فطری کیفیت ہے اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ عین جوانی میں ان کی اہلیہ کا انتقال ہوگیا اور پھر سات برس کے بعد بیٹے کا انتقال ہوگیا۔ بیوی کی موت کا اثر یہ ہوا کہ تین سال تک خاموش ہی رہے۔ کچھ نہ لکھا اور جب لکھا تو نظم ''اُجڑی ہوئی محفل''،لکھی جس میں دنیا اور زندگی کی بے ثباتی کا ذِکر ہے۔اس پوری نظم پر حزنیہ فضا غالب ہے ساتھ ہی اصلاح کا پیغام بھی:

یہ نتیجہ ، آہ ہو جس عیش کا پایانِ کار تُف ہے ایسے عشق پر اِس سے تو بہتر ہے عذاب
دل لگانے کی جگہ دنیا نہیں ہے اے سرورؔ! ساتھ دیتی ہے کسی کا آہ ! کب خانہ خراب

یہ نظم بھی سماجی وتہذیبی زندگی کے کھوکھلے پن کو ظاہر کرتی ہے۔محفلِ بادہ نوشی کا انعقاد،طوائفوں اور رقاصاؤں کے ساتھ مے نوشی اور رقص،کھوکھلی تہذیب کا حصہ ہیں۔سرورؔ کا سماجی وسیاسی شعور بالیدہ اور پختہ ہے۔سامراجی لوٹ کھسوٹ سے ہندوستانیوں میں ظلمت وافلاس کی فضا پیدا ہوگئی تھی۔مغرب والے ہندوستانیوں کو نئی تہذیب اور کھوکھلی ملمّع کاری سے مسحور کر رہے تھے۔سرورؔ صاحب نے ایسے ماحول میں ہندوستانی تہذیب وثقافت کے نغمے الاپے اور اکابرِ ہند اور زعمائے قوم کی عظمتوں کا ذکر کیا۔''چتوڑ کی گزشتہ عظمت، نیرنگِ زمانہ'' وغیرہ میں اسی نوع کے افکار ملتے ہیں۔سرورؔ کے ذہنی ارتقا کے متعلق پروفیسر احتشام حسین کی رائے ہے:

''سرورؔ اس دَور کی پیداوار ہیں جو ہندوستان کی تاریخ میں نشاۃِ ثانیہ کی حیثیت رکھتا ہے۔اس کا نمایاں وصف وطن دوستی،تمنائے آزادی اور خواہشِ اصلاح وترقی تھا۔سرورؔ کے وطن دوست اور فطرت پرست ذہن نے ان خصوصیات کو جذب کر کے حسین شاعرانہ روپ میں پیش کیا ہے۔''

سرور کی شاعری میں حب الوطنی کے جذبات کوٹ کوٹ کر بھرے ہوئے ہیں۔اس کی عکاسی ذیل کے اشعار سے بخوبی ظاہر ہے:

آ اے عروسِ حُبِّ وطن میرے گھر میں تو آنکھیں تری تلاش میں ہیں محوِ جستجو
زانو ہو تیرا اور یہ شوریدہ سر مرا میرا مشامِ جاں ہو تری زلفِ مشک بو

سرورؔ نے حبُّ الوطنی کے موضوع پر بھی اچھّی نظمیں لکھی ہیں جیسے یادِ وطن،عروسِ حبِّ وطن ، پھولوں کا کنج،قومی نوحہ،جلوۂ اُمید، بدنصیب بنگال،اندوہِ غربت،حسرتِ ہند اور مادرِ ہند وغیرہ۔اس کے علاوہ انہوں نے ہندو مذہب سے متعلّق چند اہم نظمیں کہیں۔ جیسے گنگا جی،لکشمی جی، پریاگ کا سنگم،سیتا جی کی گریہ وزاری،مہاراجہ دشرتھ کی بے قراری اور بن باس کا سین وغیرہ۔

﴿۴﴾ **علاّمہ اقبالؔ:** علامہ اقبالؔ کی شاعری کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ایک سفرِ انگلستان سے پہلے یعنی ۱۹۰۵ء تک اور دوسرا سفرِ انگلستان سے واپسی کے بعد سے اواخرِ عمر تک۔مولانا عبدالسلام ندوی نے ان کی شاعری کو چار ادوار میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا دور ۱۹۰۰ء پر ہی ختم ہوجاتا ہے۔دوسرا دور ۱۹۰۰ء سے ۱۹۰۵ء تک یعنی ''ہمالہ'' سے ''نیا شوالہ'' پر ختم ہوجاتا ہے۔اسی دَور میں ہندوستانی بچوں کا گیت، ترانۂ ہندی، ایک پہاڑ اور ایک گلہری اور گائے وغیرہ نظمیں کہی گئیں، جنہیں پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہندوستانی تہذیب وثقافت سے بہت متاثر ہیں۔اس زمانے میں نیچرل شاعری اور منظر کشی پر زور تھا۔نظمِ ہمالہ پوری کی پوری منظر نگاری کی مثال پیش کرتی ہے صرف ایک بند دیکھیے:

لیلیِ شب کھولتی ہے آکے جب زُلفِ رسا دامنِ دل کھینچتی ہے آبشاروں کی صدا
وہ خموشی شام کی جس پر تکلّم ہو فدا وہ درختوں پر تفکّر کا سماں چھایا ہوا
کانپتا پھرتا ہے کیا رنگِ شفق کہسار پر خوش نما لگتا ہے یہ غازہ ترے رخسار پر

الفاظ وتراکیب کے دروبست پر قدرت کے سبب منظر کشی میں اقبالؔ دوسرے شعرا سے آگے بڑھ جاتے ہیں۔علامہ اقبالؔ کی حُبّ الوطنی کے لئے ان کا یہ دل چھونے لینے والا شعر ہی کافی ہے:

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا

اس شعر سے ہی ان کی حُبّ الوطنی کے جذبات سمجھ میں آجاتے ہیں۔سچ تو یہ ہے کہ ہندوستان کا کوئی قومی ترانہ نہیں تھا۔اقبالؔ نے خوب صورت ترانۂ ہندی پیش کیا۔یہاں کے باغوں اور ندیوں کی تعریف کی پھر اس کی نشان دہی بھی کی کہ یونان، مصر اور روم کی تہذیبی شناخت مٹ جانے کے بعد بھی ہماری شناخت اور اپنا نام ونشان باقی ہے۔اس ترانے میں جذبے کی سچائی اور سرشاری موجود ہے۔

افسوس کا مقام ہے کہ ''قومی ترانے'' کے طور پر اقبالؔ کے ''ترانۂ ہندی'' کی جگہ بنکم چندر چٹرجی کے ''وندے ماترم'' کو ترجیحی طور پر عزت بخشی گئی۔حالاں کہ اس کے علاوہ ان کی بہت سی نظمیں بھی ہیں جو ان کی وطنی شاعری پر دلالت کرتی ہیں جیسے شری رام، شری کرشن، گوتم بدھ اور گرونانک وغیرہ پر لکھی ہوئی نظمیں غیر معمولی عقیدت کی حامل ہیں۔ہمالیہ، گنگا اور گیتا کا ذکر بھی انہوں نے جس محبت اور عقیدت سے کیا ہے اور پھر جن الفاظ میں وشوامترا اور بھرتری ہری کو یاد کیا ہے وہ سب کے سب اس حقیقت کا جیتا جاگتا ثبوت ہیں کہ علامہ مرحوم ہندوؤں کے مذہبی اور ثقافتی ورثے کی بڑی قدر کرتے تھے اور عقیدت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔اسی طرح انہوں نے ''نیا شوالہ'' جیسی متعدّد نظمیں لکھی ہیں جن کا مقصد ہندو، مسلم اتحاد کے علاوہ اور کچھ نہیں۔اقبالؔ ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کے قائل تھے اور وہ مذہب کی بنیاد پر ہندو، مسلم، سکھ اور عیسائی کی تفریق کو مٹا دینا چاہتے تھے۔اسی کی عکاسی کرتے ہوئے ''نیا شوالہ'' سے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

اپنوں سے بیر رکھنا تو نے بتوں سے سیکھا جنگ و جدل سکھایا واعظ کو بھی خدا نے
تنگ آکے میں نے آخر دَیر و حرم کو چھوڑا واعظ کا وعظ چھوڑا، چھوڑے ترے فسانے
ہر صبح اُٹھ کے گائیں منتر وہ میٹھے میٹھے سارے پجاریوں کو مے پیت کی پلا دیں
شکتی بھی شانتی بھی بھکتوں کے گیت میں ہے دھرتی کے باسیوں کی مُکتی پریت میں ہے

یہاں ایک طرح سے دیکھا جائے تو ہندو مسلمان دونوں فرقوں کے مذہبی ٹھیکے داروں کو ہدفِ تنقید بنایا گیا ہے مگر یہاں اقبالؔ جذباتیت سے مغلوب ہوگئے ہیں۔ البتہ جس محبت اور پریت کی بات کی گئی ہے وہ تمام فرقے والوں کو تہذیب وتمدّن کے اعتبار سے ایک جگہ لا کھڑا کرنے کا پیغام دیتی ہے۔ اسی طرح علامہ اقبالؔ نے ملک کی تعریف تاریخی پس منظر میں پیش کی ہے۔

نظم ''ہندوستانی بچوں کا قومی گیت'' کا ایک بند دیکھیے:

چشتی نے جس زمیں میں پیغامِ حق سنایا نانک نے جس چمن میں وحدت کا گیت گایا
تاتاریوں نے جس کو اپنا وطن بنایا جس نے حجازیوں سے دشتِ عرب چھڑایا
میرا وطن وہی ہے ، میرا وطن وہی ہے

اقبالؔ نے دنیا کے تمام مذاہب اور فلسفیوں کو کھنگالنے کے بعد اسلام کی روح کو اصل قرار دیا۔ اسلامی افکار اور فلسفوں کو انسانی زندگی کی فلاح و بہبود کے لئے ضروری سمجھا۔ تہذیبی و اخلاقی تنزّلی کے لئے مغربی تہذیب کو موردِ الزام ٹھہرایا۔

''ضربِ کلیم'' کی ایک چھوٹی سی نظم ''مغربی تہذیب'' دیکھیے:

فسادِ قلب و نظر ہے فرنگ کی تہذیب کہ روح اس مدنیّت کی رہ سکی نہ عفیف
رہے نہ روح میں پاکیزگی تو ہے ناپید ضمیرِ پاک و خیالِ بلند و ذوقِ لطیف

مشرقی تہذیب اور خودی کی پاس داری کا پیغام ان کی پوری شاعری کا مرکزی موضوع ہے۔

ان کی نظم ''جاوید کے نام'' سے چند اشعار پیش کیے جاتے ہیں:

اُٹھا نہ شیشہ گرانِ فرنگ کے احساں سفالِ ہند سے مینا و جام پیدا کر
مِرا طریق امیری نہیں، فقیری ہے خودی نہ بیچ غریبی میں نام پیدا کر

اقبالؔ کی یہ خوبی ہے کہ وہ مسلم تہذیبی آثار اور عظمتِ رفتہ کو اپنی نظموں میں پیش کرتے ہیں۔ ہر جگہ عشق کا فلسفہ عقل پر حاوی نظر آتا ہے۔ مسجدِ قرطبہ، ہسپانیہ، اقوامِ مشرق، ذوق وشوق اور ساقی نامہ جیسی نظموں میں ان کا فکری میلان صاف نظر آتا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

یادِ عہدِ رفتہ میری خاک کو اکسیر ہے میرا ماضی میرے استقبال کی تفسیر ہے
عشق دمِ جبرئیل ، عشق دلِ مصطفےٰ عشق خدا کا رسول ، عشق خدا کا کلام
بے خطر کُود پڑا آتشِ نمرود میں عشق عقل ہے محوِ تماشاے لبِ بام ابھی
خودی کیا ہے ؟ رازِ دُرونِ حیات خودی کیا ہے ؟ بیداریِ کائنات
خودی کا نشیمن ترے دل میں ہے ☆ فلک جس طرح آنکھ کے تِل میں ہے

اردو نظم نگاری کو علاّمہ اقبالؔ نے ایک وسیع تناظر سے آشنا کیا۔ انہوں نے آدم کی عظمت اور دینِ محمّدی کے مرکزی افکار کو اپنی نظموں میں پیش کر کے اردو شاعری کے مرتبے کو بلند کیا۔ جو نظم آزادؔ اور حالیؔ سے شروع ہوئی تھی اسے اقبال نے کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔

01.09 ۱۹۳۶ء کے بعد ترقی پسند تحریک کے اہم نظم نگار شعرا

۱۹۳۶ء کے آس پاس اردو نظم میں ایک طرح کی تبدیلی پیدا ہوئی۔ شاعروں نے محسوس کیا کہ سماجی سروکار کو اردو شاعری کا حصّہ بنانا ضروری ہے۔ سجّاد ظہیر نے باضابطہ ترقّی پسند تحریک شروع کی جس کی پہلی کل ہند کانفرنس اپریل ۱۹۳۶ء میں ہوئی۔ ادب کے افادی پہلو کو اہمیت دی گئی مثلاً: بھوک، افلاس، طبقاتی کشمکش اور اجتماعی فکر کو موضوعِ سخن بنایا گیا۔ اس تحریک میں شامل ہونے والے اہم نظم نگار شعرا مثلاً مخدوم محی الدین، فیض احمد فیض، اسرار الحق مجاز، علی سردار جعفری، اختر الایمان، کیفی اعظمی، ساحر لدھیانوی اور سلام مچھلی شہری پر یکے بعد دیگرے اجمالاً تبصرہ کیا جائے گا۔

﴿۱﴾ مخدوم محی الدین: مخدوم محی الدین ترقی پسند شعرا میں سب سے اہم اور بلند مقام رکھتے ہیں۔ وہ اُن گنے چنے شعرا میں سے ہیں جنھوں نے ''سُرخ سویرا'' کا نعرہ بلند کر کے صرف آزادی کے گیت ہی نہیں گائے بلکہ حیدر آباد کے شاہی دَور میں بھی سرخ انقلاب لانے کے لئے عملی طور پر اس میں شامل ہوئے۔ اس جدوجہد کی خاطر ان کو روپوش بھی ہونا پڑا۔ انہوں نے جہاں محبت کے گیت گائے ہیں وہیں آزادی کے ترانے بھی اردو شاعری کو دیے ہیں۔ اسی وجہ سے انہیں ''محبت اور محنت'' کا شاعر کہا جاتا ہے۔

ان کی نظم ''یہ جنگ ہے جنگِ آزادی'' آزادی کے پرچم تلے ایک ترانے کی طرح گائی گئی۔ ان کی انقلابی شاعری میں جہاں للکار اور گھن گرج ہے وہیں رومانی عناصر بھی ہیں اور انقلابی اُمور کی کارفرمائی بھی۔ انقلاب کے اظہار میں کبھی کبھی ان کے یہاں جذباتیت پائی جاتی ہے۔ ان کے مجموعۂ کلام ''سُرخ سویرا'' میں ''باغی'' نظم کے مطالعے سے یہی پتہ چلتا ہے، لیکن انہوں نے مندر و مسجد، کھیت، موسم، دہقانوں کی تان، کوئل کی کُوکُو اور ماضی کے شکستہ نقوش کو بھی اپنی نظموں میں جگہ دی ہے۔ ان کے تہذیبی و فکری رویّے ہندوستانی رنگ سے ہم آمیز ہیں۔ بیش تر نظمیں دل چسپ و دل کش ہیں۔

ان کی نظم ''حویلی اور بنگال'' کے دو دو اشعار دیکھیے:

ایک بوسیدہ حویلی یعنی فرسودہ سماج — لے رہی ہے نزع کے عالم میں مُردوں سے خراج
ہنس رہا ہے زندگی پر اس طرح ماضی کا حال — خندہ زن ہو جس طرح عصمت پہ قحبہ کا جمال
امّتِ مرحوم ہو یا ملّتِ زنّار دار — ان کے فاقوں کی نہ گنتی ہے نہ لاشوں کا شمار
مرد و زن، شیخ و برہمن سب قطار اندر قطار — آہ! سوکھی چھاتیوں کی چیخ، بچّوں کی پکار

اگر مخدوم کا شعور بالیدہ اور راسخ نہ ہوتا تو ان کے اُسلوب میں شیرینی اور گھلاوٹ نہیں پیدا ہوتی۔ شعریت جن عوامل اور عناصر سے پیدا ہوتی ہے، مخدوم ان سے واقف تھے۔ آزادی کا قصہ ہو یا حرماں نصیبی کے قصے، مزدوروں کے مسئلے ہوں یا تہذیبِ نَو کی عکاسی، وہ ہمیشہ نرم روجھر نے اور کبک دری کے خرام کا سا جادو پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ ایسا ممکن اس لئے ہوا ہے کہ ان کی نظر ماضی کی طرف بھی ہے۔ انہیں معلوم ہے کہ ماضی کو بھلانا اپنی شناخت گم کر دینے کے مترادف ہے۔ ادب کوئی سیاست کی دکان نہیں۔ یہاں تو ماضی کا سرمایہ سب سے قیمتی تصور کیا جاتا ہے۔ بڑا شاعر وہی بن سکا ہے جس کی ایک آنکھ ماضی کی طرف دیکھتی رہتی ہے اور دوسری آنکھ مستقبل کی طرف۔ ''حال'' کی تفہیم کے لئے احساس کی دولت ہی زیادہ کام آتی ہے۔

ماضی کی قدروں پر روشنی ڈالتے ہوئے آل احمد سرور لکھتے ہیں:

''مغربیت اور جدیدیت پر زور دینے سے یہ مراد نہیں کہ ہم اپنے ماضی کے عظیم الشان کارناموں کو نظر انداز کر دیں۔ اپنے ادب کے ہندوستانی اور مشرقی مزاج کو بھول جائیں۔ نیا ادب تہذیبی سرمائے اور تمدّنی میراث سے بے نیاز نہیں ہوسکتا۔''

مخدوم کی ادبی زندگی کا آغاز ان کی نظم ''پیلا دوشالہ'' سے ہوتا ہے۔ وہ ترقّی پسند تحریک کے شعرا کی پہلی صف کے شاعر مانے جاتے ہیں۔ ۱۹۴۴ء میں پہلا شعری مجموعہ ''سرخ سویرا'' کے نام سے شائع ہوا۔ ۱۹۶۱ء میں دوسرا مجموعہ ''گُلِ تر'' کے نام سے شائع ہوا۔ ۱۹۶۶ء میں تیسرا شعری مجموعہ ''بساطِ رقص'' کے نام سے منظرِ عام پر آیا۔ مخدوم محی الدین نے اپنے ہم عصر جدید شعرا کی طرح ہی اپنی شاعری کا آغاز رومانی نظموں سے کیا۔ انہوں نے متعدّد رومانی نظموں کے علاوہ انقلابی اور تاریخی وسماجی پس منظر میں بھی نظمیں لکھی ہیں۔ رومانی نظموں میں ''جانِ غزل، احساس کی رات اور سناٹا'' خاص نظمیں ہیں۔ جب کہ سیاسی، انقلابی اور تاریخی وتہذیبی نظموں میں ''جنگ، دھواں، اندھیرا، سپاہی، زُلفِ چلیپا، بھوکا ہے بنگال، مارٹن لوتھر کنگ، بساطِ رقص، چپ نہ رہو اور ملاقات قابلِ ذکر ہیں۔ وہیں مخدوم کی عشقیہ نظموں میں سجدہ، انتظار، محبت کی چھاؤں، نامۂ حبیب، نورَس، چارہ گر اور چاند تاروں کا بن بڑی شگفتہ اور شاداب نظمیں ہیں۔

﴿۲﴾ **فیض احمد فیض**: بیسویں صدی میں ترقّی پسند تحریک سے متعلق شعرا میں ایک ممتاز نام فیض کا ہے۔ فیض کو سب سے زیادہ قبولیتِ عام اور شہرتِ دوام کا درجہ حاصل ہوا۔ اقبال کے بعد فیض ہی ہماری زبان کے دوسرے شاعر ہیں جنہوں نے نظم وغزل دونوں کی طرف توجہ کی اور دونوں میں امتیاز حاصل کیا لیکن اقبال ہی کی طرح فیض بھی پیامی شاعر ہیں۔ ان کی پہلی نظم ''میرے معصوم قاتل'' گورنمنٹ کالج لاہور کے میگزین، دسمبر ۱۹۲۹ء میں شائع ہوئی۔ اس کے بعد ان کا کلام مختلف رسائل میں شائع ہوتا رہا۔ فیض کا پہلا شعری مجموعہ 'نقشِ فریادی' ۱۹۴۱ء میں شائع ہوا اور کافی مقبول ہوا، جس پر انہوں نے ن۔م۔ راشد سے مقدمہ لکھوایا تھا۔ ن۔م۔ راشد نے لکھا تھا:

''نقشِ فریادی ایک ایسے شاعر کی غزلوں اور نظموں کا پہلا مجموعہ ہے جو رومان اور حقیقت کے سنگم پر کھڑا ہے۔''

ن.م.راشد کا یہ جملہ فیض کی شاعری کا ''سرنامہ'' ثابت ہوا۔ اردو شاعری میں فیض کی شخصیت ایک رومانی شاعر کی حیثیت سے اُبھر کر سامنے آتی ہے۔ فیض کی شاعری میں ابتدا سے انتہا تک رومان وحقیقت کی دھوپ چھاؤں ہے۔ ان کی شاعری میں حُسن ومحبت کی دل گداز داستانیں اور بے زار نگاہوں کی تلخیاں بھی ہیں۔ ان میں حُسن کی رنگینی میں کھو جانے کی جرأت بھی ہے اور اجنبی ہونے کی تمنا بھی ہے۔ یہ اپنے عہد سے مایوس ہیں مگر شکست خوردہ نہیں۔ ان کی شاعری میں تفکّر آمیز تجسّس ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ یہ غلامی کا اندھیرا چند روزہ ہے۔ اس لئے وہ ہر ستم سہنے کے لئے تیار ہیں۔ فیض کے مزاج میں رومانیت ہے۔ یہ رومانیت انہیں خالص انقلابی بننے سے روکتی ہے۔ ان کی انقلابیت میں رومانیت کے عناصر شامل ہوتے رہے اور اسی لئے وہ رومان اور حقیقت کے دوراہے پر کھڑے نظر آتے ہیں۔ فیض احمد فیض کی ابتدائی شاعری میں ''تنہائی اور انتظار'' مرکزی حیثیت رکھتے ہیں۔ فیض کی روح تنہائی کا شکار ہے۔ وہ گرد وپیش کے ماحول کو اُکتائی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہیں۔ انہیں انتظار ہے اپنے محبوب کا، کسی رنگین آنچل کا، گھنے درختوں پہ سوئی ہوئی چاندنی کا اور عہدِ نَو کا جس پر ان کا یقین ہے۔ ان کی تنہائی لمحہ لمحہ بوجھل ہوتی جاتی ہے لیکن وہ مایوس نہیں ہیں۔ یہ نظمیں اپنا ایک انفرادی وجود رکھتے ہوئے بھی ایک سلسلے کی کڑیاں معلوم ہوتی ہیں۔

فیضؔ نے دو نظمیں ''تنہائی اور انتظار'' کے عنوان سے لکھی ہیں۔ نظم ''انتظار'' میں وہی اشتیاق ہے جو ہر شاعر کو اپنی محبوبہ کا ہوتا ہے۔ نظم کے دو اشعار ملاحظہ کیجیے:

جو حسرتیں ترے غم کی کفیل ہیں پیاری ابھی تلک مری تنہائیوں میں بستی ہیں
طویل راتیں ابھی تک طویل ہیں پیاری اُداس آنکھیں ابھی انتظار کرتی ہیں

نظم ''تنہائی'' معنوی اور فنّی اعتبار سے فیضؔ کی ایک اہم نظم ہے۔ یہ نظم داخلیت کا اظہار ہے۔ شاعر کا سارا وجود سمٹ کر انتظار کے نقطے پر مرکوز ہو جاتا ہے۔ خفیف سے خفیف آہٹ پر وہ چونک اٹھتا ہے۔ اسے اپنے محبوب کی آہٹ کا دھوکہ ہوتا ہے۔ اُمید و بیم کی کیفیت ہوتی ہے۔ امید کی لو ٹمٹما رہی ہے پھر وہ بھڑک اُٹھتی ہے اور پھر بجھ جاتی ہے۔ بعض ناقدین نے اسے جہانِ نَو کا انتظار قرار دیا ہے۔ ن۔م۔ راشد نے تاروں کے بکھرے ہوئے غبار اور ایوانوں کے لڑکھڑاتے ہوئے چراغ کا مطلب تہذیب کا بکھرتا ہوا شیرازہ لیا ہے۔ یہ نظم سیاسی بصیرت کی روشن مثال ہے۔ مشرقی علوم و فنون اور زندگی و ثقافت میں جو جمود و تعطّل ہے، اس کی طرف بھی اشارے ملتے ہیں۔ اس نظم میں جو مجردات ہیں، فیضؔ کا کمال ہے کہ انہیں زندہ و متحرک کر کے پیش کیا ہے۔ جیسے تارے، راہ رَو، کواڑ، دلِ زار اور خوابیدہ چراغ وغیرہ۔ ''سرودِ شبانہ، تہِ نجوم، یاس اور ایک منظر'' فیض کی فن کاری اور مصوّری کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔ ان نظموں میں ایک پراسرار خاموشی اور معنی خیز سرگوشی ہے۔ پرسکون اور خواب آور مناظر شاعر کی روح کی طرح بوجھل اور نڈھال ہیں۔ لیکن ان مناظر کی افسردگی اور اضمحلال میں سرگوشیاں سنائی پڑتی ہیں۔ ان نظموں میں شاہ راہوں کا تجسّس ہے اور یہی نظمیں اس عبوری دَور کی نشانی ہیں جہاں شاعر، شاعرِ محبت سے شاعرِ انسان بنتا ہے۔ ان نظموں کا حُسن و سکون آنے والے طوفان کا پیش خیمہ ہے۔ ان کی نظموں میں منظر نگاری کے باوجود جو اختصار ہے وہ فنّی اعتبار سے بے حد بلند ہے۔ ''مری جاں! اب بھی اپنا حُسن واپس پھیر دے مجھ کو، تہِ نجوم، استفہامیہ اور تین منظر'' بھی جذبات کی مصوّری کی عمدہ مثالیں ہیں۔ ''میرے ندیم'' استفہامیہ نظم ہے۔ وہ سوالیہ نشان قائم کرتے جاتے ہیں۔ شاعر حیرت زدہ ہے کہ وہ احساسات و آرزوئیں کیا ہوئیں جن سے شعر کی دنیا آباد تھی۔ جن سے فکر و عمل رنگین تھے، جن کے نور سے مہ و انجم شاداب تھے، جن سے جنونِ عشق کی ہمت جواں تھی۔ ''میرے ندیم'' تجسّس پر ختم ہوتی ہے۔

یہی وہ نظم ہے جہاں فیضؔ شاعرِ محبت سے شاعرِ انسان بن جاتے ہیں۔ اب فیضؔ کی شاعری میں تبدیلی صاف نظر آتی ہے۔ جہاں شاعر اپنی ناسمجھی کا اعتراف کرتا ہے جو کہ اپنے محبوب کے حصول ہی کو منزلِ مقصود سمجھ رہا تھا لیکن اب اسے احساس ہو چلا ہے کہ:

اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا
ان گنت صدیوں کے تاریک بہیمانہ طلسم ریشم و اطلس و کم خواب میں بنوائے ہوئے
جا بہ جا بکتے ہوئے کوچہ و بازار میں جسم خاک میں لتھڑے ہوئے، خون میں نہلائے ہوئے

ایک ایسی آواز اُبھرتی ہے جو صدیوں کے بہیمانہ طلسم کو اپنی آغوش میں لے لیتی ہے اور ایک سڑی اور کھوکھلی تہذیب اُبھر کر ہمارے سامنے آتی ہے۔ پورے معاشرے پر وحشت سی چھائی ہوئی ہے۔ مزدوروں، کسانوں اور گاؤں کی زندگی کا استحصال فیضؔ کو مغلوب کر دیتا

ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب دنیا ایک نئی کروٹ لے رہی تھی، محنت کش طبقہ بیدار ہو رہا تھا اور متحد ہو کر سرمایہ داری کا تختہ اُلٹ دینے کا خواب دیکھ رہا تھا۔ اس کے زیرِ اثر ہندوستان میں ترقّی پسند تحریک کا آغاز ہوا۔

فیضؔ کی شاعری کو ایک نیا اور زوردار محرک میسر آیا۔ اب ان کی نظروں میں ایسے سوالات سر اٹھانے لگے مثلاً:

آج تک سرخ وسیہ صدیوں کے سایے کے تلے　　آدم و حوّا کی اولاد پہ کیا گزری ہے
ان دمکتے ہوئے شہروں کی فراواں مخلوق　　کیوں فقط مرنے کی حسرت میں جیا کرتی ہے؟
یہ حسیں کھیت ، پھٹا پڑتا ہے جوبن جن کا　　کس لئے ان میں فقط بھوک اُگا کرتی ہے؟

محنت کشوں اور مزدوروں کے مسائل ومصائب اب ان کی نظر میں تھے اور ان کے دکھ درد میں برابر کے شریک تھے لیکن محبوب کا سراپا اب بھی ان کی آنکھوں کے سامنے گھومتا تھا اور کھوئی ہوئی یادیں اب بھی آ آ کے ستاتی تھیں۔ اس تحریک نے ہزار مضمون فراہم کر دیے تھے۔ ''موضوعِ سخن'' میں فیضؔ نے وضاحت کی ہے کہ حُسن سے زیادہ دل کش ان کے لئے کوئی مضمون ہو ہی نہیں سکتا۔ کہتے ہیں:

یہ بھی ہیں ایسے کئی اور بھی مضموں ہوں گے　　لیکن اس شوخ کے آہستہ سے کھلتے ہوئے ہونٹ
ہائے اس جسم کے کم بخت دل آویز خطوط!　　آپ ہی کہیے، کہیں ایسے بھی افسوں ہوں گے
اپنا موضوعِ سخن اِن کے سوا اور نہیں　　طبعِ شاعر کا وطن اِن کے سوا اور نہیں

فیضؔ تمام ترقّی پسند شعرا میں بے حد منفرد ہیں اس لئے کہ انہوں نے اردو کلاسیکی شاعری کی روایات کو قائم رکھتے ہوئے نئے مسائل اور موضوعات پیش کیے۔ فیضؔ نے اپنی نظم نگاری کو غزل کے رموز وعلائم سے قریب کیا ہے۔ ان کی شاعری میں ''قندیلِ غم'' بھی حرفِ غزل معلوم ہوتی ہے۔ ان کی نظموں میں ''دو عشق، ملاقات، لوح وقلم، سرِ مقتل، زنداں کی ایک صبح، زنداں کی ایک شام، ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے، لیلیٰ وطن، اے دلِ بے تاب ٹھہر، طوق ودار کا موسم'' اور دوسری بیش تر نظمیں احساس کی شدت، رموز وعلائم کی تہ داری اور فن کاری کا مظہر ہیں۔ فیضؔ کی شاعری میں قدیم وجدید میلانات کا خوب صورت امتزاج ملتا ہے۔ وہ کوے یار سے سوے دار تک سفر کرتے ہیں۔ اِنہی خصوصیات نے ان کو اردو شاعری میں ایک اعلیٰ مقام عطا کیا ہے۔ فیضؔ کا اپنی شاعری کے بارے میں یہ کہنا پوری طرح سچ ثابت ہوتا ہے کہ:

ہمیں سے سُنّتِ منصور وقیس زندہ ہے

﴿۳﴾ اسرار الحق مجازؔ: نوجوان طبقے کو مجازؔ نے بہت زیادہ متاثر کیا۔ عزیز احمد مجازؔ کی شاعری کے تعلق سے کہتے ہیں کہ وہ انقلاب اور تغزّل کا حسین امتزاج ہے۔ مجازؔ کی شاعری میں والہانہ انداز اور وارفتگی ملتی ہے۔ مجازؔ نے جب میدانِ شاعری میں قدم رکھا تو ان کے لئے ترقّی پسند تحریک کا پلیٹ فارم موجود تھا اور شاعری کے اُفق پر سرورؔ، علامہ اقبالؔ، چکبستؔ، حفیظؔ، اخترؔ، اصغرؔ اور جگرؔ جیسے شعرا درخشندہ ستاروں کی طرح چمک رہے تھے۔ ان شعرا کے درمیان اپنے وجود کا احساس دلانا بہت بڑی بات تھی۔ کہیں کہیں سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا جا رہا تھا۔ شروع میں مجازؔ پر رومانی کیفیت چھائی رہی۔ آزادی، مساوات،، آزاد خیالی اور جنسی برابری کا تصوّر یہ سب اقدار انہیں بہت عزیز تھیں۔ اس لئے ان کو اشتراکی نظام پسند تھا۔ ''خوابِ سحر'' میں وہ اشتراکیت کو ہی منزل قرار دیتے ہیں:

ذہنِ انسانی نے اب اوہام کے ظلمات میں زندگی کی سخت طوفانی اندھیری رات میں
کچھ نہیں تو کم سے کم خوابِ سحر دیکھا تو ہے جس طرف دیکھا نہ تھا اب تک اُدھر دیکھا تو ہے

مجاز نے ۱۹۳۷ء میں نظم ''سرمایہ داری'' لکھی۔اس نظم میں انہوں نے بہت تلخ حقائق کا انکشاف کیا ہے۔اس نظم سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام کس قدر مہلک وخطرناک ہے۔نظم کا یہ حصہ ملاحظہ فرمائیں:

یہ اپنے ہاتھ میں تہذیب کا فانوس لیتی ہے مگر مزدور کے تن سے لہو تک چوس لیتی ہے
غریبوں کا مقدس خون پی پی کر بہکتی ہے محل میں ناچتی ہے رقص گاہوں میں تھرکتی ہے

مجاز کی شاعری میں اگر کہیں غم وافسردگی کا سایہ نظر آتا ہے تو اس کا تعلق ان کی نجی زندگی کے المیے کے بجائے پوری نسل کے المیے سے ہے۔ان کی یہ ناقابلِ شکست رجائیت اس سیاسی وسماجی شعور کی دین ہے۔جس کے اثرات ان کے زمانے میں نمایاں ہو رہے تھے۔مجاز کی یہ سیاسی بصیرت اور سماجی شعور ان کی نظموں میں واضح نظر آتا ہے۔جہاں وہ سماج سے اپنی بے اطمینانی و نا آسودگی پر احتجاج کرتے ہیں۔کہیں کہیں ان کے احتجاج میں تلخی آ گئی ہے،اور فریاد کی لَو تیز ہوگئی ہے۔مجاز کی ایک مشہور نظم ''آوارہ'' ہے۔یہ اردو شاعری کی ایک شاہ کار اور طویل نظم ہے۔اس نظم میں بھی مجاز آخر تک پہنچتے پہنچتے جذباتی ہو جاتے ہیں اور نعرہ بازی جیسی کیفیت پیدا ہونے لگتی ہے۔یہ بند دیکھیں:

لے کے اک چنگیز کے ہاتھوں سے خنجر توڑ دوں
تاج پر اُس کے دمکتا ہے جو پتھر توڑ دوں
کوئی توڑے یا نہ توڑے میں ہی بڑھ کر توڑ دوں
اے غمِ دل کیا کروں،اے وحشتِ دل کیا کروں

مجاز کے یہاں عام ترقی پسند شعرا کی طرح فنّی بے راہ روی نہیں ملتی۔وہ پرانی روایتوں سے انحراف نہیں کرتے۔ان کے یہاں کلاسیکی شعرا جیسی باوقار سادگی و پرکاری اور ایک سیّال نغمگی وغنائیت ہے،جو ان کی انقلابی نظموں میں نعرے بازی کی کیفیت پیدا نہیں ہونے دیتی۔وہ اپنی تخلیقات میں نرمی ونزاکت اور حُسن کاری کا پورا پورا خیال رکھتے ہیں،وہ اپنی فارسی دانی اور نکھرے ہوئے شعور کی مدد سے وسیع معنویت کی حامل تشبیہات اور تراکیب تراش کر اپنی تخلیقات کو ایسی اثر آفرینی اور معنویت عطا کرتے ہیں جو ان کے ہم عصروں کے یہاں نہیں ملتی۔اردو نظم نگاری میں ان کی حیثیت ایک قد آور نظم نگار کی ہے۔وہ ترقّی پسندی کے اوّلین معماروں میں سے ہیں۔

ان کی شاعری شباب،شراب اور انقلاب کا حسین امتزاج ہے۔مجاز کی شاعری میں ایک نئی آواز سنائی دیتی ہے۔اس کو محض جذبات کا اُبال یا تخیّل کی پیداوار نہیں کہا جا سکتا،اس میں عقل وشعور کی فراوانی ہے اور اس منزل تک پہنچنے میں اس کو کئی منازل سے گزرنا پڑتا ہے۔آغاز میں ایک جذباتی لَے ملتی ہے اور ایک قسم کی جھنجھلاہٹ کا احساس ہوتا ہے۔ایک طرح کی شدّت اور انتہا پسندی نظر آتی ہے لیکن وقت کے ساتھ ساتھ اس میں توازن پیدا ہوتا جاتا ہے اور شعور کی فراوانی اس میں ایک رکھ رکھاؤ پیدا کر دیتی ہے۔اس منزل پر پہنچ کر وہ ایسی شاعری نہیں رہ جاتی جو محض انقلابی ہو بلکہ اس میں حُرّیت وآزادی،اخوّت ومحبت،انسان دوستی اور مساوات کے خیالات رونما ہونے لگتے ہیں۔

مجاز کی اس انقلابی شاعری میں زندگی اور انسانیت کے بارے میں ایک بہت واضح نقطۂ نظر ملتا ہے۔اس نقطۂ نظر کی بنیاد یں حکیمانہ شعور پر استوار نظر آتی ہیں اور یہی اس کی سب سے بڑی خوبی ہے۔ان کی نظموں میں ''طفلی کا خواب، نذرِ دل، نورا، کس سے محبت ہے، ایک غمگین یاد، آج کی رات، اندھیری رات کا مسافر، رات اور ریل اور آہنگِ نَو'' ان کی ایسی نظمیں ہیں جن میں صحت مند جذباتیت ہے۔ان کی پوری شاعری میں نغمگی ملتی ہے۔بالآخر فیض کے نظریے پر یہ بات ختم ہو جاتی ہے جس کے لئے فیض نے ''آہنگ'' کے دیباچے میں لکھا ہے:

''مجاز انقلاب کا ڈھنڈورچی نہیں بلکہ انقلاب کا مُطرب ہے۔''

﴿۴﴾علی سردار جعفری: علی سردار جعفری ترقّی پسند تحریک میں کئی حیثیتوں سے بڑا اہم مقام رکھتے ہیں۔وہ نہ صرف بہت بڑے انقلابی شاعر تھے بلکہ اعلیٰ درجے کے خطیب، نقّاد اور نثر نگار بھی تھے۔ان کی شاعری کی ابتدا مرثیے سے ہوئی تھی۔پھر کلاسیکی روایت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے غزل گوئی کی مگر جب وہ ترقّی پسندی اور مارکسیت کی طرف متوجہ ہوئے تو انہوں نے اپنی مذہبی وراثت (مرثیہ) اور غزل گوئی کو خیر آباد کہہ دیا اور نظم کی طرف متوجہ ہو گئے۔عظمتِ انسانی اور اس کے مسائل کو سمجھنے کے لئے جعفری صاحب نے مذہب کی قیود کو توڑتے ہوئے مارکسی فلسفے کا سہارا لیا اور عظمتِ انسانی کو سمجھتے ہوئے وہ یہاں تک پہنچے:

بغاوت میرا مذہب ہے، بغاوت دیوتا میرا
بغاوت میرا پیغمبر ، بغاوت ہے خدا میرا

اور پھر علی سردار جعفری صاحب مارکسیت واشتراکیت کے علم بردار بن گئے لیکن ان کا کہیں نہ کہیں رومانوی رنگ برقرار رہا۔''لکھنؤ کی ایک شام، انتظار نہ کر، محبت کا افسوں، حُسنِ تمام، اودھ کی خاکِ حسین اور روماں سے انقلاب تک'' جیسی رومانوی نظمیں لکھیں۔قدرت نے علی سردار جعفری کی فطرت میں نظم گوئی کا مادہ کوٹ کوٹ کر بھرا تھا اور اظہارِ تکلّم کے مختلف طریقوں سے اُنہیں روشناس کرایا تھا اور جب علی سردار جعفری نے مارکسیت واشتراکیت کا عقیدہ اختیار کر لیا اور لینن اور اسٹالن کو اپنا رہبر تسلیم کیا تو وہ ایک مارکسی ترجمان اور ایک عظیم الشّان انقلابی شاعر بن کر اُبھرے۔مثلاً:

رگِ مزدور میں خوں بن کے رواں ہے لینن — دل پہ سرمائے کے اک سنگِ گراں ہے لینن
جس کی ہر بات ہے تفسیرِ حیاتِ ابدی — جس کو ہر شخص نے سمجھا وہ زباں ہے لینن

سردار کی مشہور نظم ''جمہور'' جس میں سماج اور سیاست کی منظر کشی ہے اور جو اقبال کی مشہور نظم ''ساقی نامہ'' کی زمین میں ہے اس میں احساس بہت تیز ہے۔مگر خود کو جذبات سے مغلوب ہونے سے بچا لیا ہے۔تہذیبی وثقافتی انسلاکات کی دبیز پرت ہٹانے کی کوشش کی گئی ہے:

یہ ہندوستاں رشکِ خلدِ بریں — اُگلتی ہے سونا وطن کی زمیں
کہیں کوئلے اور لوہے کی کان — کہیں سرخ پتھر کی اونچی چٹان
یہ گنگا کا آنچل یہ جمنا کی ریت — یہ دھان اور گیہوں کے شاداب کھیت
ہمارے مقدّر میں افلاس ہے — غلامی کی ہر جسم میں باس ہے
کہیں ماؤں بہنوں کا ہے مول تول — کہیں بے حیائی کے بجتے ہیں ڈھول

جعفری نے اپنی شاعری میں جس انسان کی پیکر تراشی کی ہے اوران کے یہاں جس انسان کا تخیل ہے وہ صالح روایات کا امین ہے اور اخوّت ،انسانیت اورمحبت و ہمدردی کا مجسمہ ہے ۔وہ جس انسان کی بات کرتے ہیں وہ تقدیر کے برخلاف محنت ،مشقّت ،عملِ پیہم اور جہدِ مسلسل پر یقین رکھتا ہے۔جعفری انسان دوستی اوراس کی بقا کی بات بھی کرتے ہیں۔ان کے اس فلسفے میں مارکسزم کے ساتھ ساتھ تصوّف کا بھی رنگ نظر آتا ہے۔وہ انسان دوستی ،حق پرستی اوراتحاد کا پرچم اُٹھائے نظر آتے ہیں۔دوسرے شعرا کی طرح علی سردار جعفری نے بھی عورت کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے۔ان کے یہاں جس عورت کا تصور ہے اس میں زندگی کی رمق ہے، جینے کی امنگ ہے اوراس کے سینے میں انقلاب کا اُبلتا ہوا مادہ بھی ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ کوثر مظہری کے الفاظ میں: اس کے اندر خود ضبطی ،خود شناسی اور خود حفاظتی کا مادہ بھی موجود ہے۔''نئی دنیا کو سلام'' میں جس عورت کا تصوّر پیش کیا گیا ہے وہ عورت اُنہی خصوصیات کا مجموعہ ہے۔اس نظم میں وہ انگریزوں سے یوں مخاطب ہوتی ہے:

جب سے تم آئے ہو، گھر کی سب برکتیں اُٹھ گئی ہیں
تم نے ہندوستاں کی لہکتی ہوئی کھیتیوں سے
ان کی زرخیزیاں چھین لی ہیں
تم نے اِس ملک کے سبزہ زاروں کی شادابیاں چھین لی ہیں
تم نے پھولوں کو کھلنے، ہواؤں کو چلنے سے روکا
تم نے چشموں کو بہنے سے، فوّاروں کو رقص کرنے سے روکا
اور دریاؤں میں زہر گھولا

ان کی نظموں میں بڑی وسعت ہے اوران کی نظمیں مشترکہ تہذیبی وثقافتی رنگ کی علامت وامین ہے۔اسی کی ترجمانی کرتے ہوئے ڈاکٹر سلیمان اظہر نے کہا ہے کہ جعفری کی شاعری رنگ ونسل ،مذہب وقوم تمام تعصّب سے پاک ہے۔ان کی شاعری میں ہندوستان کی عظمت اوراس کے تقدّس کے نغمے ہیں۔۱۹۴۳ء میں ان کا پہلا مجموعہ ''پرواز'' کے نام سے منظرِ عام پر آیا۔اس مجموعے میں سماج ،بغاوت ،انگڑائی، مزدور لڑکیاں، اشتراکیت، نیا زمانہ، تاریخِ سحر، ارتقا وانقلاب اور جنگ وانقلاب جیسی نظمیں شامل ہیں۔اس سے پتہ چلتا ہے کہ سردار کے خیال میں ابتدا ہی سے پختگی جڑ پکڑ چکی تھی۔سارے عنوانات سے ہی انقلابیت کا ظہور ہے۔جو نظمیں ان کی رومانوی ہیں ان میں انقلاب کا عنصر زیادہ ہے۔۱۹۴۸ء میں ان کی طویل تمثیلی نظم ''نئی دنیا کو سلام'' منظرِ عام پر آئی جو ایک انقلابی نظم ہے۔اثر لکھنوی نے اس نظم کو ''اشتراکیت کا رزمیہ'' قرار دیا ہے۔

سردار جعفری نے اس نظم میں نظریۂ حیات اور نظریۂ آزادی کو پیش کیا ہے۔جاوید اور مریم اس نظم کے دو اہم کردار ہیں۔دونوں کے درمیان محبت ہے لیکن یہ محبت ہوس نہ ہو کر ایک پاکیزگی ،تقدس اور انقلاب کی علامت ہے۔۱۹۵۰ء میں ''امن کا ستارہ'' شائع ہوا اور پھر ان کی نظم ''ایشیا جاگ اٹھا'' شائع ہوئی۔پھر ان کے مجموعے ''پتھر کی دیوار، ایک خواب اور، پیراہنِ شرر اور لہو پکارتا ہے شائع ہوئے۔نومبر میرا

گہوارہ'' ان کی نامکمّل خودنوشت ہے۔ ''پتھر کی دیوار'' جو کہ جیل کی نظموں کا مجموعہ ہے اس مجموعے سے ان کی شاعری میں سنجیدگی اور گہرائی کے عناصر بڑھ جاتے ہیں جو بعد کے مجموعے میں بھی موجود ہیں۔ ان میں فلسفیانہ تفکّرات نظر آتے ہیں۔ ہر چیز نئے چولے میں نظر آتی ہے۔ حقیقت، سماجیت، محبت، اشتراکیت وغیرہ سب میں نیا پن اور نئے نئے خیالات کا اظہار ہوتا ہے۔ اس دَور میں سردار جعفری کی شاعری جدّت کے اعلیٰ معیار پر فائز ہوتی ہے۔

سردار جعفری نے غالبؔ و اقبالؔ سے بھرپور فیض اُٹھایا ہے۔ ان کے اُسلوب کی پیروی کی ہے۔ پُرشکوہ الفاظ اور تراکیب کا بھی استعمال کیا ہے۔ اپنا اندازِ بیان سلیس اور صاف ستھرا رکھا ہے۔ وہ اپنی شاعری کو عوام کی شاعری کہتے ہیں۔ ان کی تمنا ہے کہ ان کی شاعری زیادہ سے زیادہ مزدور اور کسان پڑھیں۔ اسی لئے بول چال کی زبان استعمال کرتے ہیں۔ سردار جعفری نے استعارات و تشبیہات اور کنایات کا بھرپور استعمال کیا ہے۔ دراصل ان کی شاعری انسان دوستی، مشترکہ تہذیب، مزدور و مظلوم کی ہم دردی سے عبارت ہے۔ وہ نظم کے شاعر ہیں اور بالخصوص آزاد نظم کے۔ اس ہیئت کے جتنے خوب صورت، دل کش، البیلے اور رواں نمونے سردار جعفری کے یہاں ملتے ہیں ویسے دوسروں کے یہاں بہت مشکل سے ہی ملتے ہیں۔

﴿۵﴾ اختر الایمان: اختر الایمان کا شمار اردو کے نظم گو شعرا میں صفِ اوّل کے ہوتا ہے۔ انہوں نے نظم کی ہیئت میں کامیاب تجربے کیے اور اردو نظم کو ایک نیا رنگ و آہنگ عطا کیا۔ جس کی بنا پر شمس الرحمٰن فاروقی نے ان کو ہندوستان میں نئی شاعری کا باوا آدم قرار دیا ہے۔ اختر الایمان نے اردو کی شعری روایت کی کہیں پاس داری کی ہے تو کہیں اس سے انحراف بھی کیا۔ ترقّی پسند تحریک کے غلبے کے باوجود انہوں نے اپنی فکر و فن کی الگ راہ نکالی اور تا دمِ تحریر اس راہ پر قائم رہے۔ ان کی کامیابی کا راز بھی یہی ہے کہ وہ فکر کو جذبے میں ڈھالنے اور فکر و فن کو صحیح طور پر برتنے کا ہنر جانتے ہیں۔ فراقؔ گورکھپوری ان کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''نئے شاعروں میں سب سے گھایل آواز اختر الایمان کی ہے۔ اس میں جو چٹیلا پن، تلخی اور جو دہک اور تیز دھار ہے وہ خود بتا دے گی کہ آج ہندوستان کے حسّاس نوجوانوں کا المیہ کیا ہے۔''

اختر الایمان کی ابتدائی نظموں میں رومانی شاعری کے اثرات نمایاں ہیں۔ اسی رومانی رنگ و آہنگ کی وجہ سے ان کی اس دَور کی نظموں میں ایک قنوطیت اور گریز کا احساس پایا جاتا ہے۔ ''نیند سے پہلے، نقشِ پا، دُور کی آواز، لغزش، تصور اور تنہائی وغیرہ میں یہ رنگ کافی نمایاں نظر آتا ہے لیکن اختر کو جلد ہی احساس ہو گیا کہ دنیا میں محبت کے سوا اور بھی غم ہیں اور اپنی ذات سے باہر بھی ایک دنیا ہے۔ اس لئے وہ اپنی ذات کے خول سے باہر آ کر اپنے عہد کے اُبھرتے ہوئے تقاضوں کو سمجھنے اور عصری زندگی کے مسائل کو اپنی شاعری میں سمونے کی طرف مائل ہوئے۔ اس طرز کو اپنانے کے باوجود اختر نے اپنی شاعری کو ن۔ م۔ راشد اور میرا جی کی طرح جنسی گھٹن سے ملوث نہیں ہونے دیا اور نہ ہی دوسرے ترقّی پسندوں کی طرح سطحی جذباتیت کے اظہار کا ذریعہ بنایا۔ وہ ماضی کے ادبی ورثے سے اپنا رشتہ نہیں توڑتے۔

ان کی نظم نگاری کی خصوصیات ڈرامائیت، خود کلامی، مکالماتی انداز، علامتوں کا استعمال، محاکات نگاری، پیکر تراشی اور روزمرہ کی زبان کا تخلیقی استعمال وغیرہ ہیں۔ اردو نظم کی روایت پر نظر ڈالیں تو بہت سے شعرا کے یہاں ڈرامائی انداز ملتا ہے۔ اختر الایمان کی شاعری ڈرامائیت، شعری زبان اور آہنگ سے عبارت ہے۔ نظم ''ایک لڑکا'' سے ایک بند دیکھیے:

یہ لڑکا پوچھتا ہے جب تو میں جھلاّ کے کہتا ہوں وہ آشفتہ مزاج ، اندوہ پرور ، اضطراب آسا
جسے تم پوچھتے رہتے ہو کب کا مر چکا ظالم اسے خود اپنے ہاتھوں سے کفن دے کر فریبوں کا
اسی کی آرزوؤں کی لحد میں پھینک آیا ہوں میں اس لڑکے سے کہتا ہوں وہ شعلہ مر چکا جس نے
کبھی چاہا تھا اک خاشاکِ عالم پھونک ڈالے گا یہ لڑکا مسکراتا ہے ،یہ آہستہ سے کہتا ہے
یہ کذب وافترا ہے ،جھوٹ ہے ،دیکھو میں زندہ ہوں

اختر الایمان نے اپنی شاعری میں علامتوں کو بڑی کامیابی کے ساتھ برتا ہے۔علامتی انداز کی نظموں میں ''موت ،مسجد، پرانی فصیل، تنہائی ،اور ایک لڑکا'' قابلِ ذکر ہیں۔مسجد اور پرانی فصیل عقائد اور اقدار کی شکست وریخت کی علامتیں ہیں۔موت اور تنہائی میں وقت کی بے رحمی اور انسان کی ازلی وابدی تنہائی کو علامتی پیرایے میں پیش کیا ہے اور نظم ایک لڑکا میں ایک لڑکا انسانی ضمیر کی علامت ہے۔

اختر الایمان علامتوں کے ساتھ ڈرامائی طرزِ اظہار سے نظموں میں دل کشی پیدا کرتے ہیں اور یہی انداز ان کی نظموں میں فنّی ومعنوی سطحوں پر ان کی تخلیقی صلاحیتوں اور شاعرانہ اظہار کی انفرادیت کا بیّن ثبوت ہے:

حسرتِ شام وسحر بیٹھ کے گنبد کے قریب ان پریشان دعاؤں کو سنا کرتی ہے
جو ترستی ہی رہیں رنگِ اثر کی خاطر اور ٹوٹا ہوا دل تھام لیا کرتی ہے

اس بند میں حسرت علامت ہے مذہب کے احیا کی ،مسجد ویران ہوگئی ہے اس مذہب کے پیروؤں کی ،اپنے مذہب سے دوری کے سبب مسجد نمازیوں سے خالی ہے اور اس کے رکھ رکھاؤ اور صفائی کا بھی انتظام نہیں ہے۔مذہبی احیا پسند آنکھیں اسے آباد دیکھنا چاہتی ہیں اور دعاؤں کا رنگِ اثر دیکھنے کی منتظر ہیں۔اس نوع کی نظموں میں مفاہمت ،شیشہ کا آدمی ،کل کی بات ،بُزدل ،نیند کی پریاں ،یادیں ،اپاہج گاڑی، بازآمد ،ایک منتاج ،کالے سفید پروں والا پرندہ اور میری ایک شام وغیرہ ان کی بہترین نظموں میں شمار کی جاتی ہیں۔اختر الایمان کی شاعری میں وقت کو مرکزیت حاصل ہے۔وقت کے ناگزیر فلسفے کو انہوں نے مختلف علامتوں کے ذریعہ شعری پیکروں میں ڈھالا ہے۔ان نظموں میں کہیں وقت کی جبریت کو موضوع بنایا ہے تو کہیں قوّتِ شفا کو، وقت انسانوں پر ظلم ڈھاتا ہے جس کے نتیجے میں کبھی فراق تو کبھی ابدی جدائی نصیب بن جاتی ہے لیکن وقت ہی جدائی کے درد کو قابلِ برداشت بھی بناتا ہے اور کاری زخموں کو وقت ہی مندمل کرتا ہے۔

ان کی نظم سحر کے اس بند سے ان کے فلسفۂ وقت کو سمجھا جاسکتا ہے:

کون سی راحتِ دوراں جو میسر آئی داغ دے کر نہ گئی ، کون سے لمحات نشاط
ٹیس بن کر نہ اٹھے، زہر نہ چھوڑا مجھ میں ہر نیا واقعہ اک حادثہ تھا ، ہر نئی بات
فالِ بد نکلی ،کیا زخمِ دروں کو گہرا پھر بھی وہ کون سا جادو ہے جو ہر تازہ وفات
یوں بھلا دیتا ہے جی سے کہ نشاں بھی نہ ملیں

فنّی اعتبار سے اختر الایمان کی نظمیں پوری طرح کامیاب ہیں۔ یہ نظمیں ارتقا کے مختلف مدارج سے گزرتی ہوئی پایۂ تکمیل تک پہنچتی ہیں۔ ابتدا میں مرکزی خیال اور خاتمے کے موضوعات کے مطابق لب و لہجے میں اُتار چڑھاؤ نظر آتا ہے۔ موضوع اور ماحول کے اعتبار سے ہم آہنگ الفاظ استعمال کرتے ہیں، ان کا لہجہ نرم ہوتا ہے اور بڑھے دھیمے لہجے میں دل کی آگ باہر انڈیلنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اختر الایمان نے اپنی نظموں کو مؤثر بنانے کے لئے علامت نگاری کے لطیف شاعرانہ استعمال کا سہارا لیا ہے۔ تشبیہ و استعارہ کا سہارا لیے بغیر الفاظ کے ذریعے نمائندہ تصویریں اور بولتے ہوئے لطیف و بلیغ منظر پیش کیے ہیں۔ الفاظ و تراکیب اور تشبیہات و استعارات کے استعمال میں ندرت و شگفتگی کا خاص خیال رکھا ہے۔ عربی، فارسی اور ہندی کے ایسے الفاظ استعمال کیے جو نظم کے موضوع سے پوری طرح ہم آہنگ تھے۔ فکر و فن کی اِنہی خوبیوں کی وجہ سے فیضؔ کے بعد اختر الایمان کی شاعری کو سب سے زیادہ قبولِ عام کا درجہ حاصل ہوا۔ ان کے سر ادبی عظمت کا تاج عام قاری ہی نہیں بلکہ بلند پایہ نقادوں نے بھی رکھا ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر محمد حسن ان کی شاعری سے متعلق اپنے تاثرات ان الفاظ میں پیش کرتے ہیں:

''مجموعی حیثیت سے اختر الایمان کی شاعری عہدِ جدید کے ادبی سرمائے میں ایک اہم اضافہ ہے۔
اُسلوبِ بیان کے انوکھے پن، احساس کی ندرت، شگفتگی، فکر انگیزی، ایمائی انداز اور لفظیات کے
نادر ذخیرے کی وجہ سے اختر الایمان کو ہمارے دور کے اچھے شاعروں کی صف میں جگہ دی جائے گی۔''

''ایک سوال، خاک و خوں، نئی صبح، ایک کہانی، پندرہ اگست، آزادی کے بعد، اندوختہ اور سوالیہ نشان'' وغیرہ کئی نظموں میں اپنے دَور کے مسائل پیش کیے ہیں۔ اختر الایمان نے پابند اور معرّیٰ نظمیں بھی لکھیں ہیں۔ ان کی نظم ''ایک لڑکا'' بہت مشہور و مقبول ہوئی۔

﴿۶﴾ کیفی اعظمی: کیفی اعظمی ترقّی پسند شعرا میں صفِ اوّل کے شاعر ہیں۔ کیفی نے بھی ترقّی پسند تحریک کے زیرِ اثر انسانی سماج میں پنپ رہی محکومیت اور مظلومیت کو موضوعِ سخن بنایا۔ ترقّی پسند شاعروں میں تقریباً ہر شاعر نے ''عورت'' پر ہو رہے جبر و استبداد کو اپنی شاعری کا حصہ بنایا ساتھ ہی عورت کی عظمت و وقار کو پیش کیا۔ عورت کو بھی سماجی اور سیاسی تحریک میں مردوں کے شانہ بہ شانہ چلنے کی تلقین کرتے ہیں۔

نظم ''عورت'' سے چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

قدر اب تک تری تاریخ نے جانی ہی نہیں — تجھ میں شعلے بھی ہیں بس اشک فشانی ہی نہیں
تو حقیقت بھی ہے دل چسپ کہانی ہی نہیں — تیری ہستی بھی ہے اک چیز، جوانی ہی نہیں
اپنی تاریخ کا عنوان بدلنا ہے تجھے — اُٹھ مری جان! مرے ساتھ ہی چلنا ہے تجھے

عورت اس کائنات کی اکائی ہے۔ معاشرے اور تہذیب و تمدّن کا جزوِ لاینفک ہے۔ اس لئے اس کا تحفّظ بہ صد احترام لازمی ہے۔ ہر گوشۂ حیات میں اس کا وجود لازمی طور پر ہوتا ہے۔ عورت جب بیوہ ہو جاتی ہے تو معاشرے میں اس کے ساتھ کس طرح کا سلوک روا رکھا جاتا ہے۔ اس پر کیفی کی ایک نظم ''بیوہ کی خودکشی'' ہے جس میں درد و کرب ہے۔ ایک ایسی بیوہ جس کی بیٹیاں جوان ہیں، جس پر ساس اور نند کا ظلم و ستم روا ہوتا ہے۔ ہندو مذہب میں عورت کو دوسری شادی کرنے کی اجازت نہیں۔ اگر کوئی عورت یہ اقدام کر لے تو تاعمر مطعونِ خلائق رہتی ہے۔ یہ نظم کھوکھلی تہذیب اور نام نہاد کلچر پر کاری ضرب لگاتی ہے۔

نظم کا یہ حصہ ملاحظہ ہو:

چاہتی ہے لاکھ قابو دل پہ پاتی ہی نہیں زخم خوردہ نوجوانی بس میں آتی ہی نہیں
جب کھنک اٹھتی ہیں سوتی لڑکیوں کی چوڑیاں آہ بن کر اُٹھنے لگتا ہے کلیجے سے دھواں
جب نظر آتا نہیں دیتا کوئی بے کس کا ساتھ زہر کی شیشی کی جانب خود بخود بڑھتا ہے ہاتھ
دل تڑپ کر کہہ رہا ہے جلد اس دنیا کو چھوڑ چوڑیاں توڑیں تو پھر زنجیرِ ہستی کو بھی توڑ
دل اِنہی باتوں میں اُلجھا تھا کہ دم گھبرا گیا ہاتھ لے کر زہر کی شیشی لبوں تک آگیا
تلملاتی ، آنکھ جھپکاتی ، جھجکتی ، ہانپتی پی گئی کل زہر آخر تھرتھراتی، کانپتی
موت نے جھٹکا دیا ، کل عضو ڈھیلے ہوگئے سانس اُکھڑی ،نبض ڈوبی ،ہونٹ نیلے ہوگئے

سماجی زندگی اوراس کے سروکار سے ہی ترقّی پسند تحریک وابستہ رہی۔شاعری کی معنویت سماجی اُمور میں مضمر ہے۔اس کے زاویۂ فکر کی وضاحت پروفیسر محمد حسن کے اس قول سے ہوتی ہے:

''۱۹۳۶ء میں ترقّی پسند تحریک کی ابتدا ہوئی تو نظم نگاری کی اہمیت سے سماجی معنویت کا احساس بھی بڑھا۔ترقّی پسند ادیبوں نے سماجی ذمہ داریوں کو تسلیم کیا اور ایسے موضوعات کو اپنایا جو سماج کے لئے بنیادی اہمیت رکھتے ہیں جہاں زندگی اور تہذیب کی پرانی اخلاقی اور مذہبی قدریں ٹکراتی گئیں وہاں غزل کی فرسودگی کا احساس بھی پیدا ہوا۔''

مفلسی ،طبقاتی کشمکش ،قحط ،بھوک اور ناداری کے خلاف انقلابی اور اشتراکی شاعری پروان چڑھی۔کیفی اعظمی بھی ''لال جھنڈا'' کی تعریف میں رطب اللّسان ہوئے۔''لال جھنڈا'' میں کیفی نے کمیونزم کے اغراض ومقاصد کو پیش کیا۔ٹاٹا برلا کی تضحیک کی گئی۔

مثلاً یہ اشعار دیکھیں:

یہ وہ جھنڈا ہے لرز جاتے ہیں جن سے تاج دار یہ وہ جھنڈا ہے اُٹھے ہیں لے کے جن کو کام گار
نصب کردیں گے اِسے اک روز ہر دیوار میں کارخانوں میں ،ملوں میں ،کھیت میں ،بازار میں

اس نظم میں کمیونزم سے وابستگی کا خاص اندازہ ہوتا ہے۔کیفی اعظمی کو اپنے ملک وقوم سے اور اس کی تہذیبی میراث سے بے حد دل چسپی ہے۔وہ محبِّ وطن بھی ہیں اور انہیں قوم کی زبوں حالی کا احساس بھی ہے۔ان کا تہذیبی شعور بالیدہ اور مستحکم ہے۔انسان پر انسان کی حکومت انہیں تہذیبِ انسانی کے منافی معلوم ہوتی ہے۔کیفی اعظمی کی شاعری میں مزدور ،کسان ،نادار ،مفلس اور دہقان کی زندگی کے واضح مسائل اور ان پر ہو رہے جبر واستبداد کے نقوش ملتے ہیں۔کیفی کی شاعری حال ومستقبل کی شاعری ہے۔

کیفی کی بہت سی نظمیں ہنگامی و وقتی موضوعات سے متعلق ہیں جو ان کی نظموں کے نام سے بھی ظاہر ہے مثلاً ''گاندھی جناح کی ملاقات پر ،سوویت یونین اور ہندوستان ،سلام اے روس ،فتحِ برلن اور قومی حکمران'' وغیرہ۔لیکن ان نظموں میں ایک خاص کیفیت ہوتی ہے۔

کیفی نے ہنگامی نظموں کے ساتھ رومانی اور عشقیہ نظمیں بھی لکھی ہیں۔ان میں ان کی نظم ''بوسہ'' قابلِ ذکر ہے اس رنگ کی دوسری نظموں میں ''اندیشہ، پشیمانی، پامسٹ، حوصلہ اور تبسم'' شامل ہیں۔

﴿۷﴾ ساحرؔ لدھیانوی: ہر زمانے میں معاشرہ کثافتوں اور آلودگیوں سے متاثر رہا ہے۔نوعیت بھلے ہی بدلتی رہے لیکن سماج میں طبقاتی کشمکش وتفریق کی فضا ہر زمانے میں قائم رہتی ہے۔ترقی پسندوں نے اسی کشمکش اور آلودگی کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی ہے۔ساحرؔ لدھیانوی بھی اسی ترقّی پسند تحریک کا ایک اہم نام ہے۔نوجوان طبقے میں ان کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔ساحرؔ اصلاً نظم کے شاعر ہیں۔ان کی بیش تر نظمیں ان کی طالب علمی اور نوجوانی کے جوش وخروش کا نتیجہ ہیں جن میں ان کے معاشقوں کی جھلک اور ملک وسماج کا درد بھی ہے۔ ساحرؔ کی زندگی کے حالات وحادثات نے ہمیشہ ان کا پیچھا کیا، جو ان کے اشعار میں ڈھل گئے:

دنیا نے تجربات و حوادث کی شکل میں
جو کچھ مجھے دیا ہے وہ لوٹا رہا ہوں میں

ساحرؔ کی شاعری میں عصری آگہی، انسانی درد اور سیاسی وسماجی شعور سبھی عناصر موجود ہیں لیکن ساحرؔ سماج کی سچائی بیان کرنے میں لرزہ براندام نہیں ہوتے، ساتھ ہی دوسرے کئی ترقّی پسندوں کی طرح بلند آہنگ نعرے بازی نہیں کرتے۔مدھم لہجے میں اپنی باتیں لوگوں کے دلوں میں اُتارنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔انہوں نے سماج کی کثافتوں اور آلودگیوں کو اپنی شاعری کا حصہ بنایا ہے۔ساحرؔ کا کمال یہ ہے کہ مقاصد کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اس نوع کی شاعری کی ہے جو احساس وجذبے کو چھوتی اور برانگیختہ کرتی ہے۔انہوں نے پاکیزہ محبت، نشاط وکرب اور حزن وملال کی کیفیت کو معصومانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ان کے یہاں فکر ورومان کا سفر متوازی میلان کے ساتھ طے ہوتا ہے۔

ساحرؔ نے اپنی فکر کی آنچ تیز رکھی ہے مگر بہ وقتِ اظہار ہوش مندی اور فنّی بصیرت سے کام لے کر آہستہ روی کو ہی اہم اور ناگزیر تصوّر کیا ہے۔انقلاب واستحصال کا کھل کر اظہار کیا ہے مگر ان کے اندر فن کارانہ شعور پر نری جذباتیت غالب نہیں آسکی ہے۔ان کے یہاں رومانیت کی نرم ونازک شیریں آواز ان کے مجموعے ''تلخیاں'' کی مقبولیت کا سبب بن گئی۔ساحرؔ کی شاعری کو مختلف حصوں میں منقسم کیا جاسکتا ہے مثلاً: رومانی شاعری، احتجاجی شاعری، سیاسی شاعری، انقلابی شاعری اور ساحرؔ کی شاعری میں عورت کا مقام کیا ہے۔

ساحرؔ کا ابتدائی مجموعۂ کلام ''تلخیاں'' ہے۔ساحرؔ کی رومانیت میں ان کے پاکیزہ جذبات وتصوّرات نے فکر کی معراج کو چھولیا ہے۔ ان کے یہاں خواب وخیال نہ صرف ذہنی ووقتی لطف کے لئے ہوتے ہیں بلکہ آگے بڑھنے کا حوصلہ بخشتے ہیں۔کیوں کہ زندگی میں اگر خواب نہ ہوں تو زندگی بے رنگ وبے مقصد ہو جائے۔یہ ضروری بھی نہیں کہ ہر خواب کی تعبیر پوری ہو لیکن فکر وخیال سے زندگی جینے کا مقصد حاصل ہوتا ہے اور رومانیت میں خواب وخیال پر بڑا زور بھی دیا جاتا ہے۔اس لئے ساحرؔ کی رومانی نظمیں سماج کو نئے نئے خواب بننے کی دعوت دیتی ہیں:

آؤ کہ کوئی خواب بنیں کل کے واسطے ورنہ یہ رات آج کے سنگین دَور کی
ڈس لے گی جان و دل کو کچھ ایسے کہ جان و دل تا عمر پھر نہ کوئی حسیں خواب بن سکیں

یہ بند نظم ''آؤ کہ کوئی خواب بُنیں'' سے ماخوذ ہے۔ یہ جاگتی آنکھوں کے خواب ہیں جو زمانے کو بدلنے کے متمنّی ہیں۔ ساحرؔ اپنی قوم اور ملک کے لوگوں کو بیدار کرنے کی کوشش میں ہیں۔

احتجاجی شاعری: ساحر کا احتجاج کہیں عشق کی ناہمواری، کہیں سیاسی وسماجی بدعنوانی، کہیں عورت کے حقوق تو کہیں ملک کی آزادی کے لئے تھا۔ ان کی احتجاجی نظمیں تہذیبی اقدار کو برقرار رکھتے ہوئے آگے بڑھتی ہیں۔ ساحرؔ کے احتجاج کا جو سفر اپنے خاندان کی بے جا حرکتوں سے شروع ہوا تھا وہ ملک اور قوم کے رہنزنوں تک پہنچ گیا۔ جہاں ساحرؔ نے شہنشاہوں کو بھی نہیں بخشا۔

نظم ''تاج محل'' میں شہنشاہ کے جذبات اور تاج محل کے حُسن پر ہی غور نہیں کیا بلکہ ان لوگوں کے ہاتھوں کی فن کاری پر توجہ دلائی جنہوں نے تاج محل کو سجایا اور سنوارا اور اسے ابدی حُسن عطا کیا تھا:

میری محبوب! اُنہیں بھی تو محبت ہوگی جن کی صنّاعی نے بخشی ہے اِسے شکلِ جمیل
اُن کے پیاروں کے مقابر رہے بے نام ونمود آج تک اُن پہ جلائی نہ کسی نے قندیل

ساحرؔ کی یہ نظم ان کے اشتراکی نظریے کی دین ہے۔ سماج اور سیاست کی مخالفت کرتا ہوا ساحرؔ کے احتجاج کا سفر جنگ وجدل کی طرف بڑھتا ہے۔ ساحرؔ نے ہندوستان اور پاکستان کے پس منظر میں ایک نظم ''اے شریف انسانو'' کہی۔ اس نظم میں کھوکھلی تہذیب اور انسانیت کے کھوکھلے دعوں کی قلعی کھولی گئی ہے یہ نظم ترقّی پسند تحریک کا پروپیگنڈہ نہیں بلکہ جذبۂ انسانیت سے سرشار ایک دل کا نوحہ ہے جس میں جنگ کو انسانیت اور تہذیب کا دشمن قرار دیا ہے۔ چوں کہ جنگ سے جان و مال کا نقصان ہوتا ہے اور کوئی مسئلہ حل نہیں ہوتا۔ نظم ''اے شریف انسانو'' میں ساحرؔ جنگ کے خلاف احتجاج کرتے نظر آتے ہیں:

خون اپنا ہو یا پرایا ہو نسلِ آدم کا خون ہے آخر
جنگ مشرق میں ہو کہ مغرب میں امنِ عالم کا خون ہے آخر
بم گھروں پر گریں کہ سرحد پر روحِ تعمیر زخم کھاتی ہے
کھیت اپنے جلیں کہ اوروں کے زیست فاقوں سے تلملاتی ہے
جنگ وحشت سے، بربریت سے امن، تہذیب و ارتقا کے لئے
جنگ مرگ آفریں سیاست سے امن، انسان کی بقا کے لئے
جنگ تو خود ہی ایک مسئلہ ہے جنگ کیا مسئلوں کا حل دے گی
آگ اور خون آج بخشے گی بھوک اور احتیاج کل دے گی

ساحرؔ نے اخوّت، آفاقی ہم دردی اور محبت کی شمعیں روشن کرنے کی کوشش اور تلقین بھی کی۔ انہوں نے ترقّی پسندوں کے ساتھ رہتے ہوئے بھی اپنے ہی احساس کو اپنی فکر کا رہ نما سمجھا نہ کہ ترقی پسند تحریک کے فارمولے اور منشور کو۔ جاں نثار اختر نے بڑی سچی بات لکھی ہے:

''اس نے خود کو دھوکہ دیا نہ اپنے فن کو نہ ترقّی پسند تحریک کو نہ عوام کو.....اس نے وہ کیا جو بحیثیت ایک بیدار شاعر اس کا فرض تھا۔''

(دیباچہ، گاتا جائے بنجارہ)

سیاسی و انقلابی شاعری: ساحؔر نے جس وقت سیاسی و انقلابی نظمیں کہیں ان کے ذہن میں ملک و سماج کے حالات کے سبب بے قراری تھی۔ ان کی سیاسی نظموں میں کہیں مایوسی، غم اور افسوس ہے تو کہیں اُمید کی ایک کرن بھی ہے جسے ترقّی پسند شاعری میں رجائیت کا عنصر کہا جاتا ہے۔ چوں کہ ترقّی پسند شاعر مایوس نہیں ہوتا وہ اپنی جدوجہد کے درمیان کوئی نہ کوئی راستہ نکال لیتا ہے اس لئے اس کے یہاں 'امید کا چراغ کبھی بجھتا نہیں' روشن رہتا ہے۔ ساحؔر کی شاعری میں جہاں غم و غصہ اور مایوسی ہے وہیں آزادی حاصل کرنے کے لئے کچھ امیدیں بھی ہیں کچھ خواب ہیں کہ ہم اپنی جدوجہد سے اپنی محنت اور مضبوط و محکم ارادوں سے ایک نہ ایک دن آزادی حاصل کرلیں گے۔

ساحؔر نے ایک شعر میں اسی خیال کا اظہار کیا ہے:

ایک نیا سورج چمکا ہے، ایک انوکھی ضو باری ہے　　　ختم ہوئی افراد کی شاہی اب جمہور کی سالاری ہے

ساحؔر کی شاعری میں عورت کا مقام: ساحؔر کی نظموں میں جہاں رومانیت اور احتجاج کی سرد و گرم کیفیت ہے وہیں عورت کی عظمت کا احترام بھی ہے۔ ساحؔر کی شاعری میں عورت حور یا پری نہیں بلکہ خالص ہندوستانی لڑکی ہے جو کہیں کسان کی جھونپڑی میں جنم لیتی ہے، کہیں جہیز کے لئے جلائی جاتی ہے تو کہیں مجبوریوں کے سبب طوائف بنادی جاتی ہے۔ وہ کہیں زمانے کے ظلم کا، کہیں مفلسی کا، تو کہیں مردانہ سماج کا شکار ہے۔ ساحؔر کی ہم دردی ایسی ہی مظلوم و مجبور عورت سے ہے جس کا کہیں نہ کہیں استحصال ہو رہا ہے۔

ساحؔر اپنی ایک نظم میں عورت کی اسی حالت پر افسوس کرتے ہیں:

نکلی ہے بنگلے کے در سے- اک مفلس دہقاں کی بیٹی
افسردہ مرجھائی ہوئی سی- جسم کے دُکھتے جوڑ دباتی
آنچل سے سینے کو چھپاتی- مٹھی میں اک نوٹ دبائے
جشن مناؤ سالِ نو کے

ساحؔر نے ایسے بے رحم حالات کو بدلنا چاہا ہے۔ وہ سماج میں انقلاب لانا چاہتے ہیں تا کہ زمانہ عورت کو ہوس سے اور گندی نگاہوں سے نہ دیکھے۔ عورت کی عزت سے واقف ہو سکے۔ کیوں کہ ایک عورت اپنی ذات میں بہت سے رشتے رکھتی ہے اور وہ ماں، بیٹی، بہن اور بیوی ہے۔ ساحؔر نے معاشرے کی کھوکھلی تہذیب اور انسانی کمزوریوں کو نشانہ بنایا ہے۔ ان کی فکری لَو تیز ہے لیکن اس سے جو روشنی نکلتی ہے وہ دلوں کو جلاتی نہیں بلکہ سلگنے کی کیفیت سے دوچار کرتی ہے۔ ان کی لفظیات فیضؔ سے بہت قریب ہے۔ ''چکلے، پرچھائیاں، اے شریف انسانو، شعاعِ فردا، یہ کس کا لہو، تاج محل اور مرے عہد کے حسینو'' ایسی اہم نظمیں ہیں جن میں خلوص اور بے ساختگی ملتی ہے۔ آخر میں ساحؔر لدھیانوی فلمی دنیا سے ایسے وابستہ ہوئے کہ ادبی میدان سے گویا کنارہ کشی اختیار کرلی لیکن ان کے فلمی گیتوں میں ترقّی پسندی کی جھلک صاف نظر آتی ہے۔

﴿۸﴾ سلام مچھلی شہری: ۱۸۵۷ء کے بعد معاشرے میں انحطاط وزوال کی جو فضا قائم ہوئی اس کا اثر ترقّی پسند تحریک کے زمانے تک رہا۔ سلاؔم مچھلی شہری کی زندگی میں فیض آباد اور ایودھیا میں قائم ہونے والی محرم کی مجلسوں، جھولوں اور میلوں کا رنگ بھی شامل ہے۔ انہوں نے خود اس کا ذکر ''غبارِ کارواں'' میں کیا ہے۔ ان کی زیادہ تر نظمیں فیض آباد کی یادگار ہیں۔ ۱۹۴۰ء میں ''میرے نغمے'' گیتوں کا مجموعہ شائع ہوا۔ اس کا پہلا حصہ ''انگارے'' چھپنے سے قبل ہی انقلابی ہونے کے سبب ضبط کرلیا گیا۔ دوسرا مجموعۂ کلام ''وسعتیں'' ۱۹۴۴ء میں شائع ہوا اور اس کے بعد ان کے گیتوں کا مجموعہ ''پائل'' شائع ہوا۔

سلاؔم مچھلی شہری پر قاضی نذرالاسلام اور ٹیگور کی فکر اور شاعری کا گہرا اثر پڑا۔ ان کی شروع کی شاعری میں قصباتی فضا، پیپل اور آم کی چھاؤں اور باغوں کے جھولوں کا ذکر خوب ہوا ہے۔ بہشتی زیور، رامائن، میلادِ اکبر، انیؔس کے مراثی اور سنتوں کی مدھم آواز کی مدد سے بھی ان کی شاعری کی فضا بندھی ہوئی ہے۔ پرانا جھونپڑا جس سے ان کی ماضی کی بہت سی یادیں وابستہ ہیں، محض طرزِ اظہار نہیں بلکہ صداقت اور اصل تہذیب کے نقوش کا ترجمان بھی ہے۔

کلامِ سلاؔم سے ایک نظم ''باغ کا وہی جھونپڑا'' کا منظر ملاحظہ کیجیے:

آج وہی جھونپڑا-واقعی ویران ہے
آ کے اسی میں بسا-آج اک انسان ہے
میلا کچیلا غریب-فاقہ کش و بدنصیب

گیتوں میں گاؤں اور قصبوں کی تہذیب اور اس کے مسائل کو بڑی خوب صورتی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ سلاؔم ترقّی پسندوں میں گیت کے لئے بھی مشہور ہیں۔ کہیں انسانی اخوّت اور عالم گیر مساوات کا ذِکر ہے تو کہیں پیڑوں کے سائے میں رومان پرور کتھاؤں کا بیان، کہیں سماجی مسائل اور ان کے حل کیے جانے کی خاطر جدوجہد، تو کہیں پریم رَس ہے۔ سیّد مطلّبی اور سجّاد ظہیر نے گیت لکھے ہیں۔ مجاؔز کا گیت ''بول اری او دھرتی بول''، وامقؔ کا ''بھوکا ہے بنگال رے بابا'' اور سوامی مارہروی کے گیت ''بھوکا بالک، ٹکے کا مزدور اور دھوبن کا گیت وغیرہ ترقّی پسند تحریک کے زیرِ اثر ہونے والی شاعری کے اچھے نمونے ہیں۔ مجروؔح اور مخدوؔم نے بھی اسی نوعیت کے گیت لکھے ہیں۔

سلاؔم مچھلی شہری نے بھی گیت لکھے جن میں رومان پروری کے اثرات غالب ہیں۔ مثلاً: ''مہدی، کہیں چھپ کر پپیہا مچائے شور، گیتوں کے ہر واگوندھوں گی، ان نینوں میں کاہے کو ہے نیر، میں باغ کی نازک تتلی ہوں، کوئی توڑے نہ سپنوں کا ہار، کمسن کلیاں چنچل تارے، چھوٹا سنسار ہمارا اور کورس وغیرہ سلاؔم کے ایسے گیت ہیں کہ جن میں ایک زندہ اور متحرک معاشرے اور انسانی تہذیب کی جھلکیاں ملتی ہیں۔ سلاؔم مچھلی شہری نے کمزور طبقے، کسانوں اور مزدوروں کے مسائل کو موضوعِ سخن بنایا۔ سلاؔم کی نظر معاشرے کی کھوکھلی تہذیب پر بھی ہے، جو مذہب کے نام پر وضع ہوئی ہے۔ ہندوؤں کے یہاں کسی کسی جگہ مندروں کے اندر بڑی ذات والے نچلی ذات یا طبقے کے افراد کو پوجا ارچنا کے لئے نہیں جانے دیتے۔

نظم ''خاموش رہو'' کے منظر کو ملاحظہ کیجیے:

لاچار ہوں، دکھیا ہوں بابو! - دو روز سے بھوکا ہوں بابو!

خاموش رہو! - کیا چھوت ہے بابا جانے دو!

مندر میں پھول چڑھانے دو - خاموش رہو! - خاموش رہو!

سلاؔم نے ادب اور زندگی کے مابین رشتے کو مستحکم کیا۔ مقصدی شاعری کو سماج کے لئے مختص کیا۔ ہندوستان سے محبت کا جذبہ بھی اس عہد میں پروان چڑھا۔ سلاؔم مچھلی شہری کی جشنِ آزادی، شمعِ ہندوستان، اشارہ، میں لال قلعہ کی محفل میں پھر غزل خواں ہوں اور گاندھی وغیرہ اسی قبیل کی نظمیں ہیں۔ سلاؔم چاہتے ہیں کہ حزنیہ فضا کے ساتھ ساتھ ہی جذبۂ حبُّ الوطنی اور قومی یک جہتی کو فروغ حاصل ہو۔ سماج میں جو اضطراب و انتشار ہے وہ ختم ہو جائے اور ہم آہنگی و اخوّت اور سکون و طمانیت کی فضا ہموار ہو۔ یہ سب قیمتی عوامل ہیں جن سے تہذیب و ثقافت کو تقویت حاصل ہوتی ہے۔ ان کا پیغام ملاحظہ کیجیے:

بے سبب آہوں کو بدلو، ایک سہانے راگ میں نفرتوں کی سب کتابیں پھینک دو اب آگ میں

یونی ورسٹی ، اسکول ، کالج ہر جگہ طوفان کیوں بن رہے ہو آج انساں ہو کے بھی حیوان کیوں

یہ بات مبنی بر حقیقت ہے کہ ہماری زندگی اور معاشرے کے درمیان جب تک ہم آہنگی پیدا نہیں ہوگی، ایک فرد دوسرے فرد کا کرب و غم کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرے گا۔ انسانی تہذیب کی اساس کھوکھلی رہے گی۔ سلاؔم ان باتوں کو خوب سمجھتے تھے۔ ان کی شاعری میں محض رومان کے نقوش نہیں بلکہ ترقّی پسند ہونے کے ساتھ ساتھ سچے اور مخلص انسان ہونے کے سبب تہذیبِ انسانی کی مدھم آنچ بھی ہے۔ ان کی مشہور نظمیں: خاموش رہو، سڑک بن رہی ہے، روشنی تو امر ہے، تیسری قوّت، محدود سرخیاں، تاج محل، مسافر اور میں اس طرح یہ مسئلے دیکھتا ہوں وغیرہ ہیں۔

01.10 ۱۹۳۶ء کے بعد حلقۂ اربابِ ذوق کے اہم نظم نگار شعرا

حلقۂ اربابِ ذوق کے مشہور شعرا میں ن.م.راشؔد، میراجی، ضیا جالندھری، قیوم نظؔر، یوسف ظؔفر اور مختؔار صدّیقی وغیرہ کے نام اہم ہیں۔ حلقۂ اربابِ ذوق کے شعرا میں سے یہاں صرف ن۔م۔راشؔد اور میراجی پر گفتگو ہوگی۔

﴿۱﴾ **ن.م.راشؔد:** ن۔م۔راشؔد کا پہلا مجموعۂ کلام ''ماورا'' ۱۹۴۱ء میں منظرِ عام پر آیا۔ اس مجموعے میں دس برس کا کلام موجود ہے۔ اس میں بیس سے تیس برس تک کا کلام ہے۔ یہ عمر عہدِ جوانی سے موسوم ہوتی ہے لیکن اس مجموعے کے اندر صرف عہدِ جوانی کے مسائل و تجربات ہی نہیں بلکہ گہرے مشاہدے اور ماضی کے تہذیبی نقوش بھی ہیں۔ وہ عمداً بھی ماضی کی روایات اور تہذیبی نقوش سے اپنا دامن نہیں چھڑا سکتے۔

''دریچے کے قریب'' کے حوالے سے کرشن چندر لکھتے ہیں:

''میرے خیال میں فکری وفنّی اعتبار سے ''دریچے کے قریب'' راشؔد کی بہترین نظم ہے۔شاعر اپنی محبوبہ کو صبح کے وقت اپنی خواب گاہ کے دریچے سے ایک مشرقی شہر کا نظارہ دکھاتا ہے اور ایک پرانی مسجد کے مینار کی طرف اشارہ کرتا ہے۔''

اس نظم کا ایک تاریخی وتلمیحی پس منظر ہے۔مسجد،اس کے میناروں کا ذکر اور اس کے سائے تلے ایک افلاس زدہ ملّاے حزیں کا اونگھتے رہنا ذلت آمیز اور افسردہ زندگی کا اشاریہ ہے۔راشؔد کا رویہ پھر انقلابی ہوتا ہے کہ زیرِ افلاک ظلم سہنے والوں میں کسی کے اندر اتنی توانائی نہیں کہ شعلۂ جوالہ بن سکے۔خود شاعر بھی ان لوگوں کی طرح تلاشِ معاش میں نکل پڑتا ہے اور شام ہوتے ہی پھر اسی کاشانے کی طرف لوٹ آتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ میں بھی کس قدر بے بس ومجبور ہوں کہ دریچے سے مسجد کے میناروں کو دیکھتا رہتا ہوں مگر کچھ کرنے سے قاصر ہوں۔

نظم کا منتخب حصہ ملاحظہ کیجیے:

آ مری جان! مرے پاس دریچے کے قریب
دیکھ کس پیار سے انوارِ سحر چومتے ہیں
مسجدِ شہر کے میناروں کو- اِسی مینار کے سائے تلے کچھ یاد بھی ہے
اونگھتا ہے کسی تاریک نہاں خانے میں- ایک افلاس کا مارا ہوا مُلّاے حزیں
ایک عفریت اُداس- تین سو سال کی ذِلّت کا نشان
ایسی ذِلّت کہ نہیں جس کا مداوا کوئی!- دیکھ بازار میں لوگوں کا ہجوم
ان میں مفلس بھی ہیں بیمار بھی ہیں- زیرِ افلاک مگر ظلم سہے جاتے ہیں

راشؔد کی نظموں میں اساطیری اور دیومالائی تہذیب واقدار کے نقوش نظر آتے ہیں۔اپنی نظموں کے اندر راشؔد نے جن علائم و تلمیحات کا استعمال کیا ہے ان کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد ان کی فکری اساس عیاں ہوجاتی ہے۔لیکن ان کی فکری جہتیں کہیں کہیں مزید پیچیدہ ہوگئی ہیں۔راشؔد نے معاشرہ اور معاشرے کے فرد کے کرب وغم کو اپنی شاعری کا عنوان بنایا۔انہیں سماجی واقتصادی مسائل سے بھی شغف ہے۔راشؔد زندگی کے شب وروز کا تجزیہ منطقی انداز میں کرتے ہیں۔اس کے باوجود ان کی نظموں میں قدیم روایات واقدار شامل ہوجاتی ہیں۔ شاید ان کے لاشعور کی مجبوری ہو کہ وہ اپنے ماضی اور اس کے انسلاکات اور تہذیبی وثقافتی روایات کو اپنے دامنِ فکر سے گرد کی طرح نہیں جھاڑ سکتے تھے۔

''صحرا'' اور ''ریت'' کو راشد نے اکثر مقامات پر بطورِ علامت استعمال کیا ہے۔''صحرا'' کے تعلق سے تبسم کاشمیری نے لکھا ہے کہ:

''صحرا'' عرب تہذیب کی بنیادی علامت ہے اور جس کے تصوّر کے بغیر مشرقِ وسطیٰ کا کوئی تہذیبی خاکہ مکمل نہیں ہوسکتا۔''

تبسم کاشمیری نے اس کی بھی وضاحت کردی ہے کہ راشؔد کے ماضی کا سرمایہ محض مظاہر کی حیثیت رکھتا ہے اوران کے نزدیک عرب و عجم کی تہذیب کے استعارے زندہ نہیں ہیں۔دوسری طرف اگر چاہیں تو تبسم صاحب کی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے یہ کہہ سکتے ہیں کہ علامہ اقبالؔ کے نزدیک ماضی کے آثار اپنی روایت اور ہزار سالہ تہذیب کا تسلسل معلوم ہوتے ہیں۔

''صحرا'' کے جو ذیلی تلازمات ہوسکتے ہیں اس کی ایک فہرست بھی تبسم کاشمیری نے پیش کی ہے مثلاً: ریت، پیڑ، خیمے، چشمے، اونٹ، سراب، راہ رَو، صحرانورد، کارواں، داستاں گو، جرسِ کارواں اور الاؤ وغیرہ۔'ریت' جو'صحرا' کا ذیلی تلازمہ ہے وہ راشؔد کے تہذیبی لاشعور میں ایک کمسن بچے کی طرح موجود ہے۔ریت کی خاموشی ،اس کی تابانی اور سفیدی، ان تلازمات وعلائم سے یہ اندازہ بھی ہوتا ہے کہ راشؔد کی فکر کا کینوس وسیع وعریض ہے۔راشؔد کی نظموں میں صحرائی وعجمی تہذیب ،گاؤں اور جنگل کی زندگی کا رنگ تو ملتا ہی ہے،ساتھ ہی شہری زندگی کے نقوش بھی ملتے ہیں۔انہوں نے شہر کی منافقت اور زبوں حالی پر روشنی ڈالی ہے۔ایک ایسی زندگی جہاں قرب میں اجنبیت اور دوستی میں بھی حرص وطمع کے عناصر ملتے ہیں،شہر کی شناخت ہے۔لاحاصلی، مایوسی، کرب وغم اور زوال آمادگی کے تصوّرات، راشؔد کے تصوّرِ شہر یا شہر کی تمثال سے پیدا ہوتے ہیں۔اس میں کہیں نئی زندگی اور نئے جنوں پرور تہذیبی مستقبل کی چمک صاف عیاں ہوتی ہے۔راشؔد کے نظریے کے مطابق ''دیوارِ ظلم'' اور دیوارِ رنگ'' دونوں انسانی تہذیب کے لئے مہلک ہیں۔

علامہ اقبالؔ نے بھی یہی پیغام دیا تھا:

بتانِ رنگ وخوں کو توڑ کر ملّت میں گم ہو جا
نہ تورانی رہے باقی ، نہ ایرانی، نہ افغانی

راشؔد نے بھی اسی پیغام کو اپنے منفرد انداز میں پیش کیا ہے۔انہیں تہذیبی بساط کی پاس داری کا پورا خیال ہے۔اگر غور سے دیکھیں تو راشؔد کی شاعری کا سیاق مشرقی تہذیبی افق کا اضافی رنگ ہے۔بقول پروفیسر شمیم حنفی:

''راشؔد کی شاعری ایک بڑے فکری اعتماد کے ساتھ مغرب کو بھیجا جانے والا سندیسہ بھی ہے،ایک اور پیامِ مشرق!''

راشؔد کی نظمیں دَورِ جدید کی افراتفری ،سماجی بدحالی،قومی وملی زوال ،انسانی عظمت اور تہذیبی اقدار کی شکست وریخت کا خوب صورت نظم نامہ ہیں،جن میں تغزّل کا رنگ اور شاہ نامہ فردوسؔی کا عکسِ لطیف بھی ہے۔ان کی نظموں میں صحرائی وعجمی تہذیب کے نقوش بھی ہیں۔

''نئی آگ، دل مرے صحرا،نووارد، پیر دل اور حسن کوزہ گر'' وغیرہ نظمیں ایسی ہی مثالیں پیش کرتی ہیں۔ان کی نظموں میں سماجی بد حالی اور تہذیبی اقدار کا نوحہ ملتا ہے۔ان کے اسلوبِ شاعری میں ایک طنطنہ وبے باکی اور نشاطِ کرب کا رنگ جھلکتا ہے۔اردو نظم کو انہوں نے ایک زندہ اور توانا اسلوب عطا کیا ہے۔

﴿۲﴾ میراجی: میراجی کی شاعری سے زیادہ ان کی شخصیت پُراسرار اور پُرکشش رہی ہے۔وہ حد سے زیادہ طبّاع اور حسّاس تھے۔میراجی کی فکر وسیع تناظر کی حامل تھی۔ان کی فکری جہات میں ہندوستانی تہذیب کے کئی دھارے شامل تھے۔بدھ مت، وشنومت اور پھر

ایشیائی رنگ۔ان کی نظموں میں پرانی دیومالائی تصویریں ملتی ہیں۔چوں کہ مذہبِ اسلام میں تجسیمی احساسات کی گنجائش نہیں۔اس لئے انہوں نے ایک ایسے تصوّر کو اپنایا جہاں ہر طرح کی آزادی تھی۔یہاں پروفیسر شمیم حنفی کی کتاب سے یہ اقتباس نقل کرنا قرینِ قیاس معلوم ہوتا ہے:

''اگر وہ ذاتی عقیدے (اسلام) کو اساطیری اظہار کا ذریعہ بناتے تو انہیں بہرطور اسلام سے وابستہ تہذیبی حدود کو قبول کرنا پڑتا۔اس لئے میراجی نے اجتماعی دیومالا کی طرف قدم بڑھایا.....اس لئے انہوں نے اس دیومالا کو اپنے تجربوں سے مربوط کیا جو ان کے باطنی ہیجان کی متحرک تصویر پیش کر سکے۔''

(شمیم حنفی: نئی شعری روایات، ص۶۲)

میراجی کا ماننا ہے کہ ذہنِ انسانی کو روحانی اسرار کو سمجھانے کے لئے بھی جسمانی استعارے اور سہارے کی ضرورت ہوتی ہے۔عکس کی حرکت، نامحرم، ترغیب اور دور کرو پیراہن کے بندھن جیسی نظمیں پڑھ کر بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ میراجی جنسی فعل اور اس کے متعلّقات کو ہمیشہ قدرت کی بڑی نعمت سمجھتے ہیں۔سماجی بندھنوں کے وہ مخالف تھے۔ڈاکٹر وزیر آغا نے ان کی نظموں کو ''دھرتی پوجا'' کہا ہے۔

نظم ''ترغیب'' کا یہ ٹکڑا ملاحظہ کیجیے:

رسیلے جرائم کی خوشبو-مرے ذہن میں آ رہی ہے
رسیلے جرائم کی خوشبو- مجھے حدِ ادراک سے دور لے جا رہی ہے
نگاہوں میں ہے میرے نشے کی اُلجھن
کہ چھایا ہے ترغیب کا پیرہن آج ہر اک حسیں پر
رسیلے جرائم کی خوشبو مجھے آج للچا رہی ہے
قوانینِ اخلاق کے سارے بندھن شکستہ نظر آ رہے ہیں
حسیں اور ممنوع جھرمٹ مرے دل کو پھسلا رہے ہیں۔

میراجی کا تہذیبی تناظر جنسی رجحان کے بغیر نامکمّل ہے۔یہ سچ ہے کہ دنیا کی دوسری تمام نعمتوں پر جنس کی نعمت کو فوقیت حاصل ہے مگر اس کا اس قدر کھلا اظہار اخلاقی اور تہذیبی اقدار کے منافی ہے۔بہرحال میراجی کی شاعری میں جنس ایک اہم موضوع رہا ہے۔میراجی کی شاعری میں رادھا، کرشن، برندابن، گوپیوں اور ان کے آزادانہ اختلاط کا برملا اظہار ملتا ہے۔انہوں نے اپنی نظموں میں قدیم ہندوستانی تہذیب وتمدن، روایتی اور اسطوری اقدار کو تہذیبی علامت قرار دیا ہے۔میراجی کی شاعری کی فضا بندی قدیم روایات اور اساطیری تاریخ سے مزین ہے۔

میراجی کی شاعری میں عورت کا تصوّر ایک زرخیز زمین کے مشابہ ہے۔مختلف طرح کی جنسی اُلجھنیں اور شکست وریخت کی مثالیں تشبیہ واستعارے کے ساتھ ان کی نظموں میں جلوہ گر ہیں۔دھوبی گھاٹ، ایک شام کی کہانی، دوسری عورت اور اخلاق کے نام وغیرہ نظمیں ان اُلجھنوں کی نشان دہی کرتی ہیں۔نارسائی، کٹھور، مجھے گھر یاد آتا ہے اور دور کنارہ ایسی نظمیں ہیں جن میں جنسی جذبہ، شکستِ آرزو، دوری کی اذیت، شخصی محرومی، انتظار کا غم اور تلاش وجستجو کی تپش کا بیان ہے۔میراجی نے اپنے ہم عصروں کی طرح علامتی نظمیں بھی کہی ہیں۔بادکی اڑان،

اندھا طوفان، فاختہ اور کوّا وغیرہ علامتی نظمیں سمجھی جاتی ہیں۔ اونچا مکان اور کلرک کا نغمۂ محبت ایسی نظمیں ہیں جن میں بازاری عورت کا کرب، زندگی کی مجبوریوں اور انسانی خواب کی شکست وریخت کا پراثر بیان ملتا ہے۔

میراجی کی شاعری ان کے عہد میں زیرِ بحث رہی اور ان کے ہم عصروں میں بھی۔ میراجی کے ہم عصروں میں ن۔م۔راشد سے ان کا گہرا ربط تھا۔ میراجی اور راشد میں ایک بات مشترک تھی وہ یہ کہ نظم کہیں سے بھی شروع اُسے کہیں بھی ختم کر سکتے ہیں۔ گویا ان دونوں نے آغاز وانجام کی روایتی شعری منطق سے نجات حاصل کر لی تھی حالاں کہ راشد کا شعری جغرافیہ عرب وعجم کے ساتھ ساتھ پورا مشرقِ وسطیٰ ہے جب کہ میراجی کے یہاں جنگل کی تہذیب کا اور برندابن کی شانتی کا پرتو ہے۔ راشد اسلامی تاریخ کا منظرنامہ تو میراجی مندروں اور گھاٹوں کی منظر کشی پیش کرتے ہیں۔ تاہم میراجی کی شخصیت سے ن۔م۔راشد دور دور تک متاثر نظر آتے ہیں۔

میراجی کے شاعرانہ مقام کی تعریف کرتے ہوئے ن۔م۔راشد نے لکھا ہے:

''میری رائے میں میراجی ہمارے زمانے کے سب سے زیادہ قابلِ ذکر شاعر ہیں۔ سب سے زیادہ جدّت پرست، سب سے زیادہ زرخیز ذہن کے مالک سب سے منفرد اور سب سے زیادہ بدنام۔''

میراجی تمام تر ابہام وپیچیدگی کے باوجود تجربے اور اظہار کے لئے اردو شاعری میں ایک منفرد شناخت رکھتے ہیں۔ دیومالائی تہذیب اور ہندومت سے گہری وابستگی نے ان کی نظموں پر کئی طرح کی پرتیں ڈال دی ہیں، ساتھ ہی مغربی وسنسکرت ادب کے مطالعے، فرائیڈ اور دوسرے ماہرینِ نفسیات کے افکار نے ان کی سوچ میں توانائی کے ساتھ ساتھ روایت سے بغاوت کا بیج بھی ڈال دیا۔ میراجی اپنا مضمون، ڈکشن، فکر اور اظہار لے کر اردو شاعری میں وارد ہوئے تھے جو ان کے ساتھ ہی رخصت ہو گیا مگر اردو ادب پر ان کی اَن مٹ چھاپ باقی رہ گئی۔

01.11 ۱۹۶۰ء کے بعد اردو نظم نگاری

۱۹۵۵ء کے بعد اردو نظم نگاری میں ایک طرح کی تبدیلی پیدا ہوئی جس میں کلاسیکی یا روایتی طرزِ ادا یا ترقّی پسند تحریک کا موضوعاتی اصرار نہیں ملتا۔ یہ جدیدیت کا دَور ہے۔ بندھا ٹکا نظریہ یا اجتماعی تحریک یا طے شدہ اُسلوب اس نئی نظم کی شناخت نہیں۔ اس نے نئے طرزِ ادا اور گدازانہ طور پر نئی ہیئتوں کو جنم دیا۔ ترقّی پسند تحریک کا سارا زور سماجی سروکار اور اجتماعی فکر پر تھا۔ حلقۂ اربابِ ذوق نے ہیئت اور اسلوب کی پابندی پر زور دیا۔ ۱۹۶۰ء کے بعد نظموں میں رنگارنگی اور تہ داری ملتی ہے، پابند، معرّیٰ یا آزاد ہیئتوں کی قید یہاں نہیں رہ گئی۔

اس نئی نظم میں فن کاروں کو پوری آزادی ملی ہے اور ہر لحاظ سے اردو نظم کو فروغ حاصل ہوا ہے۔ نئے طرزِ احساس اور نئی حسّیت نے نئی فضا بندی کی ہے۔ چند اہم نظم نگار شاعروں کے نام اس طرح ہیں: منیب الرّحمٰن، بلراج کومل، مغنّی تبسّم، شفیق فاطمی شعری، عمیق حنفی، فہمیدہ ریاض، شہاب جعفری، زبیر رضوی، محمّد علوی، شہریار، کمار پاشی، احمد ہمیش، ندا فاضلی، کشور ناہید اور مظہر امام وغیرہ۔

اس جدید نظم کے بارے میں مشہور ادیب وناقد شمس الرّحمٰن فاروقی لکھتے ہیں:

''داخلی اور معنوی حیثیت سے میں اس شاعری کو ''جدید'' سمجھتا ہوں جو ہمارے دَور کے احساسِ جرم، خوف، تنہائی، کیفیتِ انتشار اور اس ذہنی بے چینی کا کسی نہ کسی نہج سے اظہار کرتی ہو۔''

(لفظ ومعنی: فاروقی، ۱۹۶۸ء، ص۔۱۲۶)

01.12 خلاصہ

اس اکائی میں آپ نے نظم کی تعریف اور اس کا تاریخی ارتقا ملاحظہ کیا جس کے تحت نظم نگاری کی ابتدا دکن وشمال میں ہوئی۔ ۱۸۵۷ء کے بعد اُردو نظم اور نظمِ جدید کا آغاز وغیرہ کے بارے میں جانا اور ۱۹۳۶ء سے قبل کی نظم نگاری اور اس کے اہم نظم نگار شعرا اور پھر اس کے بعد ترقّی پسند تحریک اور حلقۂ اربابِ ذوق کے اہم نظم نگار شعرا کو اپنے مطالعے کا موضوع بنایا۔ ان تینوں حصوں (۱۹۳۶ء، ترقی پسند تحریک اور حلقۂ اربابِ ذوق) کے زیرِ اثر آنے والے تقریباً پندرہ شعرا کے بارے میں جان کر آپ کی معلومات میں یقیناً اضافہ ہوا ہوگا اور ان شعرا کی نظم نگاری کی خصوصیات سے بھی آپ واقف ہوئے ہوں گے۔ ۱۹۵۵ء کے بعد اردو نظم نگاری کے بارے میں اجمالاً تبصرہ کیا گیا ہے اور اس کے اہم نظم نگار شعرا کے اسمائے گرامی بھی ذکر کیے گئے ہیں۔

01.13 فرہنگ

آغاز	: شروعات، پہل	حب الوطنی	: وطن سے محبت، دیش بھکتی
ابتذال پسندی	: ذلیل، تذلیل، بے ہودگی	شناخت	: پہچان
اجمالاً	: مختصر	گہوارہ	: پالنا، گود
ارتقا	: ترقی	ممیّز	: امتیاز کرنے والا
انتشار	: بکھرنا، ٹوٹنا	نظم نگار	: نظمیں کہنے والا
بہیمانہ	: جانوروں کے جیسے	نہج	: طریقہ

01.14 سوالات

مختصر سوالات

سوال نمبر۱ : ۱۹۳۶ء سے قبل کے نظم نگار شعرا پر مختصراً تبصرہ کیجیے؟

سوال نمبر۲ : نظمِ جدید کے آغاز کے بارے میں اظہارِ خیال کیجیے؟

سوال نمبر۳ : نظم کی تعریف کرتے ہوئے دکن میں نظم نگاری کے بارے میں مختصراً لکھیے؟

تفصیلی سوالات

سوال نمبر۱ : ترقّی پسند تحریک کے کسی ایک شاعر پر مضمون لکھیے۔

سوال نمبر۲ : ترقّی پسند تحریک کے اہم شعرا پر تبصرہ کیجیے؟

سوال نمبر۳ : حلقۂ اربابِ ذوق کے کسی ایک شاعر کی نظم کی خصوصیات بتائیے؟

01.15 حوالہ جاتی کتب

۱۔ اردو شاعری کا مزاج از وزیر آغا

۲۔ اردو میں ترقّی پسند ادبی تحریک از خلیل الرّحمٰن اعظمی

۳۔ حلقۂ اربابِ ذوق از یونس جاوید

۴۔ اردو شاعری کا فنّی ارتقا از ڈاکٹر فرمان فتح پوری

۵۔ جدید نظم: حالی سے میرا جی تک از کوثر مظہری

۶۔ نئی نظم اک سفر از کتاب نما (خاص نمبر)

اکائی 02 : نظیرؔ اکبرآبادی ''آدمی نامہ''

ساخت :

02.01 : اغراض ومقاصد

02.02 : تمہید

02.03 : نظیرؔ اکبرآبادی کی شخصیت

02.04 : نظیرؔ اکبرآبادی کے حالاتِ زندگی

02.05 : نظیرؔ اکبرآبادی کی شاعری

02.06 : نظیرؔ اکبرآبادی کی نظم نگاری

02.07 : نظم ''آدمی نامہ'' متن

02.08 : نظم ''آدمی نامہ'' تجزیہ

02.09 : خلاصہ

02.10 : فرہنگ

02.11 : سوالات

02.12 : حوالہ جاتی کتب

02.01 اغراض ومقاصد

اس اکائی کے مطالعے سے آپ نظیرؔ اکبرآبادی کے حالاتِ زندگی اوران کی نظم نگاری میں انفرادیت کے بارے میں جانیں گے۔ اس اکائی میں ان کی مشہورنظم ''آدمی نامہ'' کامتن،اس کا تجزیہ اورآخر میں سبق کا خلاصہ پیش کیا جائے گا۔ایک فرہنگ بھی دی جائے گی جس کے ذریعے آپ مشکل الفاظ کے معنی سمجھ سکیں گے۔اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ سے توقع کی جاتی ہے کہ آپ نظیرؔ اکبرآبادی کی زندگی کی مختلف جہات اوران کی شاعرانہ فنّی و جمالیاتی خصوصیات سے بخوبی واقف ہوجائیں گے۔

02.02 تمہید

اُردو نظم نگاری کے میدان میں نظیرؔ اکبرآبادی ایک قدآور شخصیت کے مالک ہیں۔ان کا قد اردو نظم نگاری میں اتنا اونچا ہے کہ وہ اردو نظم نگاری کے امام کہلانے کے مستحق ہیں۔نظیرؔ ہی وہ پہلے شاعر ہیں جنھوں نے شاعری کا رشتہ براہِ راست عوام اور سماج سے جوڑا۔نظیرؔ ہی نے نظم کو بحیثیتِ نظم استعمال کیا اوراس کو بلندیاں بخشیں۔ان سے پہلے اردو شاعری میں صرف نظم کے نشانات نظر آتے ہیں،نظم کا وجود نہیں۔بعد میں آنے والے تمام نظم نگار حالیؔ،آزادؔ،اقبالؔ،فیضؔ اور فراقؔ وغیرہ نے اُنہی کے جلائے ہوئے چراغ کی روشنی میں نظم نگاری کو آگے بڑھایا۔

02.03 نظیر اکبرآبادی کی شخصیت

نظیر ایک مختلف الجہات، متنوع، آزاد اور قلندرانہ شخصیت کے مالک تھے۔ قومیت اور وطنیت ان کی ذات میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ وہ اگر چہ امامیہ مذہب کے ماننے والے تھے لیکن تنگ نظر و تنگ ذہن نہیں تھے اور تعصّب سے پاک تھے۔ وہ ہر انسان سے بلا امتیازِ مذہب و ملّت محبت کرتے تھے۔ انسان تو انسان وہ جانوروں سے بھی بلا مشروط محبت کرتے تھے جیسا کہ ان کے کلام سے ظاہر ہے۔ نظیر کی شخصیت کو مزید بیان کرنے کے لئے پروفیسر محمد نعمان خاں کا یہ اقتباس بہت اہم ہے:

''نظیر اکبرآبادی البیلی شخصیت اور ہمہ جہت صفات کے مالک تھے۔ ان کے کلام کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ محض ایک فطرت شناس اور قادرالکلام شاعر ہی نہ تھے بلکہ وہ اپنے عہد کے سچّے مؤرّخ، سماجی مبصر، واقعہ نویس، مرقّع نگار، طنز و مزاح نگار، نفسیات و عمرانیات ولسانیات کے ماہر اور ایک وسیع المعلومات انسان تھے۔ تخلیقی صلاحیتیں انہیں فطرت کی جانب سے ودیعت ہوئی تھیں۔''

(اُردو شاعری میں نظیر اکبرآبادی کی انفرادیت واہمیت، اردو دنیا، اکتوبر ۲۰۱۶ء)

02.04 نظیر اکبرآبادی کے حالاتِ زندگی

نظیر کا پورا نام شیخ ولی محمد تھا۔ دنیائے شاعری میں نظیر اکبرآبادی کے نام سے مقبول ہوئے۔ نظیر کے حالاتِ زندگی تفصیل سے تو معلوم نہیں، البتہ اتنا معلوم ہے کہ جب سلطنتِ مغلیہ زوال پذیر تھی۔ نادرشاہ اور احمد شاہ ابدالی کے حملوں نے ہندوستانی سلطنت کی اینٹ سے اینٹ بجادی تھی۔ اس وقت ۱۷۳۵ء مطابق ۱۱۴۷ھ میں نظیر کی دِلّی میں پیدائش ہوئی۔ ۱۷۵۷ء میں نظیر اپنی ماں اور نانی کے ساتھ آگرہ چلے گئے، جہاں تاج گنج میں سکونت پذیر ہوئے اور پھر تادمِ مرگ آگرہ ہی کے ہو کر رہے۔ خود کہتے ہیں:۔

عاشق کہو، اسیر کہو، آگرے کا ہے مُلّا کہو، دبیر کہو، آگرے کا ہے
مفلس کہو، فقیر کہو، آگرے کا ہے شاعر کہو، نظیر کہو، آگرے کا ہے

نظیر اکبرآبادی کے والد کا نام شیخ محمد فاروق تھا۔ شیخ دلّی کے باسی تھے اور معمولی پڑھے لکھے تھے۔ نظیر کی والدہ آگرہ کے قلعہ دار نواب سلطان خاں کی بیٹی تھیں۔ مخمور سعیدی عبدالغفور شہباز کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ ان کے یہاں دو اولادیں ہوئیں لیکن دونوں ہی فوت ہوگئیں۔ نظیر ان کی آخری اولاد تھے۔ کہتے ہیں نظیر کی ولادت سے قبل کسی درویش نے ان کی درازیِ عمر کی بشارت دی تھی جو کہ صحیح ثابت ہوئی۔ نظیر نے تعلیم تو حاصل نہیں کی، البتہ رواج کے مطابق عربی و فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ گزر بسر کے لئے محلے کے بچوں کو تعلیم دیتے تھے بعد میں متھرا میں قلعہ دار کے استاد مقرر ہوئے۔ متھرا سے واپس آنے کے بعد محمد علی خاں کے بچوں کو تعلیم دینے لگے۔ کچھ عرصے رائے کھتری کے بچوں کو بھی پڑھایا۔ اخیر عمر میں کاشی کے راجہ بلوان سنگھ کی سرکار سے وابستہ ہوگئے۔ نظیر نے فنِ سپہ گری میں بھی کمال حاصل کیا۔ اس کے علاوہ وہ کبوتر بازی، مرغ بازی، کشتی، تلوار چلانے اور پنجہ لڑانے میں بھی مہارت رکھتے تھے۔ نظیر کو عربی، فارسی، پنجابی، ہندی، برج، کھڑی و سنسکرت پر بھی غیر معمولی عبور حاصل تھا جس کا اندازہ ان کی شاعری سے بخوبی ہوتا ہے۔ وہ زبان کے عوامی اور فصیح لب و لہجے سے بخوبی واقف تھے۔ نظیر کے والد سنی مذہب کے پیروکار تھے جب کہ نظیر امامیہ مذہب کے متبع تھے۔ عبادتوں کے معمولی پابند تھے البتہ تعزیہ داری بڑے اہتمام سے

کرتے تھے۔نظیر کی ازدواجی زندگی کے تعلق سے مفتی انتظام اللہ شہابی اپنے مضمون ''نظیر کی مختصر سوانح'' میں لکھتے ہیں کہ نظیر کی شادی ادھیڑ عمر میں تہورالنسا نامی ایک عورت سے ہوئی جو کہ محمد رحمان خاں چغتائی کی بیٹی تھیں۔محمد رحمان خاں چغتائی نظیر کے ہم محلّہ تھے۔نظیر کی دو اولادیں ہیں ایک بیٹا گلزار علی اور بیٹی امانی بیگم۔نظیر اکبرآبادی کا انتقال تین سال تک فالج کے مرض میں مبتلا رہنے کے بعد ۱۸۳۰ء مطابق ۱۲۴۶ھ میں ہوا۔شمسی کلینڈر کے مطابق انتقال کے وقت ان کی عمر ۹۵ سال اور قمری کلینڈر کے اعتبار سے ۹۹ برس تھی۔

02.05 نظیر اکبرآبادی کی شاعری

جیسا کہ عام طور پر ہوتا ہے کہ ہر شاعر و ادیب اپنے ماحول کا پروردہ ہوتا ہے اور اس کی تخلیقات پر اس کے ماحول کا گہرا اثر ہوتا ہے۔ ٹھیک ویسے ہی نظیر کی شاعری بھی اپنے ماحول کی پروردہ ہے۔ان کی شاعری ان کے دَور بلکہ اپنے ماقبل اور مابعد کی بھی آئینہ دار ہے۔نظیر نے جو تخلیقات اردو ادب کو عطا کیں وہ ان کے مطالعۂ کائنات اور مطالعۂ زندگی کا نتیجہ ہیں۔انہوں نے کسی رسمی کتاب سے زیادہ کتابِ زندگی اور کتابِ کائنات کو اہمیت دی۔یہی وجہ ہے کہ ان کی تخلیقات میں زندگی کا گہرا شعور ملتا ہے اور کائنات کا عمیق مشاہدہ بھی۔نظیر نے شاعری میں ہر طرح کے موضوعات کو برتا ہے۔نظیر نے اپنی شاعری میں جہاں عوام کے متعلقات کا ذکر کیا ہے وہیں خواص کا بھی زور وشور کے ساتھ تذکرہ کیا ہے۔عوام وخواص سے متعلق ہر موضوع پر نظیر نے اپنی بیش بہا تخلیقات اردو ادب کو دی ہیں۔نظیر نے اپنی شاعری میں عروض، قافیہ اور ردیف کی پابندیوں کو بھی برتا ہے۔انہوں نے فن کے لحاظ سے اپنی شاعری میں ان تمام اصولوں کی رعایت کی ہے جو ان کے دور میں مروّج تھے۔نظیر نے اپنی شاعری کے لئے مثلث، مربع، مخمس اور مسدس وغیرہ کی ہیئتیں استعمال کی ہیں جن میں وزن، بحر، اور قافیہ وردیف کی بھی پابندی ہے۔

﴿نظیر کی غزل گوئی﴾: نظیر کی شہرت اگرچہ ان کی نظموں کی بنیاد پر ہے لیکن انہوں نے غزلیں بھی کہی ہیں مگر ان کی غزلیں اس پایے کی نہیں ہیں جس پایے کی ان کی نظمیں ہیں اور نہ ہی ان کی غزلوں کو مقبولیت نصیب ہوئی۔نظیر نے غزل میں عام طور پر وہی باتیں ذکر کی ہیں جو غزل کے میدان میں عام طور پر مستعمل ہیں۔حُسن وعشق، ناز وادا، دل لگی ودل فریبی اور اس کے برعکس تصوّف، وحدت الوجود، دنیا کی بے ثباتی وغیرہ ان کی غزلوں کے موضوعات ہیں۔ان کی اکثر غزلیں غزلِ مسلسل کا درجہ رکھتی ہیں۔مثلاً:

سحر جو نکلا میں اپنے گھر سے تو دیکھا اک شوخ حسن والا
جھلک وہ مکھڑے میں اُس صنم کے کہ جیسے سورج میں ہو اُجالا
لبوں پہ سرخی وہ پان کی کچھ کہ لعل بھی منفعل ہو جس سے
وہ آن ہنسنے کی بھی پھر ایسی کہ جس کا عالم ہی کچھ نرالا
وہ جامہ زیبی، وہ دل فریبی، وہ سج دھج اُس کی، وہ قدِ زیبا
کہ دیکھ جس پر فدا ہوں دل سے وہ جن کو کہتے ہیں سرو بالا
جو لے لیا دل کو میرے یارو! تو اُس نے لی راہ اپنے گھر کی
پڑا تڑپتا میں رہ گیا واں، زباں پہ آہ اور لبوں پہ نالا

بہت یہ میں نے تو چاہا پوچھوں میں نام اُس کا، و لے وہ گل رُو
نہ مجھ سے بولا ، نہ کی اشارت ، نہ دی تسلّی ، نہ کچھ سنبھالا
کبھی تو ہنس کر شتاب آ جا نظیر کی بھی طرف ٹک اے جاں
بنا کے سج دھج ، پھرا کے دامن ، لگا کے ٹھوکر، ہلا کے بالا

02.06 نظیر اکبرآبادی کی نظم نگاری

جس طرح نظیر ایک مختلف الجہات شخصیات کے مالک تھے اسی طرح انہوں نے مختلف موضوعات پر مختلف طریقے سے نظمیں کہیں۔ نظیر اپنی نظموں کے لئے مواد کہیں سے بھی حاصل کر لیتے ہیں۔ وہ حسّاس اور سنجیدہ طبیعت کے مالک ہیں۔ نظیر تو ہر شَے اور ہر جگہ سے کارآمد موضوعات تلاش کر لینے میں ماہر ہیں۔ ان کی نظموں کے عناصر مندرجہ ذیل ہیں:

﴿۱﴾ ہندوستانیت ﴿۲﴾ عوامیت ﴿۳﴾ قومی یک جہتی اور مذہبی رواداری
﴿۴﴾ جزئیات نگاری ﴿۵﴾ مظاہرِ قدرت کی تصویر کشی ﴿۶﴾ رجائیت
﴿۷﴾ حیاتِ انسانی کے مختلف مدارج ﴿۸﴾ حکیمانہ، فلسفیانہ اور صوفیانہ خیالات

﴿۱﴾ ہندوستانیت: محمد ذاکر لکھتے ہیں نظیر ہندوستان کی گنگا جمنی معاشرت کے تیکھے اردو شاعر ہیں۔ مزید لکھتے ہیں کہ ہندوستان اور ہندوستانیت نظیر کی شاعری کا جوہرِ اعظم ہیں۔ نظیر سے پہلے اردو شاعری اُنہی موضوعات و مضامین کا مجموعہ تھی جو کہ فارسی میں نظم ہو چکے تھے یا جن کی فطرت فارسی تھی۔ نظیر وہ پہلے شاعر ہیں جنہوں نے اردو شاعری کو فارسی کے دامن سے آزاد کیا۔ جیحون اور سیحون کی جگہ گنگا جمنا کی بات، لیلیٰ و شیریں کی جگہ رادھا و دَمینتی کو شاعری کا لباس پہنایا۔ نظیر کو ہند کے ذرّے ذرّے سے بے انتہا و بے پناہ محبت ہے۔ ان کی محبت کا یہ عالم ہے کہ وہ یہاں کے کیڑے مکوڑے، گبریلے، کنکھجورے، کن سلائیاں، بھورے، مکھی، مچھر، پسو اور کھٹمل وغیرہ سے بھی محبت کرتے ہیں اور ان کا ذکر اپنی نظموں میں بڑے شوق کے ساتھ کرتے ہیں۔ مجنوں گورکھپوری لکھتے ہیں:

> ''نظیر خالص ہندوستانی شاعر تھے۔ ہندوستان کی زندگی اور ہندوستان کے رسوم و روایات ان کی شاعری کے لازمی عناصر ہیں۔ وہ اپنے گردوپیش کی زندگی کے عام سے عام واقعات کے ساتھ سچّی موانست رکھتے ہیں اور اُنہی سے اپنی شاعری کے لئے مواد حاصل کرتے ہیں۔ نظیر اردو کے پہلے شاعر ہیں کہ جن کے کلام کو پڑھ کر ہندوستان کے حالات اور عام معاشرت اور یہاں کے رسم و رواج کے متعلق معلومات حاصل کی جاسکتی ہیں۔''
>
> (نظیر اکبرآبادی کی نظم نگاری)

نظیر کی وطن پرستی اور حُبُّ الوطنی کا اندازہ ان کی نظم ''اکبرآباد'' کے درج ذیل بندوں سے بہ آسانی لگایا جاسکتا ہے:

باغات پُر بہار ، عمارات پُر نگار بازار وہ کہ جس پہ چمن دل سے ہو نثار
محبوب ، دل فریب ، گل اَندام ، گل عذار گلیاں کہیں ہیں آپ کو گلزارِ پُر بہار
کوچے کہیں ہیں اپنے تئیں صحنِ گلستاں

بحرِ چمن کو دیکھو تو جیسے چمن کی نہر لاکھوں بہاریں رکھتی ہے ایک ایک جس کی لہر
کوئی نہاوے اور کوئی منہ دھووے شاد بہر اُس پر ہجوم رکھتے ہیں یوں ساکنانِ شہر
شمشاد، سرو ہوتے ہیں جوں نہر پر عیاں

نظیر نے شری کرشن پر کافی نظمیں لکھی ہیں۔شری کرشن خالص ہندوستانی موضوع ہے۔صرف ایک بند نظیر کی نظم سے جوانہوں نے کرشن جی کے بچپن پر لکھی ہے۔نظیر نے ہندوستانیت کوسورج کی طرح روشن کردیا ہے۔

تھے گھر جو گوالنوں کے لگے گھر سے جا بجا جس گھر کو خالی دیکھا اُسی گھر میں جا پھرا
ماکھن ، ملائی ، دودھ ، جو پایا سو کھا لیا کچھ کھایا ، کچھ خراب کیا ، کچھ گرا دیا
ایسا تھا بانسری کے بجیّا کا بالپن
کیا کیا کہوں میں کشن کنھیّا کا بالپن

﴿۲﴾**عوامیت**:نظیر سے پہلے شاعری کا تعلق نواب،اُمرااور سلطنت سے تھا۔نظیر وہ پہلے شاعر ہیں جنہوں نے شاعری کا رشتہ براہِ راست عوام سے جوڑا۔انہوں نے اپنی شاعری کی بنیادعوامیت پر رکھی اور بڑی شدّ ومد کے ساتھ اپنی شاعری میں عوام کی جیتی جاگتی تصویریں پیش کیں۔انہوں نے باقاعدہ عوامی موضوعات پر نظمیں کہیں۔مجنوں گورکھ پوری نظیر کی عوامی شاعری کا اعتراف اِن الفاظ میں کرتے ہیں:

''نظیر ہندوستان کے شاعر تھے اور ہندوستان کی جمہوری زندگی کو انہوں نے اپنی شاعری کا موضوع بنایااورلب ولہجہ عوام سے ہم سطح رکھا، یہاں تک کہ ان کی شاعری کو عامیانہ اور بازاری سمجھا جانے لگا لیکن ان کا نفس اوران کا ضمیر سماج کا ضمیر تھا جس کو ایسے اعتراضات کی پروا نہ تھی۔انہوں نے کہیں کھلے الفاظ میں کہا نہیں ہے مگران کا انداز بتاتا ہے کہ وہ شاعری کو جمہوری زندگی کا آئینہ سمجھتے تھے۔شاعر کو کوئی حق نہیں کہ وہ خلق اللہ کی زندگی سے بے گانگی برتے اوراپنے کوان سے علاحدہ اور برگزیدہ سمجھے اورحقیقت یہ ہے کہ جوشاعراپنے کوایک مخصوص اور برگزیدہ حلقے یا طبقے کی چیز سمجھتا ہےاورعوام کی زندگی کو قابلِ اعتنانہیں سمجھتا، وہ معاشرت اور سماج کا مجرم ہے۔''

(نگار،نظیرنمبر جنوری ۱۹۴۰ء)

وحیدالدین سلیم نے بھی نظیر کی عوام پسندی کوسراہا ہے، لکھتے ہیں:

''نظیراکبرآبادی نے عام لوگوں کے میلوں ٹھیلوں اور ان کے حالات وخیالات اورمشاغلِ زندگی میں ایسی سچّی اورصحیح تصویریں کھینچی ہیں کہ کوئی شاعراس کا مقابلہ اس باب میں نہیں کرسکتا۔''

غرض یہ کہ ہندوستانی عوام کی مجموعی شخصیت کا نام نظیراکبرآبادی ہے۔ایک ایسی شخصیت جس میں ہم جمہوری اقدار کو مدِنظر رکھتے ہوئے اپنا مستقبل دیکھ سکتے ہیں اور ماضی کا خود سے رشتہ بھی جوڑ سکتے ہیں۔انہوں نے عوام اوران کے متعلقات کو ہر طریقے سے اپنی نظموں میں جگہ دی ہے۔نظم ''شہرآشوب'' میں مفلسی کی یوں منظرکشی کرتے ہیں:

بے روزگاری نے یہ دکھائی ہے مفلسی کوٹھے کی چھت نہیں ہے یہ چھائی ہے مفلسی
دیوار و دَر کے بیچ سمائی ہے مفلسی ہر گھر میں اِس طرح سے پھر آئی ہے مفلسی
پانی کا ٹوٹ جاوے ہے جوں ایک بار بند

﴿۳﴾قومی یک جہتی اور مذہبی رواداری: نظیر اردو کے واحد شاعر ہیں جو حقیقتاً جمہوری اور عوامی شاعر کہلانے کے لائق ہیں۔ انہوں نے وطن کی ہر چھوٹی بڑی چیز کو قابلِ توجہ سمجھا۔ اپنے وطن کے رسم ورواج، مذہبی عقائد ورسومات، تیوہار، تقریبات، یہاں کے موسم، کوہ، دریا اور صحرا و چمن کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔ اسی کی بدولت انہوں نے عوام وخواص میں اپنی جگہ بنائی۔ معاشرت و ماحول کی صحیح ترجمانی کر کے لوگوں کے دلوں میں انسانیت کا احترام وجذبہ پیدا کیا اور اخوّت ومحبت کی فضا پیدا کی۔ ان کی بیش تر نظمیں قومی یک جہتی، مذہبی رواداری اور بے تعصبی کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔ اکبر آباد (نظیر کا وطن) قومی یک جہتی اور مذہبی رواداری کا مرکز رہا ہے۔ قومی یک جہتی کا نعرہ اکبر نے اِسی زمین سے بلند کیا تھا۔ کرشن بھکتی تحریک نے متھرا اور آگرے (اکبر آباد) کو بہت اہمیت دی۔ برج بھاشا میں لطافت ومٹھاس بھی اِسی دیار میں آئی۔ سورداس کے پَد اور میرابائی کے بھجن بھی اِسی دھرتی پر گونجے۔ تاج محل، موتی مسجد اور سیکری کی عمارتیں اِسی علاقے میں تعمیر ہوئیں اور ماہرینِ موسیقی نے بھی اپنے راگوں کو اِسی سرزمین پر جنم دیا۔ ایسے ہی ماحول اور علاقے میں نظیر کی تعلیم وتربیت ہوئی۔ اسی لئے انہوں نے اپنی شاعری کے ذریعے میل محبت اور اتحاد واتفاق کے راگ گائے۔ نظیر ذات پات، رنگ ونسل اور مذہب وملّت کے اختلاف کو مہمل گردانتے ہیں۔ ان کے یہاں صرف انسانیت ہے اور انسانیت کا احترام۔ اس کی بہترین مثال ان کی نظم ''آدمی نامہ'' ہے جو کہ انسانی، آفاقی اور اخلاقی اقدار پر مشتمل ہے۔ مذہبی رواداری اور قومی یک جہتی پر مشتمل ان کی نظموں میں آدمی نامہ، بلدیو جی کا میلہ، ہولی، دیوالی، عیدالفطر، گرونانک اور شبِ برات قابلِ ذکر ہیں۔

مذہبی رواداری کے تعلّق سے یہ بند بھی قابلِ ذکر ہے:

جھگڑا نہ کرے ملت و مذہب کا کوئی یاں جس راہ میں جو آن پڑے خوش رہے ہر آں
زُنّار گلے یا کہ بغل بیچ ہو قرآں عاشق تو قلندر ہیں نہ ہندو نہ مسلماں
نہ رند نہ عابد نہ مے آشام رہے گا
آخر وہی اللہ کا اک نام رہے گا

﴿۴﴾ جزئیات نگاری: نظیر کے کلام کا سب سے نمایاں وصف جزئیات نگاری ہے۔ ہر موضوع پر انہوں نے تفصیل سے لکھا ہے اور موضوع کو پوری طرح سے اُبھارنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ جزئیات نگاری نظیر کے سارے کلام کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ جن چیزوں کو دوسرے شعرا سطحی سمجھ کر نظر انداز کر دیتے ہیں نظیر ایسی ہی چیزوں کو اہم سمجھ کر ان کا تفصیل سے بیان کرتے ہیں۔ نظیر کی ہر نظم جزئیات نگاری کے لحاظ واعتبار سے رواں دریا ہے۔ نظم ''بھونچال'' کا ایک بند، جس میں تاریخ، سن، ماہ، دن غرض کسی بھی جز کو نظر انداز نہیں کیا ہے، ذیل کا بند اس کی مکمل عکاسی کرتا ہے:

سن بارہ سو اٹھارہ میں یہ واردات تھی اوّل جمادی بارہویں تاریخ سات تھی
دن بدھ کا جمعرات کی وہ آدھی رات تھی بھونچال کیا تھا قدرتِ خالق کی بات تھی
دریا و کوہ و شہر و بیاباں ہلا دیا
اک آن میں ہلا دیا اور پھر تھما دیا

آثر لکھنوی لکھتے ہیں:

''نظیر کی بیش تر نظمیں ایسی ہیں جن میں معمولی اور روزمرّہ پیش آنے والے واقعات کو شاعر کی فن کاری نے صناعت کا بہترین مرقع بنا دیا ہے۔ جس عنوان پر قلم اُٹھایا ہے اس خوبی اور تفصیل سے بیان کیا ہے کہ تصویر پیشِ نظر ہو جاتی ہے۔''

﴿۵﴾ مظاہرِ قدرت کی تصویر کشی: دراصل تصویر کشی دو قسم کی ہوتی ہے۔ ایک تو قلم کی حرکت سے کاغذ پر کوئی تصویر بنانا اور دوسری شاعرانہ مصوری یعنی لفظوں کے ذریعے کسی منظر کی تصویر کھینچ دینا۔ شبلی نے آخر الذّکر ہی کو محاکات کا نام دیا ہے۔ ارسطو اور شبلی کے نزدیک محاکات شاعری کا اہم جز ہے۔ شاعرانہ تصویر کشی ہی شاعری کا اہم جز ہے جس کے بغیر اعلیٰ شاعری کا وجود تقریباً ناممکن ہے۔ نظیر اکبر آبادی کی شاعری اس خصوصیت سے خالی نہیں بلکہ انہوں نے اپنی نظموں میں جس شے کی بھی تصویر کشی کی اس کا حق ادا کر دیا۔ سلیم جعفر لکھتے ہیں:

''نظیر مصور ہیں، تصویر کھینچتے ہیں، جس موضوع پر ہاتھ ڈالتے ہیں اسے اس حد تک بیان کرنا اور دکھانا چاہتے ہیں کہ ایک پوری کی پوری تصویر آنکھوں میں پھر جائے۔''

(نظیر اکبر آبادی کی نظم نگاری)

نظیر کی تصویر کشی کے حوالے سے مخمور اکبر آبادی رقم طراز ہیں:

''مصوّرانہ قدرت بھی ان کے کلام میں پوری قوّت کے ساتھ جلوہ آرا ہے۔ وہ بہت سے اشعار سے وہی شگفتہ اثر پیدا کرتے ہیں جو نقّاش یا قلم کار اپنے قلم کی اعلیٰ جدّت طرازی سے پیدا کر دیتا ہے۔ ''میاں نظیر'' اگر شاعر نہ ہوتے تو بہت ممکن تھا کہ چوٹی کے نقاش ہوتے۔''

(مخمور اکبر آبادی: نظیر نامہ)

نظیر کی نظم 'چاندنی'' کے دو بند ملاحظہ ہوں جو کہ ان کے بلند پایہ مصوّر ہونے کی دلیل ہیں جن میں نظیر نے تصویر کشی کا حق ادا کر دیا ہے:

جس دَم چمن میں چاند کی ہوں خوش جمالیاں اور جھومتی ہوں باغ میں پھولوں کی ڈالیاں
بہتی ہوں مَے کے جوش سے عشرت کی نالیاں کانوں میں نازنیں کے جھمکتی ہوں بالیاں
عیش و طرب کی دھوم، نشوں کی بحالیاں
جب چاندنی کی دیکھیے راتیں اُجالیاں

ایسے ہی چاندنی سی بنائے وہ سب پھبن چمپا ، کلی ، جڑاؤ ، وہ ہیرے کا نورتن
گہنے سے چاندنی کے جھمکتا ہو گل بدن اور چاند کی جھلک سے وہ گورا سا اس کا تن
دکھلا رہا ہو کرتی و انگیاں کی جالیاں
جب چاندنی کی دیکھیے راتیں اُجالیاں

﴿۶﴾ **رجائیت:** رجائیت آس واُمید کا فلسفہ ہے جو انسان کو قنوطیت سے بچاتا ہے اور قنوطیت نام ہے یاس و ناامیدی کا۔ رجائیت ایک مثبت جذبۂ حیات ہے جب کہ قنوطیت ایک منفی۔ رجائیت نام ہے ہر شئے میں خیر اور اچھائی کے پہلو دیکھنے کا اور منفی پہلوؤں سے مغلوب نہ ہونے کا۔ نظیرؔ کی شاعری میں جہاں قومی یک جہتی، وطن پرستی، جزئیات نگاری اور فطرت کی تصویر کشی پائی جاتی ہے وہیں ان کی شاعری میں رجائیت پسندی بھی ہے۔ وہ رجائیت پسند ہیں اور ہر شئے میں اچھائی کا پہلو تلاش کرتے ہیں۔ ان کے یہاں زندگی ایک باوقار و پائیدار حقیقت ہے اور وہ زندگی کو منفیات کی نذر نہیں کرنا چاہتے۔ ان کی رجائیت پسندی تمام نقّادوں کے یہاں مُسلّم ہے۔ مخمور اکبرآبادی لکھتے ہیں:

''زندگی کی دُشواریاں، حیات کے مصائب، زندگی کی تلخیاں طرح طرح سے ان (نظیرؔ) کے سامنے آتی ہیں، وہ ان کا جائزہ لیتے ہیں مگر ان سے مغلوب نہیں ہوتے۔''

(مخمور اکبرآبادی، نظیرنامہ)

مشہور مستشرق ڈاکٹر ڈبلیو۔ ایس۔ فیلن اپنی تالیف ''نئی ہندوستانی انگریزی ڈکشنری'' میں نظیرؔ کی رجائیت کا اعتراف ان الفاظ میں کرتے ہیں کہ:

''نظیرؔ کو فطرت کے ہر منظر اور انسانیت کے ہر رُخ سے محبت تھی، وہ ہر چیز میں خیر کا پہلو دیکھتا تھا۔ وہ عوام کے ساتھ ہنستا، قہقہے لگاتا اور ٹھٹے مارتا ہے۔ وہ ان کے کھیلوں اور تفریحوں سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ وہ ان کے درد کو محسوس کرتا ہے۔''

(نظیرؔ اکبرآبادی کی نظم نگاری)

ان کی نظمیں ''اکبرآباد اور تاج گنج، ککڑی اور تربوز، ہولی، دیوالی، راکھی اور چاندنی وغیرہ'' رجائیت سے لبریز ہیں۔ ان نظموں میں انہوں نے ہنسی خوشی اور جشن کے پہلو کو اُبھارا ہے۔ نظیرؔ کی رجائیت ہر قسم کی تفریق سے بالا ہے۔ ان کی نظم ''آدمی نامہ'' اس کی بہترین مثال ہے۔ وہ شاہ و گدا، امیر و فقیر اور امام و مقتدی سب کو ایک ہی صف (آدمیت) میں کھڑا کر دیتے ہیں۔

نعمت جو کھا رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی ٹکڑے جو مانگتا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
کاندھے پہ رکھ کے پالکی، ہیں آدمی کہار اور اس پہ جو چڑھا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
کمخواب، تاش، شال، دوشالوں میں غرق ہیں اور چیتھڑوں لگا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
سَو سَو طرح کے عیش کے کرتے ہیں رنگ ڈھنگ اور خاک میں پڑا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

﴿۷﴾ حیاتِ انسانی کے مختلف مدارج: نظیر کی شاعری انسانی زندگی کے مختلف شعبوں اور مختلف درجات سے بحث کرتی ہے۔ اُنہیں اِس بات سے کوئی مطلب نہیں کہ ولادت سے قبل اور بعدالموت کیا ہوتا ہے۔ وہ اور اُن کی شاعری حیاتِ انسانی سے بحث کرتے ہیں۔ اُن کی شاعری کا موضوع انسان اور اُس کی معاشرت ہے۔ زندگی اور معاشرت اُن کے لئے بہت اہمیت کے حامل ہیں۔ اِس لئے وہ انسان اور سماج کو مختلف زاویوں سے دیکھتے ہیں اور پھر اُس کے ذریعے اپنی نظموں کو زینت بخشتے ہیں۔ وہ ہمیشہ انسان اور اُس کے متعلقات روٹی، کپڑا، رسم، تیوہار، گلی، بازار، میلے ٹھیلے، جاڑا، گرمی، برسات، اُمَس، غریبی اور امیری کی بات کرتے ہیں۔ اِس سلسلے میں پروفیسر شہباز لکھتے ہیں:

''میرے خیال میں اردو کے شعرا میں شاید ہی کسی کو انسانی طبیعت کا اِس قدر صحیح اور عمیق تجربہ ہو۔ اُس (نظیر) کی ہر نظم سے پایا جاتا ہے کہ اُس کی آنکھیں دن رات اِسی کام کے لئے کھلی رہتی تھیں۔ اور انسان ہی کے حالات دریافت کرنے کو مقصدِ اعظم جانتا تھا۔''

(زندگانیِ بےنظیر از.. پروفیسر شہباز)

مخمور اکبرآبادی لکھتے ہیں:

''نظیر نے زندگی کے حالات پر مختلف پہلوؤں سے نظر ڈالی اور جس شعبے کو اُٹھایا اس کا پورا پورا حق ادا کر دیا۔''

مولانا عبدالباری آسی لکھتے ہیں:

''عمر کے مختلف مدارج، لڑکپن، جوانی، ضعیفی، سب کی تصویریں نظیر کے شاعرانہ قلم نے جس خوبی سے کھینچی ہیں ان کی نظیر اچھے اچھے استادوں میں بھی کم ملے گی۔ اُن میں طفلی کا مضمون تو شاید سب سے اچھوتا ہی ہے۔''

یہاں ان کی نظم ''طفلی نامہ'' سے صرف ایک بند بطور نمونہ پیش ہے:

دل میں کسی کے ہرگز نے شرم نے حیا ہے آگا بھی کھل رہا ہے پیچھا بھی کھل رہا ہے
پہنے پھرے تو کیا ہے، ننگے پھرے تو کیا ہے یاں یوں بھی واہ وا ہے اور ووں بھی واہ وا ہے
کچھ کھالے اِس طرح سے کچھ اُس طرح سے کھالے
کیا عیش لوٹتے ہیں معصوم بھولے بھالے

اس طرح نظیر نے بچپن، جوانی اور بڑھاپا ہر شعبے کی کامیاب تصویر کشی اور ترجمانی کی ہے۔

﴿۸﴾ حکیمانہ، فلسفیانہ اور صوفیانہ خیالات: نظیر کی شاعری میں حکیمانہ، فلسفیانہ اور صوفیانہ افکار بھی وافر مقدار میں موجود ہیں۔ نظیر نے کائنات کا عمیق نظر سے مشاہدہ کیا، اس کو سمجھا اور پرکھا۔ اس لئے حکیمانہ اور فلسفیانہ خیالات نے ان کی شاعری میں جگہ بنائی۔ جب کہ نظیر کا زمانہ سیاسی وسماجی ابتری کا زمانہ تھا۔ ایرانی حملوں نے سلطنت کا شیرازہ بکھیر دیا تھا۔ ہر طرف بغاوتیں تھیں اور پھر نظیر کا کہیں نہ کہیں رشتہ

صوفیاے کرام سے جڑا ہوا تھا۔ وہ سلیم چشتی کے معتقد تھے۔ اس لئے ان کی شاعری میں صوفیانہ خیالات کا در آنا کوئی نئی بات نہیں کیوں کہ تصوّف و مذہب ایسے ہی ماحول میں انسان کی اُمید بنتے ہیں اور انسان کو ان کے ذریعے صبر، توکّل اور قناعت کی تعلیم ملتی ہے۔

ڈاکٹر ابواللیث صدیقی لکھتے ہیں:

''نظیر کوئی حکیم یا فلسفی نہیں تھے کہ ان کے کلام میں کسی خاص نظریۂ حیات کی تلاش کی جائے، وہ سیدھے سادے دنیادار انسان تھے لیکن ان کا مشاہدہ تیز اور تحلیل و تجزیے کی قوت بے پناہ تھی، اس لئے انہوں نے اپنے ماحول کا جس طرح جائزہ لیا ہے اور جو نتیجے نکالے ہیں اسی کو ہم ان کا فلسفہ کہہ سکتے ہیں۔''

حافظ شمس الدین منیری اپنی کتاب ''اشعارِ نظیر'' میں لکھتے ہیں:

''دنیا اور حوادثِ دنیا کا جس قدر تجربہ نظیر کو ہوا ہے شاید کسی دوسرے اردو شاعر کو نہیں ہوا ہوگا، اور اس سے جو سبق انہوں نے سیکھے اور جو عبرت حاصل کی اس کا نہایت مؤثر بیان ان کے کلام میں موجود ہے۔ اخلاق و تصوّف پر بھی جو نظمیں نظیر نے لکھی ہیں وہ نہ صرف ان کے خلوص اور نیکی کو ظاہر کرتی ہیں بلکہ پڑھنے والوں کے دلوں میں بھی اُنہی جذبات کو برانگیختہ کرتی ہیں۔''

نظیر کا یہ شعر ان کے حکیمانہ، فلسفیانہ اور صوفیانہ خیالات کا بے باک نقیب ہے:

افلاس میں ، ادبار میں ، اقبال میں خوش ہیں پورے ہیں وہی مرد جو ہر حال میں خوش ہیں

انہوں نے وحدت الوجود اور معرفتِ الٰہی پر اپنی نظموں میں خاصا زور دیا ہے۔ انہوں نے دنیا کے فانی اور دارالمکافات ہونے پر بھی بہت زور صرف کیا ہے۔ ''دنیا دارالمکافات، زمانہ عمل، موت کا دھڑکا، عبرت و فنا، فنا نامہ، مراتبِ دنیا محض بے ثبات ہیں، رہے نام اللہ کا، بعد از فنا، سفرِ آخرت کی تیاری اور فقیروں کی صدا'' اسی قبیل کی بہترین نظمیں ہیں۔ علاوہ ازیں تمثیل نگاری میں بھی نظیر ایک بلند پایہ شاعر ہیں۔ انہوں نے اپنی نظموں میں تمثیل نگاری کے اعلیٰ نمونے پیش کیے ہیں۔ نظیر زبان بھی سادہ و دل کش استعمال کرتے ہیں، ثقیل اور بھاری یا معرب و مفرس الفاظ نہیں لاتے، ان کی شاعری حقیقت میں عوام کی شاعری ہے۔

02.07 نظم ''آدمی نامہ'' متن

دنیا میں پادشہ ہے سو ہے وہ بھی آدمی اور مفلس و گدا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
زَردار و بے نوا ہے سو ہے وہ بھی آدمی نعمت جو کھا رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
ٹکڑے چبا رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
ابدال ، قطب ، غوث ، ولی آدمی ہوئے منکر بھی آدمی ہوئے اور کفر کے بھرے
کیا کیا کرشمے کشف و کرامات کے لیے اتنی کہ اپنے زور و ریاضت کے زور سے
خالق سے جا ملا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

فرعون نے کیا تھا جو دعویٰ خدائی کا شدّاد بھی بہشت بنا کر ہوا خدا
نمرود بھی خدا ہی کہاتا تھا برملا یہ بات ہے سمجھنے کی ، آگے کہوں میں کیا
یاں تک جو ہو چکا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

یاں آدمی ہی نار ہے اور آدمی ہی نور یاں آدمی ہی پاس ہے اور آدمی ہی دور
کل آدمی کا حسن و قبح میں ہے یاں ظہور شیطاں بھی آدمی ہے جو کرتا ہے مکر و زور
اور ہادی ، رَہ نما ہے سو ہے وہ بھی آدمی

مسجد بھی آدمی نے بنائی ہے یاں میاں بنتے ہیں آدمی ہی امام اور خطبہ خواں
پڑھتے ہیں آدمی ہی قرآں اور نماز ، یاں اور آدمی ہی اُن کی چراتے ہیں جوتیاں
جو اُن کو تاڑتا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

یاں آدمی پہ جان کو وارے ہے آدمی اور آدمی پہ تیغ کو مارے ہے آدمی
پگڑی بھی آدمی کی اُتارے ہے آدمی چلّا کے آدمی کو پکارے ہے آدمی
اور سُن کے دوڑتا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

ناچے ہے آدمی ہی بجا تالیوں کو یار اور آدمی ہی ڈالے ہے اپنی اِزار اُتار
ننگا کھڑا اُچھلتا ہے ہو کر ذلیل و خوار سب آدمی ہی ہنستے ہیں دیکھ اُس کو بار بار
اور وہ جو مسخرا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

چلتا ہے آدمی ہی مسافر ہو ، لے کے مال اور آدمی ہی مارے ہے ، پھانسی گلے میں ڈال
یاں آدمی ہی صید ہے اور آدمی ہی جال سچّا بھی آدمی ہی نکلتا ہے میرے لال!
اور جھوٹ کا بھرا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

یاں آدمی ہی شادی ہے اور آدمی بیاہ قاضی، وکیل آدمی اور آدمی گواہ
تاشے بجاتے آدمی چلتے ہیں خواہ مخواہ دوڑے ہیں آدمی ہی تو مشعل جلا کے واہ
اور بیاہنے چڑھا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

یاں آدمی نقیب ہو بولے ہے بار بار اور آدمی ہی پیادے ہیں اور آدمی سوار
حقہ ، صراحی ، جوتیاں ، دوڑیں بغل میں مار کاندھے پہ رکھ کے پالکی ہیں دوڑتے کہار
اور اس میں جو چڑھا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

بیٹھے ہیں آدمی ہی دکانیں لگا لگا اور آدمی ہی پھرتے ہیں رکھ سر پہ خوانچا
کہتا ہے کوئی لو ، کوئی کہتا ہے لا رے لا کس کس طرح کی بیچے ہیں چیزیں بنا بنا
اور مول لے رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

یاں آدمی ہی قہر سے لڑتے ہیں گھور گھور اور آدمی ہی دیکھ انہیں بھاگتے ہیں دور
چاکر ، غلام ، آدمی اور آدمی مزور یاں تک کہ آدمی ہی اُٹھاتے ہیں جا ضرور
اورجس نے وہ پھرا ہے سوہے وہ بھی آدمی

طبلے ، منجیرے ، دائرے ، سارنگیاں بجا گاتے ہیں آدمی ہی ہر اک طرح جا بجا
رنڈی بھی آدمی ہی نچاتے ہیں گت لگا وہ آدمی ہی ناچے ہیں اور دیکھ پھر مزا
جو ناچ دیکھتا ہے سوہے وہ بھی آدمی

یاں آدمی ہی لعل و جواہر ہیں بے بہا اور آدمی ہی خاک سے بدترہے ہو گیا
کالا بھی آدمی ہے کہ اُلٹا ہے جوں توا گورا بھی آدمی ہے کہ ٹکڑا ہے چاند کا
بد شکل، بد نماہے سوہے وہ بھی آدمی

اک آدمی ہیں جن کے یہ کچھ زرق برق ہیں روپے کے ان کے پاؤں ہے،سونے کے فرق ہیں
جھمکے تمام غرب سے لے تا بہ شرق ہیں کمخواب ، تاش ، شال دوشالوں میں غرق ہیں
اور چیتھڑوں لگاہے سوہے وہ بھی آدمی

اک ایسے ہیں کہ جن کے بچھے ہیں نئے پلنگ پھولوں کی سیج ان پہ چمکتی ہے تازہ رنگ
سوتے ہیں لپٹے چھاتی سے معشوقِ شوخ وشنگ سوسوطرح سے عیش کے کرتے ہیں رنگ ڈھنگ
اورخاک میں پڑاہے سوہے وہ بھی آدمی

حیراں ہوں یارو ! دیکھو تو کیا یہ سوانگ ہے اور آدمی ہی چور ہے اورآپ ہی تھانگ ہے
ہے چھینا جھپٹی اور کہیں مانگ تانگ ہے دیکھا تو آدمی ہی یہاں مثلِ رانگ ہے
فولاد سے کڑاہے سوہے وہ بھی آدمی

مرتے ہیں آدمی ہی کفن کرتے ہیں تیار نہلا دُھلا اُٹھاتے ہیں کاندھے پہ کر سوار
کلمہ بھی پڑھتے جاتے ہیں،روتے ہیں زارزار سب آدمی ہی کرتے ہیں مردے کا کاروبار
اور وہ جو مرگیاہے سوہے وہ بھی آدمی

اشراف اور کمینے سے لے شاہ تا وزیر ہیں آدمی ہی صاحبِ عزت بھی اور حقیر
یاں آدمی مرید ہے اور آدمی ہی پیر اچھا بھی آدمی ہی کہاتا ہے اے نظیرؔ
اورسب میں جو براہے سوہے وہ بھی آدمی

02.08 نظم ''آدمی نامہ'' تجزیہ

یہ نظم نظیر کی ایک شہرۂ آفاق نظم ہے۔جس میں صرف اور صرف آدمی کے عنوان سے بات کی گئی ہے۔نظیر کو اس بات سے کوئی سروکار نہیں کہ وہ آدمی کون ہے؟ وہ ہندی ہے یا ایرانی ہے؟ کالا ہے گورا ہے؟ مسلم ہے کہ غیر مسلم ہے؟ زندہ ہے یا مردہ ہے؟ بادشاہ ہے یا فقیر ہے؟ مرید ہے کہ پیر ہے؟ وہ صرف اور صرف آدمی کو آدمی کے ہی روپ میں دیکھتے ہیں۔اس نظم کو انہوں نے مخمس (ایک بند میں پانچ مصرعے) میں تحریر کیا ہے۔

نظیر کہتے ہیں کہ دنیا میں بادشاہ، مفلس وگدا، زردار (مال دار) بے نوا (فقیر) اور جو نعمت کھا رہے ہیں اور جو ٹکڑے مانگ کر اپنا گزارہ کر رہے ہیں وہ بھی آدمی ہی ہیں۔ابدال، قطب، غوث، ولی، منکر، کافر اور وہ جو کہ کرشمے یا کشف وکرامات دکھا رہے ہیں اور وہ لوگ جو اپنے زہد ورياضت کی بنا پر خالق سے جا ملے ہیں وہ بھی آدمی ہی ہیں۔ایک وہ آدمی کہ جس نے خدائی کا دعویٰ کیا (فرعون)، ایک وہ کہ جس نے روے زمین پر جنت بنا کر اپنے آپ کو خدا ظاہر کیا، اسی قبیل سے نمرود بھی ہے۔نظیر کہتے ہیں کہ یہ سمجھنے کی بات ہے، آگے میں کیا کہوں، یہاں تک جو بھی جس نے کیا ہے وہ بھی آدمی ہی ہیں۔ یہاں آدمی ہی آگ ہے اور آدمی ہی نور ہے، آدمی ہی پاس ہے اور آدمی ہی دور ہے اور تمام آدمیوں کی اچھائی یا برائی یا خوب صورتی، بدصورتی کا یہاں ظہور ہوتا ہے اور شیطان بھی آدمی ہے جو کہ مکر وفریب کے زور دکھاتا ہے۔

ہدایت کے راستے پر چلنے والے اور رَہ نمائی کرنے والے بھی آدمی ہی ہیں۔آدمی ہی مسجد بناتا ہے، اس میں مؤذّن وامام آدمی ہی بنتے ہیں، قرآن اور نماز بھی آدمی پڑھتے ہیں اور آدمی ہی جوتیاں بھی چراتے ہیں اور ان کو چراتے ہوئے دیکھنے والے بھی یہ تمام آدمی ہی ہیں۔ یہ آدمی ہی دوسرے کے لئے اپنی جان کو قربان کر دیتا ہے اور آدمی ہی تلوار سے آدمی کو مار دیتا ہے، آدمی ہی دوسرے آدمی کی پگڑی اُتارتا ہے اور چیخ یا چلاّ کر جو مدد کے لئے پکارتا ہے اور اس کی آواز کو سُن کر جو مدد کے لئے دوڑتا ہے یہ تمام آدمی ہی ہیں۔آدمی ہی ناچتا اور تالی بجاتا ہے اور آدمی ہی اپنا ازار اُتار دیتا ہے، ذلیل وخوار ہو کر ننگا کھڑا اُچھلتا کودتا ہے اور اس پہ تمام لوگ ہنستے ہیں اور وہ جو اپنے مسخرے پن سے سب کو ہنساتا ہے، یہ تمام آدمی ہی ہیں۔

آدمی ہی مسافر ہے جو کہ مال لے کر چلتا ہے اور آدمی ہی گلے میں پھانسی کا پھندا ڈال کر آدمی کو مار دیتا ہے، آدمی ہی شکار ہو جاتا ہے اور آدمی ہی شکار کے لئے اپنے آپ کو جال بنا لیتا ہے، سچ جو بولتا ہے اور وہ جو جھوٹ سے بھرا ہے یہ تمام آدمی ہی ہیں۔شادی اور بیاہ آدمی ہی کرتے ہیں اور اس میں قاضی، وکیل، اور گواہ آدمی ہی بنتے ہیں۔اور جو فضول تاشے باجے بجاتے ہیں اور جو مشعلیں جلائے پھرتے ہیں اور وہ جو بیاہنے جا رہا ہے یہ تمام آدمی ہی ہیں۔

نقیب، چوب دار، چوکی دار، پیادہ (پیدل چلنے والا)، سوار اور حقہ، صراحی، جوتیاں بغل میں لے کر دوڑنے والا اور کہار جو کہ پالکی کو اپنے کاندھے پہ رکھ کر چلتے ہیں اور اس پالکی میں جو چڑھا (سوار) ہے یہ تمام آدمی ہی ہیں۔آدمی ہی جا بجا اپنی دکانیں لگانے والے، سر پر خوانچہ رکھ کر پھرنے والے، لینے اور بلانے والے، طرح طرح کی چیزیں بنا کر بیچنے والے اور انہیں مول لینے والے یہ تمام آدمی ہی ہیں۔ یہاں آدمی ہی قہر آلود نگاہوں سے گھور گھور کر لڑ پڑتے ہیں اور آدمی ہی انہیں دیکھ کر دور بھاگتے ہیں۔چاکر، نوکر، غلام، مزدور، یہاں تک کہ پاخانہ پھرنے اور اُٹھانے والے بھی یہ تمام آدمی ہی ہیں۔

طبلے، مجیرے، دائرے، سارنگیاں بجانے والے اور گلی کوچوں میں گانے بجانے والے اور گت لگا کر رنڈیوں کو نچانے والے اور ان کے ساتھ ناچنے اور دیکھنے والے یہ تمام آدمی ہی ہیں۔ یہاں آدمی ہی قدر و قیمت کے اعتبار سے لعل و جواہر سے بہتر ہے اور آدمی ہی مٹی سے بدتر ہے، آدمی ہی اُلٹے توے کے جیسا کالا (بدصورت) ہے اور خوب صورتی یعنی گورے پن میں چاند کے ٹکڑے جیسا لگتا ہے، یہ تمام آدمی ہی ہیں۔ ایک آدمی وہ ہے جو کہ ایسا لباس زیبِ تن کیے ہوئے ہے جو کہ زرق برق اور سونے چاندی سے مرصّع ہے اس کے تمام لباس پر عمدہ نقاشی کی گئی ہے، کم خواب، تاش، شال دوشالے میں پورے طور پر غرق ہے اور ایک وہ ہے جو کہ اپنے بدن پر چیتھڑے لگائے ہوئے ہے، یہ تمام آدمی ہی ہیں۔

ایک آدمی ایسا بھی ہے جس کے لئے نئے پلنگ بچھے ہیں تازہ دَم پھولوں کی سیج ان پر جھمک رہی ہے، اس پر عاشق و معشوق چھاتی لپٹے ہوئے شوخیاں اور اٹھکھیلیاں کرتے ہوئے سَو سَو طرح کے عیش کر رہے ہیں اور ایک وہ ہے جو کہ خاک کا بچھونا بنائے پڑا ہے، یہ تمام آدمی ہی ہیں۔ اب نظیؔر کہتے ہیں یہ کیا سوانگ ہے کہ آدمی ہی چور ہے اور آدمی ہی تھانے دار ہے۔ کہیں چھینا جھپٹی اور مانگ تانگ ہو رہی ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ آدمی یہاں رانگ کے مثل اور کبھی فولاد کی طرح بھی ہے، یہ تمام آدمی ہی ہیں۔ میّت کے کفن کی تیاری اور نہلانے، دھلانے والے، کاندھوں پر سوار کرنے والے، کلمہ پڑھنے والے، بے تحاشا رونے والے اور مردے کا کاروبار کرنے والے اور دنیا سے جانے والے، یہ تمام آدمی ہی ہیں۔

نظیؔر آخری بند میں کہتے ہیں کہ شریف لوگوں سے کمینوں تک بادشاہ سے لے کر وزیر تک آدمی ہی ہیں، چاہے وہ صاحبِ عزت ہوں یا حقیر، آدمی ہی مرید اور آدمی ہی پیر ہوتا ہے، اچھا ہو یا برا سب آدمی ہی کے قبیل سے ہیں۔ خلاصۂ کلام یہ کہ اس نظم ''آدمی نامہ'' میں آدمی کے تمام روپ اور نفسیات اور کام کو دکھایا گیا ہے کہ یہ تمام لوگ بھی آدمی ہی ہیں۔ نظیؔر اکبر آبادی کی یہ نظم ایک شاہ کار نظم ہے۔

02.09 خلاصہ

نظیؔر دہلی میں پیدا ہوئے۔ ماں کے ساتھ اکبر آباد ہجرت کی۔ زندگی کی تقریباً ۹۵ر بہاریں دیکھیں۔ آپ آزاد طبیعت کے مالک تھے۔ شروع سے ہی میلوں ٹھیلوں سے رغبت رکھی، بڑے ہو کر شاعری کی طرف مائل ہوئے اور نظم نگاری میں کمال حاصل کیا۔ ہر موضوع پر نظمیں لکھیں۔ ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب کو اپنی نظموں میں سمویا۔ قومی یک جہتی، مذہبی رواداری، ہندوستانیت، عوامیت، رجائیت، تصوّف اور حکمت ان کی نظموں میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ انہوں نے اپنی نظموں کے لئے سادہ سلیس اور شگفتہ زبان استعمال کی ہے۔ انہوں نے نہ صرف عربی، فارسی کے الفاظ استعمال کیے بلکہ سنسکرت، ہندی، برج اور پنجابی وغیرہ کے الفاظ بھی بہت کثرت سے استعمال کیے۔

ان کے نزدیک ہندو، مسلمان، امیر، غریب، کالے، گورے، سب کے سب انسان ہیں وہ تفریق کے قائل نہیں ہیں۔ انہوں نے ہندو مسلم اتحاد کے لئے مختلف نظمیں لکھیں۔ ہندو مسلم تیوہاروں کو اپنی نظموں کی زینت بنایا۔ ان کی شاعری درحقیقت سماج اور انسان کی شاعری ہے۔ ہر موضوع پر نظمیں لکھنا ان کی وسیع المشربی کا ثبوت ہے۔ ان کی نظموں میں نئی نئی تراکیب، استعارے، نئی نئی تشبیہات اور ہیئت کے تجربے بھی موجود ہیں۔ وہ اردو کے پہلے کامیاب عوامی شاعر ہیں جنہوں نے غزل کی شاعری کے دَور میں نظم کی روایت کو آگے بڑھایا اور شاعری کو ایک نیا راستہ دکھایا۔ اسی بنا پر ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ نظیؔر اکبر آبادی سماجی، جمہوری، سیکولر اور شہرۂ آفاق شاعر ہیں۔

02.10 فرہنگ

اِزار	:	پاجامہ	کہار	:	پالکی کو کاندھے پر رکھ کر چلنے والا
انفرادیت	:	الگ	قبح	:	برائی
پگڑی اُتارنا (محاورہ)	:	بےعزّت کرنا	قنوطیت	:	نا اُمیدی
پیادہ	:	پیدل چلنے والا	متبع	:	اتباع کرنے والا
جوں (حرف تشبیہ)	:	جیسے	مستحق	:	لائق ہونا
حسن	:	اچھائی، خوب صورتی	مسخرا	:	ہنسانے والا (جوکر)
دارالمکافات	:	بدلے کا گھر	معرفتِ الٰہی	:	اللہ تعالیٰ کو پہچاننا
رانگ	:	ایک دھات	مفلس، گدا، بےنوا	:	فقیر
رَہ نما	:	راستہ دکھانے والا	وارنا	:	قربان ہونا
زوال پذیر	:	ختم ہونا	ہادی	:	ہدایت کی طرف بلانے والا
عبور	:	کسی فن میں اچھی صلاحیت ہونا	یاں	:	یہاں کا مخفف

02.11 سوالات

مختصر سوالات

سوال نمبر۱ : نظیر اکبرآبادی کی شاعری پر اپنی معلومات رقم کیجیے؟

سوال نمبر۲ : نظیر اکبرآبادی کی ہندوستانیت پر اپنے خیالات کا اظہار کیجیے؟

سوال نمبر۳ : نظیر اکبرآبادی کی شخصیت پر اپنے الفاظ میں ایک مضمون لکھیے؟

تفصیلی سوالات

سوال نمبر۱ : نظیر اکبرآبادی کے حالاتِ زندگی بیان کیجیے؟

سوال نمبر۲ : نظیر اکبرآبادی کی نظم ''آدمی نامہ'' کا تجزیہ اپنے الفاظ میں لکھیے؟

سوال نمبر۳ : نظیر اکبرآبادی کی نظم نگاری کے عناصر پر ایک مفصّل مضمون تحریر کیجیے؟

معروضی سوالات

سوال نمبر۱ : نظیر اکبرآبادی کا نام کیا ہے؟

(الف) علی محمد (ب) ولی محمد (ج) نذیر احمد (د) نظیر احمد

سوال نمبر۲ : نظیر اکبرآبادی کی پیدائش کس سنہ میں ہوئی؟

(الف) ۱۷۳۳ء (ب) ۱۷۳۴ء (ج) ۱۷۳۵ء (د) ۱۷۳۶ء

سوال نمبر۳ : شیخ محمد فاروق کہاں کے باسی تھے؟

(الف) دلّی (ب) آگرہ (ج) لکھنؤ (د) متھرا

سوال نمبر۴ : نظیر اکبرآبادی کی شادی ذیل میں کس عورت سے ہوئی؟

(الف) مہرالنسا (ب) تہورالنسا (ج) خیرالنسا (د) شمس النسا

سوال نمبر۵ : نظیر اکبرآبادی کی نظم ''آدمی نامہ'' میں کتنے بند ہیں؟

(الف) ۱۷ (ب) ۱۸ (ج) ۱۹ (د) ۲۰

سوال نمبر۶ : نظیر اکبرآبادی کی نظم ''آدمی نامہ'' کس ہیئت میں ہے؟

(الف) مثلث (ب) مسبع (ج) مسدس (د) مخمس

سوال نمبر۷ : نظیر اکبرآبادی کی عمر قمری کیلنڈر کے حساب سے کتنی تھی؟

(الف) ۹۹ (ب) ۹۸ (ج) ۹۷ (د) ۹۶

سوال نمبر۸ : نظیر اکبرآبادی اپنی موت سے قبل کس مرض میں مبتلا تھے؟

(الف) برص (ب) لقوہ (ج) فالج (د) کوئی نہیں

معروضی سوالات کے جوابات

جواب نمبر۱ : (ب) ولی محمد

جواب نمبر۲ : (ج) ۱۷۳۵ء

جواب نمبر۳ : (الف) دلّی

جواب نمبر۴ : (ب) تہورالنسا

جواب نمبر۵ : (ج) ۱۹

جواب نمبر۶ : (د) مخمس

جواب نمبر۷ : (الف) ۹۹

جواب نمبر۸ : (ج) فالج

02.12 حوالہ جاتی کتب

۱۔ نظیر اکبرآبادی کا منتخب کلام از مخمور سعیدی

۲۔ نظیر نامہ از شمس الحق عثمانی

۳۔ نظیر اکبرآبادی کی نظم نگاری از ڈاکٹر سید طلعت حسین نقوی

۴۔ آثر کے تنقیدی مضامین از اثر لکھنوی

۵۔ ماہ نامہ: اردو دنیا اکتوبر ۲۰۱۶ء از پروفیسر محمد نعمان خاں

۶۔ زندگانی بے نظیر از عبدالغفور شہباز

اکائی 03 : خواجہ الطاف حسین حالؔی ''برکھا رُت''

ساخت :

03.01 : اغراض ومقاصد

03.02 : تمہید

03.03 : خواجہ الطاف حسین حالؔی کے حیات وکارنامے

03.04 : خواجہ الطاف حسین حالؔی کی شاعری

03.05 : خواجہ الطاف حسین حالؔی بحیثیتِ نظم نگار

03.06 : خواجہ الطاف حسین حالؔی کی نظم نگاری کی خصوصیات

03.07 : نظم ''برکھا رُت'' متن

03.08 : نظم ''برکھا رُت'' تجزیہ

03.09 : خلاصہ

03.10 : فرہنگ

03.11 : سوالات

03.12 : حوالہ جاتی کتب

03.01 اغراض ومقاصد

آپ اس اکائی کے مطالعے سے خواجہ الطاف حسین حالؔی کی حیات، تعلیم وتربیت، شخصیت، ملازمت، کارنامے اوران کی تصنیفات کے بارے میں جان سکیں گے۔اس کے علاوہ ان کی نظم نگاری، اس کی خصوصیات اور نظم ''برکھا رُت'' کا متن پیش کیا جائے گا اوراس کے بعد اس کا تجزیہ پیش کیا جائے گا اور حالؔی کی شاعری کے پس منظر کا بھی علم ہو سکے گا اورقوم کی اصلاح اور ذہنی بیداری میں ان کے کلام نے کیا کردار ادا کیا ہے، اس کو جان کر آپ کی معلومات میں یقیناً اضافہ ہوگا اور اردو شاعری میں خصوصاً اردو نظم نگاری میں ان کی اہم ونمایاں شاعرانہ خدمات، حیثیت، مقام ومرتبے اورفنّی خصوصیات سے متعلق معلومات حاصل کرسکیں گے۔

03.02 تمہید

خواجہ الطاف حُسین حالؔی اردو شاعری کے اہم منفرد اور ممتاز شاعر ہیں۔اردو ادب میں نظم کو فروغ دینے والے شاعروں میں ان کا ایک الگ مقام ہے۔مولانا نے اپنی پوری زندگی اردو شعروادب کی خدمت کے لئے وقف کردی تھی۔وہ ایک بہترین نثر نگار، امتیازی لب و لہجے کے شاعر، اردو کے اوّلین نقّاد، سوانح نگار اور تبصرہ نگار بھی تھے۔

اردو تنقید کی دنیا میں ان کی تصنیف ''مقدمۂ شعروشاعری'' کو بوطیقا کی مثل اہمیت حاصل ہے۔سوانح نگاری کے میدان میں ان کی مشہورومعروف تصنیفات ''حیاتِ جاوید، یادگارِغالب اورحیاتِ سعدی'' ہیں۔خواجہ الطاف حسین حالؔی نے سرسید احمدخاں کے رسالے ''تہذیب الاخلاق'' میں مختصر تبصرے لکھ کر اردو ادب میں نثر کی خدمت کی ہے۔نیچرل اور قومی شاعری میں حالؔی کو ایک منفرد مقام حاصل ہے۔ نظم نگاری کا تسلسل اور وسعت نظیرؔ اکبرآبادی کی طرح خواجہ الطاف حسین حالؔی کی شاعری میں بھی صاف نظر آتی ہے۔مولانا حالؔی کی شاعری کے موضوعات بھی الگ الگ ہیں۔انہوں نے غزلیں بھی کہی ہیں اور غزل گو شاعر کی حیثیت سے بھی کافی نام کمایا ہے لیکن اصل شہرت ان کی نظم نگاری کے میدان میں پائی ہے۔اردو میں جدید نظم گوئی کا آغاز حالؔی کی شاعری سے شروع ہوتا ہے۔ان کی نظموں میں فکروفلسفہ کی گہرائی نہیں بلکہ احساسات وجذبات کی عکاسی ملتی ہے۔

''انجمنِ پنجاب'' کے قیام کے بعد حالؔی نے بھی کھل کر محمد حسین آزادؔ کی موضوعاتی نظمیہ شاعری کی تحریک کو آگے بڑھایا۔انہوں نے بھی اصلاحی اور قومی نظمیں کہیں۔سرسید کے ایما پر ملت کی زبوں حالی، اس کے تاب ناک ماضی اور روشن مستقبل کو موضوع بنایا اور اس طرح ایک معرکۃ الآرا تصنیف ''مدّ وجزرِ اسلام (مسدّس حالی) منظرِ عام پر آئی۔قدیم طرزِ شاعری اور مخربِ اخلاق مضامین سے دل سیر ہو چلا بلکہ مکدر ہو چکا تھا۔اردو شاعری ایک طرح سے قعرِ ضلالت میں پڑی تھی۔حالؔی قوم اور شاعری دونوں کی صفِ مصلحین میں شامل تھے۔حالؔی کے سلسلے میں یہ بات مسلّم ہے کہ ان کی ابتدائی غزلوں میں بھی عامیانہ اور سوقیانہ عناصر نہیں ملتے۔اس میں دراصل ان کے اپنے سنجیدہ مزاج اور مہذب وبردبار ہونے کا عمل دخل تھا۔لہٰذا یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ ابتذال پسندی کو ان کی طبیعت سے کوئی علاقہ نہیں ہوسکتا تھا یا یہ کہ ان کی طبیعت مذموم مسائل کی طرف مائل نہیں ہوسکتی تھی۔

03.03 خواجہ الطاف حسین حالؔی کی حیات اور کارنامے

خواجہ الطاف حسین حالؔی کا خاندان ہرات سے تعلق رکھتا ہے۔ان کے جدِ اعلیٰ خواجہ ملک علی خاندانِ غلامان کے دَور میں ہرات سے ہندوستان پہنچے۔خواجہ ملک علی ایک عالم وفاضل انسان تھے۔ان کی پندرہویں پشت میں خواجہ ایزد بخش پیدا ہوئے۔خواجہ الطاف حسین حالؔی ان ہی کے صاحب زادے تھے۔وہ پانی پت کے ایک گاؤں سونی پت میں ۱۸۳۷ء میں پیدا ہوئے۔خواجہ ایزد بخش نے اپنے بیٹے کی تعلیم کے لئے معقول انتظامات کیے۔پانچ سال کی عمر میں آپ کی مذہبی تعلیم شروع ہوئی اور ابتدائی عمر میں ہی آپ نے قرآنِ مجید حفظ کرلیا۔اس کے بعد عربی، فارسی اور مذہبی کتابوں کے مطالعے کی طرف توجہ دی۔ابھی آپ ۹ رہی سال کے تھے کہ آپ کے والدِ گرامی کا انتقال ہوگیا۔

حالؔی کے برادرِ کبیر خواجہ امداد حسین نے ان کی پرورش وپرداخت کی۔معاشی حالات ابتر ہونے کی وجہ سے حالؔی اسکولی تعلیم باضابطہ طریقے سے حاصل نہ کرسکے۔کم عمری میں شادی کرنے کا رواج اس زمانے میں عام تھا۔حالؔی ابھی تعلیم حاصل کرنا چاہتے تھے مگر خاندان کے بزرگ لوگوں نے ۱۷ ربرس کی عمر میں آپ کی شادی کردی جس کے لئے ابھی حالؔی تیار نہیں تھے۔چنانچہ ایک رات خاموشی سے گھر سے نکل گئے اور پانی پت سے دہلی تک تقریباً ۵۵ رمیل لمبا سفر آپ نے پیدل طے کیا اور دہلی پہنچے۔یہ ۱۸۵۴ء کا واقعہ ہے۔اب یہاں پر انہیں تعلیم جاری رکھنے اور شعری ذوق کو پروان چڑھانے کا موقع ملا۔جامع مسجد سے متصل مدرسے میں آپ شامل ہوگئے۔حالؔی جس وقت دہلی پہنچے اس وقت دہلی کے شاعرانہ ماحول میں مصطفیٰ خاں شیفتہؔ اور مرزا اسداللہ خاں غالبؔ کی شاعری کی دھوم تھی۔

حالؔی نے شروع میں شیفتہؔ اور اس کے بعد غالبؔ سے شرفِ تلمذ حاصل کیا۔ایک سال بعد اہلِ خانہ کے بے حد اصرار پر آپ دہلی چھوڑ کر پانی پت چلے آئے اور ۱۸۵۶ء میں شہر حصارِ میں ڈپٹی کمشنر کے دفتر میں معمولی سی تنخواہ پر ملازم ہو گئے۔چار سال لاہور میں قیام کیا پھر دہلی چلے آئے۔اینگلو عربک اسکول کے استاد مقرر ہوئے۔سرسید احمد خاں کے مشورے پر آپ نے ۱۸۷۹ء میں ''مسدّس حالی''لکھی۔علی گڑھ کالج کی امداد کے لئے خوب کام کیا۔ ۱۸۲۶ء سے ۱۸۵۵ء تک دہلی میں رہے ۔۱۸۶۳ء میں جہاں گیرآباد میں معلّم مقرر ہوئے ۔نثر اور شاعری سے دل چسپی نے وہ کام لیا جس کی مثال اردو ادب میں ملنی مشکل ہے۔سرسید کی سفارش پر ۱۸۷۸ء میں آپ نے حیدرآباد کا سفر کیا۔یہاں کی حکومت نے آپ کا ۷۵/روپیے ماہانہ وظیفہ مقرر کیا اور ۱۸۹۱ء میں یہ وظیفہ ۱۰۰/روپیے کر دیا گیا۔۱۹۰۵ء میں حیدرآباد کے آصف سادس نواب نیر محبوب علی خاں کی سلور جوبلی کے موقعے پر آپ موجود تھے۔یہاں سے آپ پانی پت گئے۔پانی پت میں ہی ۱۹۱۴ء میں انتقال ہوا۔

﴿ **کارنامے** ﴾: حالؔی کی نثر نگاری تاریخی اعتبار سے ان کی نظم نگاری پر سبقت رکھتی ہے۔حالؔی کی ابتدائی تصانیف زیادہ تر مذہبی ہیں۔آپ نے سب سے پہلے اپنی پہلی تصنیف عربی میں ''عربی کا رسالہ''لکھی۔دوسری کتاب مولود شریف ہے۔یہ مولود شریف حالی کی زندگی میں شائع نہ ہو سکی بلکہ ان کے انتقال کے بعد ۱۹۳۳ء میں شائع ہوئی۔آپ کی تیسری کتاب ''تریاقِ مسموم'' ہے جو کہ ۱۸۶۸ء میں لکھی گئی۔یہ کتاب حالؔی کے ایک ہم وطن پادری عماد الدین کی کتاب ہدایت المسلمین کے جواب میں لکھی گئی۔اس کے بعد تاریخِ محمدی،شواہد الالہام اور تذکرۂ رحمانیہ لکھی۔آخر الذکر تینوں کتابیں مذہبی ہیں۔''طبقات الارض''فرانسیسی میں لکھی ایک کتاب کا عربی سے اردو میں ترجمہ ہے۔حالؔی کی پہلی نثری تصنیف جو کہ اردو میں ملتی ہے اس کا نام ''مجالس النسا'' ہے یہ ۱۸۷۴ء میں لکھی گئی۔یہ کتاب دو حصوں میں لکھی گئی ہے۔یہ ناول کی ابتدائی شکل ہے۔دل چسپ و مفید ہونے کے علاوہ آسان بھی ہے۔ایک مدّت تک یو پی اور پنجاب کے نصاب میں داخل رہی ہے۔اسی کتاب پر حالؔی کو حکومت کی جانب سے ۴۰۰/روپیے کا انعام بھی ملا تھا۔

﴿۱﴾ **حیاتِ سعدی**: شیخ سعدی شیرازی کی مکمّل و مفصل سوانح عمری ہے۔اس کتاب کے دو حصے ہیں۔پہلے حصے میں تحقیق کے ساتھ سعدی شیرازی کے حالات لکھے گئے ہیں جب کہ دوسرے حصے میں آپ کے کلام پر تبصرہ ہے۔حیاتِ سعدی کی اہمیت و خصوصیت یہ ہے کہ یہ اردو کی پہلی کتاب ہے جو کہ سیرت نگاری کے موضوع پر لکھی گئی ہے۔

﴿۲﴾ **مقدمۂ شعر و شاعری**: یہ مقدمہ دیوانِ حالی کے ساتھ پہلی مرتبہ ۱۸۹۳ء میں شائع ہوا تھا۔یہ کتاب بھی دو حصوں پر مشتمل ہے۔پہلے حصے میں شعر کی تعریف،اس کی خصوصیات اور شاعری کے اچھے اور برے اثرات دونوں کا ذکر ہے۔دوسرا حصہ اردو شاعری اور شاعروں پر مشتمل ہے۔یہ مقدمہ اردو تنقید کی تاریخ میں ایک مستقل تصنیف کی اہمیت رکھتا ہے اور اردو تنقید پر یہی سب سے پہلی کتاب ہے۔

﴿۳﴾ **یادگارِ غالبؔ**: غالبؔ کی حیات و شاعری پر لکھی جانے والی سب سے پہلی کتاب ''یادگارِ غالبؔ'' ہے۔یادگارِ غالبؔ نے غالبؔ کو زندہ و جاوید بنا دیا۔اس کتاب کے بھی دو حصے ہیں۔حصہ اول میں غالبؔ کے حالاتِ زندگی ہیں جب کہ حصہ دوم میں اردو اور فارسی کلام پر تبصرہ اور مشکل اشعار کے معانی و مطالب ہیں۔آخر میں مختصر سا انتخابِ کلام بھی شامل ہیں۔یہ کتاب ۱۸۹۷ء میں شائع ہوئی ہے۔

﴿۴﴾ **حیاتِ جاوید:** اس کتاب میں حالؔی نے سرسید کے حالات کافی تلاش وتحقیق سے جمع کیے ہیں۔ یہ کتاب حالؔی نے چھ برس میں مکمل کی۔ تقریباً ایک ہزار صفحات کی یہ کتاب ۱۸۹۸ء میں چھپنی شروع ہوئی اور مارچ ۱۹۰۱ء میں طباعت مکمل ہوسکی۔

اُردو میں سوانح نگاری کی یہ پہلی کتاب ہے۔ ان کتابوں کے بعد مضامینِ حالؔی، مقالاتِ حالؔی اور مکتوباتِ حالؔی کا ذکر آتا ہے۔ مضامینِ حالؔی ۱۹۰۲ء میں شائع ہوئی۔ باقی دونوں کتابیں خواجہ الطاف حسین حالؔی کے انتقال کے کافی عرصے بعد شائع ہوئیں۔

03.04 خواجہ الطاف حسین حالؔی کی شاعری

خواجہ الطاف حسین حالؔی کا بچپن اگرچہ بڑی دشواریوں میں گزرا اور آپ کی تعلیم صحیح طور پر نہ ہوسکی پھر بھی آپ شادی کے بعد دہلی پہنچے۔ یکے بعد دیگرے کئی ملازمتیں کیں۔ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہؔ کے بچوں کے اتالیق مقرر ہوئے تو آپ کے شعری ذوق کو جلا ملی۔ شیفتہؔ سے اپنے کلام پر اصلاح لینی شروع کی۔ شیفتہؔ کے تتبع میں اپنا تخلص خستہؔ رکھا لیکن غالبؔ کے تلامذہ میں شامل ہونے کے بعد اپنا تخلص حالؔی اختیار کیا۔ آپ کی ابتدائی شاعری روایتی انداز کی رہی۔ شروع میں آپ غزل کہتے رہے۔ جب آپ کی ملاقات سرسید سے ہوئی تو اس وقت سے آپ کے شاعرانہ مزاج میں تبدیلی آئی۔ اب آپ نے روایتی غزل گوئی کا میدان چھوڑ کر نظم نگاری کی طرف توجہ کی۔

حالؔی نے بحیثیتِ نظم نگار ہی نام کمایا لیکن ان کے غزل کے سرمایے کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ حالؔی کی غزلیں روایتی موضوعات سے قریب ہوتے ہوئے بھی توازن واعتدال کی کیفیت رکھتی ہیں۔ ان کے یہاں غزلوں میں وفورِ جذبات اور شدتِ احساس کی کمی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی آواز اور لہجے میں دھیما پن ہے۔ خودفراموشی اور وارفتگی جو تغزّل کا سرمایہ ہے وہ ان کے یہاں کم ملتا ہے۔ غزل کا بنیادی موضوع وارداتِ عشق ہے۔ حالؔی فطرتاً نیک صفت انسان ہیں۔ ان کے یہاں اخلاقی اقدار کی بڑی اہمیت ہے جسے وہ اپنی غزلوں میں بھی برتتے ہیں۔ اخلاقی اقدار کی مضبوط گرفت غزل گو حالؔی پر اپنی قدغن لگائے رکھتی ہے۔ ان کو خود بھی احساس ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں:

ایک عالم سے وفا کی تو نے اے حالؔی! مگر نفس پر اپنے سدا ظالم! جفا کرتا رہا

حالؔی نے غزل میں تغزّل یا وارداتِ عشق سے کام لیا تو وہ ایک روایتی غزل گو کی طرح ہمارے سامنے آئے۔ کسی نئی جہت یا تازگی کا احساس نہیں ہوتا۔ مثال کے طور پر حسبِ ذیل شعر دیکھیے:

تھا آفتِ جاں اُس کا اندازِ کماں داری ہم بچ کے کہاں جاتے گر تیر خطا ہوتا

آؤ مٹا بھی دو خلشِ آرزوے قتل کیا اعتبار زندگیِ مستعار کا

اُن کو حالؔی بھی بلاتے تھے گھر اپنے مہماں دیکھنا آپ کی اور آپ کے گھر کی صورت

حالؔی غزل میں مبالغے سے بچتے ہیں اور دِلی واردات وکیفیات کا ایک لذّت انگیز احساس دلاتے ہیں۔ ان کی غزلوں میں ایک بڑی خصوصیت لہجے کا ٹھہراؤ اور نرمی ہے۔ الفاظ کا انتخاب بڑے محتاط ہوکر کرتے ہیں پھر ان الفاظ کی ترتیب سے جذبے اور احساس کی شدت کا اظہار کرتے ہیں:

اک عمر چاہیے کہ گوارا ہو نیشِ عشق رکھی ہے آج لذّتِ زخمِ جگر کہاں

بے قراری تھی سب اُمیدِ ملاقات کے ساتھ اب وہ اگلی سی درازی شبِ ہجراں میں نہیں

حالؔی نے اپنی نظموں کے ذریعے نیچرل شاعری کو فروغ دیا یہی فطرت پسندی ان کا بنیادی عنصر ہے۔حالؔی نے اپنی غزلوں میں بھی نیچرل فضا کو ملحوظ رکھا ہے۔غزلوں میں غیر رسمی اور بے تکلّف اندازِ بیاں سے نیچرل فضا پیدا کی ہے۔مثلاً:

برائی ہے رندوں میں بھی شیخ لیکن کہاں یہ برائی، کہاں وہ برائی
تقاضائے محبت ہے وگرنہ مجھے اور جھوٹ کا تم پر گماں ہو

حالؔی کے حالاتِ زندگی کچھ ایسے ہی رہے کہ وہ زندگی کی لذّتوں اور راحتوں سے مکمل طور پر استفادہ نہیں کر سکے۔ان کی قسمت میں زندگی کا ایک بڑا حصہ پریشانی ہی کے لئے وقف رہا۔۔وہ ہمیشہ مآل اندیشی میں کھوئے رہے۔وہی گومگو کی کیفیت ان کی غزل میں نمایاں نظر آتی ہے۔مثلاً:

دور ہو اے دلِ مآل اندیش! کھو دیا عمر کا مزا تونے
کس سے پیمانِ وفا باندھ رہی ہے بلبل کل نہ پہچان سکے گی گلِ تر کی صورت

خواجہ الطاف حسین حالؔی کی پوری زندگی قوم کی ہم دردی اور سماج کی فلاح و بہبود بلکہ شعری وادبی فلاح و بہبود میں گزری۔اس کا ذکر وہ ایک جگہ خود کرتے ہیں، لکھتے ہیں''باغِ جوانی کی بہار اگر چہ قابلِ دید تھی مگر دنیا کے مکروہات سے دَم لینے کی فرصت نہ ملی۔نہ خود آرائی کا خیال آیا نہ عشق و جوانی کی ہوا''اسی بات کو وہ شعر میں کہتے ہیں:

بہت کام لینے تھے جس دل سے ہم کو وہ صرفِ تمنا ہوا چاہتا ہے
نہ ملا کوئی غارتِ ایماں رہ گئی شرم پارسائی کی
دلِ بے درد سے کچھ کام لوں گا اگر فرصت ملی مجھ کو جہاں میں

خواجہ الطاف حسین حالؔی ایک بہترین غزل گو ضرور تھے مگر آپ کی نظم نگاری نے آپ کی غزل گوئی کی خوبیوں پر پردے ڈال دیے۔

03.05 خواجہ الطاف حسین حالؔی بحیثیتِ نظم نگار

خواجہ الطاف حسین حالؔی نے غزلیں بھی کہیں۔اس کے علاوہ انہوں نے مثنوی اور مرثیے بھی لکھے مگر جس چیز نے ان کی شہرت میں چار چاند لگائے وہ ان کی نظم نگاری تھی، جس کے وہ شہ سوار تھے۔انہوں نے حقیقت پسند نظم نگاری اور نیچرل شاعری کی روایت کا آغاز کیا۔ان کی حقیقت پسند نظم نگاری کے سلسلے کا آغاز اس دَور سے شروع ہوتا ہے، جب انہوں نے سرسید کے خیالات سے وابستگی اختیار کی۔سرسید کے استفادے اور مشورے کے نتیجے میں آپ نے ملّت کی زبوں حالی، اس کے تاب ناک ماضی اور روشن مستقبل کو موضوع بنایا اور اس طرح ایک شہرۂ آفاق تصنیف''مدّ وجزرِ اسلام''(مسدّس حالی) وجود میں آئی جو کہ اردو کی سب سے پہلی طویل نظم کا درجہ رکھتی ہے۔حالؔی نے طویل نظم نگاری کے ساتھ ساتھ اردو نظم کو نیچرل شاعری سے روشناس کرایا۔

انجمنِ پنجاب کے مشاعروں کے ذریعے موضوعاتی نظمیں لکھ کر حالؔی نے نیچرل شاعری کو فروغ دیا۔آبِ حیات کے مصنف محمد حسین آزادؔ نے بھی اس دَور میں موضوعاتی نظمیں لکھیں جس کے نتیجے میں فطرت اور مناظرِ قدرت کے موضوعات کو اردو شاعری میں وقعت حاصل

ہوگئی۔''مسدّسِ حالی''میں حالؔی کی شعر گوئی کے متعلق پیدا ہونے والی تبدیلیوں کو خصوصی طور پر محسوس کیا جا سکتا ہے۔جب آپ انجمنِ پنجاب سے وابستہ ہوئے تو کرنل ہالرائیڈ کے مشورے سے نظموں اور قومی شاعری کی طرف آپ کا رجحان ہوا۔انجمنِ پنجاب کے مشاعروں میں آپ نے نئے انداز کی نظمیں پیش کیں۔یہ نظمیں نئی ضرور تھیں لیکن ان میں قومی شعور اتنا گہرا اور رچا بسا نظر نہیں آتا جتنا کہ سرسید کی تحریک سے وابستہ ہوکر ان کی نظموں میں پیدا ہوجاتا ہے پھر بھی یہ دل چسپ ہیں۔

ان کے موضوعات عمومی نوعیت کے ہیں اور حالؔی کی شخصیت ان میں بھی پوری طرح بے نقاب ہے۔حالؔی کے دل میں حُبُّ الوطنی کا جو جذبہ تھا۔اس کے اثرات اس دَور کی نظموں میں بھی ملتے ہیں اور وطن کی محبت کا یہ انفرادی جذبہ کہیں کہیں اجتماعیت میں تبدیل ہوتا نظر آتا ہے۔حالؔی اس دَور میں اُمید کی خوشی اور اس کی اہمیت پر بھی روشنی ڈالتے ہیں۔مناظرِ فطرت سے بھی متاثر ہوتے ہیں۔اخلاقی موضوعات پر بھی طبع آزمائی کرتے ہیں لیکن اس دَور کی نظموں میں کوئی واضح نقطۂ نظر اور کوئی گہرا اجتماعی شعور کم ملتا ہے۔ان کے موضوعات میں وہ بات نہیں جو سرسید کی تحریک کے بعد ان کی نظموں میں پیدا ہوئی۔سرسید کی تحریک کے زیرِ اثر آنے کے بعد حالؔی نے جو نظمیں کہی ہیں ان میں نسبتاً شعور و احساس کی شدت زیادہ گہرائی سے ملتی ہیں۔ان میں اجتماعی نقطۂ نظر اور قومی شعور زیادہ واضح ہے۔افادیت کی تو ان میں ایک لہر سی دوڑی ہوئی نظر آتی ہے۔سرسید کی تحریک کے زیرِ اثر جو نظمیں حالؔی نے کہی ہیں ان کے عام موضوعات وہی ہیں جن کی طرف سرسید نے توجہ دلائی تھی۔ان میں ماضی کی روایات کا احساس بہت شدید ہے۔ان میں مسلمانوں کے گزشتہ کارناموں کا ذکر بار بار آتا ہے۔مٹی ہوئی عظمت کی کہانیاں بار بار دہرائی جاتی ہیں۔اسلامی تاریخ کے زرّیں اَدوار کی بنیادی خصوصیات کو بار بار پیش کیا جاتا ہے اور حالؔی ان سب کی یاد اس لئے تازہ کرتے ہیں کہ وہ قوم کے لئے مشعلِ راہ ثابت ہوں اور قوم ترقّی کی منزلوں پر گام زَن ہو سکے۔

حالؔی کی ان نظموں میں مسلمانوں کی زبوں حالی کے نقشے بھی ملتے ہیں اور اس زبوں حالی کو دُور کرنے کا پیغام بھی نظر آتا ہے۔حالؔی نے اپنی نظموں میں مذہب کے صحیح تصوّرات کو ذہن نشین کرانے کی کوشش کی ہے۔انہوں نے مذہب کو عقل سے ہم آہنگ کرنے کا درس دیا ہے۔دنیاوی زندگی میں مذہب کی جو اہمیت ہے اس کی طرف توجہ دلائی ہے۔ان کی نظموں میں معاشرتی زندگی کو بہتر بنانے کا احساس بھی موجود ہے۔اصلاح کی خواہش بھی ان میں چھپی ہوئی ہے۔ارتقا کا جذبہ بھی ان میں کارفرما ہے۔اخلاقی اقدار کی اہمیت ان میں نمایاں نظر آتی ہے۔علمی اور تعلیمی معاملات کا تذکرہ بھی ان میں ملتا ہے۔عورتوں کی بے بسی اور کس مپرسی پر بھی آنسو بہائے جاتے ہیں اور ان کی زندگی کو بہتر بنانے کے لئے ایک لائحہ عمل بھی پیش کیا جاتا ہے۔غرض یہ کہ اس زمانے کی زندگی کے جتنے بھی موضوعات تھے ان سب کی ترجمانی کسی نہ کسی صورت میں حالؔی نے اپنی نظموں میں ضرور کی ہے۔حالؔی کی نظموں کے موضوعات عصری نوعیت کے ہیں لیکن ان کی بڑائی کا راز اُنہی میں مضمر ہے۔حالؔی کے دَور کی تمام خصوصیات ان میں بے نقاب ہیں۔اس زمانے کی حالت،غور وفکر کا انداز،خیالات وتصوّرات،ذہنی وجذباتی رجحانات سب کچھ ان کے اندر موجود ہے اور جگہ جگہ آفاقی نوعیت کے موضوعات کی ترجمانی بھی ان نظموں میں ہوئی ہے۔

حالؔی کی نظموں کا تفصیلی مطالعہ کرنے کے بعد جس چیز پر نظر پڑتی ہے وہ یہ ہے کہ ان کی نظم نگاری کی ابتدا مغرب کے اثرات کے زیرِ سایہ لاہور میں ہوئی۔حالؔی بسلسلۂ ملازمت ۱۸۷۴ء میں لاہور آئے۔اس سے قبل وہ تقریباً ۸ سال تک شیفتؔہ کے ساتھ رہ چکے تھے اور ان کی صحبت سے حالؔی کو بڑا فائدہ ہوا۔ان کے ذوق کو سنوارنے میں شیفتؔہ کا بڑا حصہ ہے۔اس کا ذکر خود حالؔی نے کیا ہے۔

وہ لکھتے ہیں:

''درحقیقت مرزا کے مشورے اور اصلاح سے مجھے چنداں فائدہ نہیں ہوا جو نواب صاحب مرحوم کی صحبت سے ہوا۔ وہ مبالغے کو ناپسند کرتے تھے اور حقائقِ واقعات کے بیان میں لطف پیدا کرنا اور سیدھی سادی اور سچّی باتوں کو حُسنِ بیان سے دل فریب بنانا اسی کو انتہائی کمالِ شاعری سمجھتے تھے۔ چھچھورے اور بازاری الفاظ ومحاورات اور عامیانہ خیالات سے شیفتہ اور غالب دونوں متنفّر تھے۔''

حالی کا یہ اعتراف اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ غالب اور شیفتہ کی صحبتوں نے ان کے سامنے شعروشاعری کی صحیح اقدار کو پیش کیا تھا اور شاعری کا معیار وہ یہ سمجھتے تھے کہ اسے اصل کے مطابق ہونا چاہیے۔ اس کی بنیادیں حقائق پر استوار ہونی بہت ضروری ہیں۔ اگر اس کی بنیاد مبالغہ اور دوراز کار باتوں پر اُستوار ہوتی ہے تو وہ کسی کام کی نہیں اور تاثر کی کیفیت اس سے مفقود ہو جاتی ہے۔ یہ شعور لے کر حالی لاہور میں پہنچے۔ یہاں ایک ایسا ماحول ملا جس نے ان کے شعور کو کچھ اور جِلا بخشی۔

یہاں وہ مغرب کے زیرِ اثر آئے۔ ہر چند مغرب کے اثرات ایسے گہرے نہیں تھے کیوں کہ حالی کو انگریزی زبان پر عبور نہیں تھا۔ پھر بھی کرنل ہالرائیڈ کی علم دوستی اور ادب نوازی کے باعث ایسے حالات پیدا ہو گئے تھے، جن کا اثر ہونا لازمی تھا پھر بھی جو خدمت حالی کے سپرد ہوئی تھی اس نے بھی انہیں مغربی ادبیات سے روشناس کیا اور اس کی بنیادی خوبیوں سے وہ آشنا ہو گئے۔ اس وقت تک مغربی ادبیات اور افکار و خیالات سے دل چسپی لینے اور استفادہ کرنے کی ایک فضا پیدا ہو گئی تھی۔ سرسید احمد خاں ۱۸۷۲ء میں اپنا مشہور رسالہ ''تہذیب الاخلاق'' نکال چکے تھے جس کے سبب بقولِ حالی:

''مسلمانوں کے خیالات میں جو لٹریچر کا صحیح مذاق رکھتے تھے بہت جلد ایک انقلابِ عظیم پید اہو گیا، اردو، فارسی انشا پردازی کا قدیم طریقہ ان کی نظر میں نہایت نحیف اور سبک معلوم ہونے لگا اور اپنی شاعری کو وہ حقارت کی نظر سے دیکھنے لگے۔''

بہر حال حالی اس وقت مغرب سے متاثر ہوئے اور اس تحریک میں شریک ہو گئے جو مغرب کے زیرِ اثر مولانا محمد حسین آزاد کے ہاتھوں کرنل ہالرائیڈ کے ایما پر شروع ہوئی تھی اور جو مشاعرہ انجمنِ پنجاب کے زیرِ اہتمام قائم ہوا تھا اس کے لئے حالی نے چار نظمیں بھی کہی تھیں۔ یہ ان کی ابتدائی نظمیں تھیں۔

حالی نے ان نظموں کے شانِ نزول کے بارے میں لکھا ہے:

''۱۸۷۴ء میں جب کہ راقم پنجاب گورنمنٹ بک ڈپو سے متعلق تھا اور لاہور میں مقیم تھا۔ مولوی محمد حسین آزاد کی تحریک اور کرنل ہالرائیڈ ڈائریکٹر سررشتۂ تعلیم پنجاب کی تائید سے انجمنِ پنجاب نے ایک مشاعرہ قائم کیا تھا جو ہر مہینے ایک بار انجمنِ پنجاب کے مکان میں منعقد ہوتا تھا۔ اس مشاعرے کا مقصد یہ تھا کہ ایشیائی شاعری جو کہ در وبستِ عشق اور مبالغے کی جاگیر ہو گئی ہے اس کو جہاں تک ممکن ہو وسعت دی جائے اور اس کی بنیاد حقائق وواقعات پر رکھی جائے..... جدّت پسند طبقوں پر جن پر قدرِ مغربی انشا پردازی کے لئے اب تک کھلی تھی وہی ان کو لے اُڑی۔ بہت سے موزوں طبع اور بعض کہنہ مشق بھی جن پر قدیم شاعری کا رنگ چڑھ چکا

تھا،اس مشاعرے میں شریک ہونے لگے۔اگرچہ صحبت مدت تک جمی رہی لیکن راقم صرف چار جلسوں میں شریک ہونے پایا تھا کہ بسبب ناموافق آب وہوا کے لاہور سے تبدیل ہوکر دلّی چلا آیا۔ مجھے مغربی شاعری کے اصول سے نہ اس وقت کچھ آگاہی تھی اور نہ اب ہے۔ نیز میرے نزدیک مغربی شاعری کا پورا پورا تتبع ایک ایسی نامکمل زبان میں، جیسی کہ اردو ہے، ہو بھی نہیں سکتا۔ البتہ کچھ تو میری طبیعت مبالغہ اور اغراق سے بالطبع نفور تھی اور کچھ اس نئے چرچے نے اس نفرت کو زیادہ مستحکم کر دیا۔ اس بات کے سوا میرے کلام میں کوئی چیز ایسی نہیں ہے جس سے انگریزی شاعری کے تتبع کا دعویٰ کیا جا سکے یا اپنے قدیم طریقے کے ترک کا الزام عائد ہو۔''

(حالیؔ: دیباچہ مجموعۂ نظمِ حالیؔ)

اس بیان سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ حالیؔ نے یہ نظمیں ایک بدلتے ہوئے ماحول کے تقاضے کو پورا کرنے کے لئے ایک مخصوص اصلاحی تحریک کے زیرِ اثر لکھی ہیں۔ان نظموں میں براہِ راست مغرب کا گہرا اثر نہیں ہے لیکن بالواسطہ طور پر مغرب کے زیرِ اثر ضرور لکھی گئی ہیں اور ان میں موضوع اور اندازِ بیان دونوں اعتبار سے ایک جدّت نظر آتی ہے۔یہ نظمیں تعداد میں صرف چار ہیں لیکن ان میں ہر ایک رجحاناتِ جدید کی ترجمانی کرتی ہے۔ان کے موضوع متنوع ہیں لیکن جدّت کی خصوصیات ان سب میں مشترک ہیں اور یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اردو نظم نگاری کو ایک نئے راستے پر ڈالا ہے۔اس کو ایک نئی دنیا سے روشناس کیا ہے۔اردو شاعری میں ایک نئے باب کا افتتاح کیا ہے۔ ہمارے موضوع سے متعلق اس سلسلے کی سب سے پہلی نظم ''برکھا رُت'' ہے۔

اس نظم میں حالیؔ نے برسات کی مختلف کیفیات کا ذکر کیا ہے۔ابتدا میں برسات سے قبل گرمی کی جو شدّت ہوتی ہے اس کی حالت بیان کی گئی ہے اور گرمی کی ساری جزئیات کا تذکرہ کیا گیا ہے۔جان داروں کا تڑپنا، کہساروں کا تپنا، دریا کے پانی کا کھولنا، جنگل میں گرمی کی شدّت، باغوں کی ویرانی، جانوروں کی پریشانی، آندھیوں کی تندی، لُو کی شعلہ سامانی، انسانوں کی بے چینی، شہر کی کیفیت، بچوں کی کلکاریاں، ان سب کی تصویر حالیؔ نے بڑی خوبی سے کھینچی ہے۔اس نظم میں یہ تصویریں بذاتِ خود بھی اہمیت رکھتی ہیں اور اصل موضوع کے خدوخال اُبھارنے اور نمایاں کرنے میں بھی ان کو خاصا دخل ہے۔گرمی کے پس منظر کے بغیر برسات کی تصویر نمایاں نہیں ہو سکتی تھی۔اس لئے حالیؔ نے اس نظم کے ایک حصے میں گرمی کی کیفیت کا بیان اس قدر تفصیل سے کیا ہے چنانچہ اس میں واقعہ نگاری، منظر نگاری اور جزئیات نگاری کی خصوصیات پیدا ہو گئی ہیں۔چند اشعار کے مطالعے سے اس کا اندازہ ہوتا ہے:

گرمی سے تڑپ رہے تھے جان دار — اور دھوپ میں تپ رہے تھے کہسار
بھوبل سے سوا تھا ریگِ صحرا — اور کھول رہا تھا آبِ دریا
تھی لُوٹ سی پڑ رہی چمن میں — اور آگ سی لگ رہی تھی بن میں
سانڈے تھے بلوں میں مُنہ چھپائے — اور ہانپ رہے تھے چار پائے
رستوں میں سوار اور پیدل — سب دھوپ کے ہاتھ سے تھے بے کل

گھوڑوں کے نہ آگے اُٹھتے تھے پاؤں ملتی تھی کہیں جو روکھ کی چھاؤں
تھی سب کی نگاہ سوے افلاک پانی کی جگہ برستی تھی خاک
پنکھے سے نکلتی جو ہوا تھی وہ بادِ سموم سے سِوا تھی
بازار پڑے تھے سارے سنسان آتی تھی نظر نہ شکلِ انسان
چلتی تھی دکان جن کی دن رات بیٹھے تھے وہ ہات پر دھرے ہات
خلقت کا ہجوم کچھ اگر تھا یا پیاؤ پہ یا سبیل پر تھا
بچوں کا ہوا تھا حال بے حال کمہلائے ہوئے تھے پھول سے گال
آنکھوں میں تھا ان کا پیاس سے دَم تھے پانی کو دیکھ کرتے مَم مَم
ہر بار پکارتے تھے ماں کو ہونٹوں پہ تھے پھیرتے زباں کو
پانی دیا گر کسی نے لا کر پھر چھوڑتے تھے نہ مُنہ لگا کر

جزئیات نگاری کے ساتھ ساتھ ان اشعار میں مشاہدے کی تیزی اور احساس کی شدت بھی اپنے شباب پر نظر آتی ہے۔ نظم کے دوسرے حصے میں حالؔی نے اس پس منظر میں برسات کی آمد کا ذکر کیا ہے اور پُروا کی آمد، ابر کی کیفیت، بجلی کی چمک، گھنگھور گھٹاؤں کا عالم، باغوں کی ہریالی، درختوں کی شادابی، کوئل کی کوک، پپیہے کی پیہوں، مور کی چنگھاڑ، انسانوں کی مسرّت اور اس مسرّت سے سرشار ہو کر ان کی وارفتگی ان سب کو حالؔی نے آنکھوں کے سامنے اس طرح بے نقاب کر دیا ہے کہ اس عالم کی ایک فضا تیار ہو جاتی ہے اور پڑھنے والا اس فضا میں کھو سا جاتا ہے۔ چند اشعار کے مطالعے سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے:

برسات کا بج رہا ہے ڈنکا اک شور ہے آسماں پہ برپا
ہے ابر کی فوج آگے آگے اور پیچھے ہیں دَل کے دَل ہوا کے
ہیں رنگ برنگ کے رسالے گورے ہیں کہیں، کہیں ہیں کالے
ہے چرخ پہ چھاؤنی سی چھاتی ایک آتی ہے فوج ، ایک جاتی
جاتے ہیں مہم پہ کوئی جانے ہم رَاہ ہیں لاکھوں توپ خانے
توپوں کی ہے جب کہ باڑ چلتی چھاتی ہے زمین کی دہلتی
پھولوں سے پٹے ہوئے ہیں کہسار دولہا سے بنے ہوئے ہیں اشجار
پانی سے بھرے ہوئے ہیں جل تھل ہے گونج رہا تمام جنگل
کرتے ہیں پپیہے پیہو پیہو اور مور چنگھاڑتے ہیں ہر سو
کوئل کی ہے کوک جی لُبھاتی گویا کہ ہے دل میں بیٹھی جاتی
جاتا ہے کوئی ملار گاتا ہے دیس میں کوئی گنگناتا
سرون کوئی گارہا ہے بیٹھا چھیڑا ہے کسی نے ہیر رانجھا

ان اشعار میں صرف برسات کی کیفیت کا بیان ہی نہیں بلکہ احساس کی شدت نے اس میں ایک مخصوص جذباتی کیفیت پیدا کر دی ہے جس کی نوعیت انسانی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس حصے میں نفسیاتی حقیقت نگاری کا رنگ بہت نمایاں ہے۔ حالی اس حصے میں برسات کے عام مناظر کو ضرور پیش کرتے ہیں لیکن ساتھ ہی ساتھ ان مناظر کا جو فطری ردِّعمل عام انسانوں کے جذبات و احساسات پر ہوتا ہے اس کو خاص طور پر سامنے رکھتے ہیں۔ اس کی دل کشی کا راز اسی خصوصیت میں مضمر ہے۔ مذکورہ بند میں حالؔی نے برسات کے موسم کی تعریف کی ہے اور اس بات کو واضح کیا ہے کہ برسات کا موسم دنیا کو نئی زندگی بخشتا ہے، باغوں پر نکھار آتا ہے، کھیتیاں نہال ہوتی ہیں، طاؤس ناچنے لگتے ہیں، کوئل کوکنے لگتی ہے، ہواؤں میں مستی کا رنگ آجاتا ہے، دریا اُمنڈنے لگتے ہیں، زمین سونا اُگلنے لگتی ہے، لوگوں کے دلوں میں اُمنگیں جاگ اُٹھتی ہیں، باغوں میں جھولے پڑ جاتے ہیں اور نوجوان اٹھکھیلیاں کرنے لگتے ہیں۔ نوجوان لڑکیوں کے جھولا جھولنے کا منظر حالی نے کس خوبی سے پیش کیا ہے:

کھم باغوں میں جا بجا گڑے ہیں جھولے ہیں کہ سو بہ سو پڑے ہیں
کچھ لڑکیاں بالیاں ہیں کم سِن جن کے ہیں یہ کھیل کود کے دن
ہیں پھول رہی خوشی سے ساری اور جھول رہی ہیں باری باری
جب گیت ہیں سارے مِل کے گاتی جنگل کو ہیں سر پہ وہ اُٹھاتی
اک سب کو کھڑی جھلا رہی ہے اک گرنے سے خوف کھا رہی ہے
ہے ان میں کوئی ملار گاتی اور دوسری پینگ ہے چڑھاتی
گاتی ہے کبھی کوئی ہنڈولا کہتی ہے کوئی بدیسی ڈھولا
اک جھولے سے وہ گری ہے جا کر سب ہنستی ہیں قہقہے لگا کر

زندگی کے انسانی پہلوؤں کا کتنا شدید احساس یہاں نظر آتا ہے۔ حالؔی روزمرّہ کی زندگی کی عام باتوں کا کتنا گہرا شعور رکھتے تھے۔ حالؔی نے ان مناظر کی ایسی تصویر کشی کی ہے کہ ان سے قبل ان کی مثال سوائے نظیرؔ اکبر آبادی کے اردو نظم میں کہیں اور نہیں مل سکتی۔ حالؔی کو منظر نگاری پر بڑی قدرت حاصل ہے اور یہ سب ان کے شدید احساس، گہرے شعور اور وسیع تجربے کے نتائج ہیں۔

''برکھا رُت'' کو حالؔی نے ایک بڑے جذباتی انداز میں ختم کیا ہے۔ لیکن ان کا یہ جذباتی انداز پوری طرح نفسیاتی ہے۔ حالؔی جب اس نظم میں اس بات کو پیش کرتے ہیں کہ برسات کے موسم میں وطن کی یاد زیادہ آتی ہے۔ برسات کے ہوا کے جھونکے اگرچہ اس کے دل کو فرحت اور روح کو تازگی بخشتے ہیں لیکن برسات کی یہ کیفیت اس کی آنکھوں کے سامنے ماضی کی رنگین اور دل موہ لینے والی یادوں کو سامنے لا کر کھڑا کر دیتی ہے اور اس کے دل میں اشکوں کی لہریں اُٹھنے لگتی ہیں۔ وہ بے کل اور بے چین ہو جاتا ہے۔ آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ جاتی ہے۔ کبھی گنگناتا ہے کبھی خوشی میں آکے گانے لگتا ہے۔ اس گیت کا موضوع وطن کی صحبتوں کی یاد ہوتی ہے۔ اس کی یہ فریاد دل میں نشتر کی طرح چُبھنے لگتی ہے اور سننے والے دل پکڑ کر رہ جاتے ہیں:

ابر اتنے میں اک طرف سے اُٹھا اور رنگ سا کچھ ہوا کا بدلا
برق آکے تڑپنے لگی پیہم اور پڑنے لگی پھوار کم کم
آنے جو لگے ہوا کے جھونکے تھے جتنے سفر کے رنج بھولے

سامان ملے جو دل لگی کے یاد آئے مزے کبھی کبھی کے
دیکھے کوئی اُس گھڑی کا عالم وہ آنسوؤں کی جھڑی کا عالم
وہ آپ ہی آپ گنگنانا اور جوش میں کبھی یہ گانا
جب سبزہ و گل ہیں لہلہاتے صحبت کے مزے ہیں یاد آتے
ہم تم یوں ہات میں دیے ہات پھرتے تھے ہوائیں کھاتے دن رات
جب پیڑ سے آم ہے ٹپکتا میں تم کو اِدھر اُدھر ہوں تکتا
آخر نہیں پاتا جب کسی کو دیتا ہوں دعائیں بے کسی کو
رُت آم کی آئے اور نہ ہوں یار جی اپنا ہے ایسی رُت سے بے زار
تم بن جو ہے بوند تن پہ پڑتی چنگاری سی ہے بدن پہ پڑتی
ہے سرد ہوا بدن کو لگتی پر دل میں ہے آگ سی سلگتی

اگر چہ حالی نے ان اشعار میں اپنی، ذاتی ذہنی اور جذباتی کیفیت کا اظہار کیا ہے لیکن اس کی نوعیت آفاقی نظر آتی ہے۔ برسات کے موسم کو دیکھ کر غریب الوطنی کے عالم میں حالی پر جو ذہنی و جذباتی کیفیت طاری ہوتی ہے وہ ہر انسان پر طاری ہوسکتی ہے بلکہ ہوتی ہے۔ حالی کی بڑائی اس میں ہے کہ انہوں نے اس کیفیت کے اظہار کو ایک آفاقی رنگ دیا ہے۔ حالی کی یہ پہلی نظم ہے لیکن اس میں وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جو کہ ایک اعلیٰ پایے کی نظم میں ہونی چاہئیں۔ اس کا موضوع نیا نہیں ہے لیکن اس کے باوجود اس میں ایک اچھوتا پن ہے۔ سوائے نظیر اکبر آبادی کے حالی سے قبل اس موضوع پر کسی نے اس طرح طبع آزمائی نہیں کی۔ اس ملک کے رہنے والوں کی زندگی میں اس موضوع کی ایک جذباتی اہمیت ہے۔ حالی نے اس جذباتی اہمیت کو پیشِ نظر رکھا ہے لیکن اس کا عقلی اور افادی پہلو بھی ان کی نظروں سے اوجھل نہیں ہوا ہے۔ انہوں نے اس نظم میں اس کی طرف جگہ جگہ توجہ دی ہے۔ انسانی زندگی پر ذہنی اور جذباتی اعتبار سے موسموں کے جو اثرات پڑتے ہیں حالی نے اس کے گہرے شعور کا اظہار اس نظم کے ذریعے کیا ہے۔ پھر منظر نگاری، واقعہ نگاری، جذبات نگاری اور جزئیات نگاری کی حقیقت و واقعیت سے بھرپور جو تصویریں انہوں نے اس نظم میں پیش کی ہیں ان سے حالی کی فنّی سلیقہ شعاری کا اندازہ ہوتا ہے۔

حالی کی نظموں کا جوہر ان کی افادیت ہے لیکن اس افادیت کو پیش کرنے کے سلسلے میں ان کے یہاں فلسفیانہ گہرائی پیدا نہیں ہوتی۔ حالی فلسفی اور مفکّر نہیں تھے لیکن حالات کے نبّاض اور مزاج داں ضرور تھے۔ ان کے یہاں احساس کی شدت تھی۔ یہی وجہ ہے کہ جذبات ان پر غالب آجاتے تھے۔ فلسفہ اس احساس کی شدّت اور جذباتی انداز کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ چنانچہ حالی کی نظموں میں فلسفیانہ گہرائی کے بجائے احساس کی شدّت سے پیدا ہونے والا سوز و گداز نمایاں ہے۔ وہ حالات کو صحیح سمجھتے ہیں، ان کی اہمیت بھی ذہن نشین کرا دیتے ہیں لیکن ان حالات کا فلسفیانہ تخیل اور منطقی تجزیہ ان کے یہاں نہیں ہوتا۔ ان حالات کو بہتر بنانے کی طرف وہ ضرور توجہ کرتے ہیں بلکہ یہ کہنا بے جا نہیں کہ ان کی ساری نظمیں اسی خیال کو سامنے رکھ کر لکھی گئی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ افادی پہلو اُن میں بہت نمایاں ہے۔ حالی کی شخصیت ان میں پوری طرح بے نقاب ہے وہ جو کچھ سوچتے تھے، جو کچھ محسوس کرتے تھے، جو بھی ان کے اصول و نظریات تھے، ان سب کا عکس ان میں نظر آتا ہے۔

حالیؔ کا زاویۂ نظر عصری اور اصلاحی تھا اس لئے ان کی نظمیں بھی اُنہی خصوصیات کی حامل ہیں۔ان میں زندگی سنوارنے اور اُسے بہتر بنانے کا احساس زیادہ ہے۔یہ نظمیں اس دَور میں ایک تجربہ تھیں لیکن انہوں نے ایک ایسی فضا قائم کی جس نے اردو شاعری کی روایات میں ایک نمایاں حیثیت حاصل کرلی۔ان کی نظموں سے اردو شاعری میں جدّت کی ایک تحریک شروع ہوتی ہے اور یہ جدّت اردو شاعری میں اس طرح گھر کرلیتی ہے کہ اس کا جزو بن جاتی ہے۔حالیؔ کی یہ جدّت اردو شاعری میں ایک کامیاب تجربہ ہے۔اس تجربے نے اردو نظم میں نئی فضائیں پیدا کی ہیں۔یہ جدّت حالیؔ کے ذہن کی اختراع نہیں تھی بلکہ بدلتے ہوئے حالات کا تقاضہ تھی۔زندگی کا قافلہ اس وقت جس موڑ پر آ گیا تھا اس کا تقاضا یہ تھا کہ اردو شاعری میں جدید طرز کی نظموں کی ابتدا کی جائے کیوں کہ نئے مسائل قدیم اصناف میں نہیں آسکتے تھے۔

ان مسائل میں وسعت تھی، پیچیدگی تھی۔اس لئے ان کو بیان کرنے کے لئے بھی کچھ وسعت کی ضرورت تھی۔حالیؔ ان مسائل کا گہرا شعور رکھتے تھے۔اس لئے ان مسائل کو انہوں نے اپنا موضوع بنایا اور ان کے فن کارانہ شعور نے اپنے اظہار کے لئے نئے سانچے استعمال کیے۔مسدّس، مخمّس، مربّع، مثنوی اور ترکیب بند ان تمام اصناف کو اپنے خیالات کے اظہار کے لئے استعمال کیا ہے۔اس سے قبل اردو شاعری میں ان اصناف کا استعمال ضرور ملتا ہے۔نظیرؔ اکبرآبادی اس میں پیش پیش رہے ہیں لیکن حالیؔ نے ان اصناف کو(جو عرصہ ہوا بھلائی جاچکی تھیں)ازسرِ نَو زندگی بخشی اور اس طرح ان کا استعمال کیا کہ وہ سب ان کی اپنی ہوگئیں۔حالیؔ نے انہیں اپنایا اور انہوں نے حالیؔ کو اپنا لیا۔

03.06 خواجہ الطاف حسین حالیؔ کی نظم نگاری کی خصوصیات

حالیؔ نے اپنے عہد میں دو مختلف کیفیات کا احساس کیا۔غدر سے پہلے اور بعد کے حالات نے ان کی شاعری میں بہت تبدیلی پیدا کردی۔بلاشبہ اردو شاعری میں وطنی وقومی شاعری کا آغاز آپ کی نظم گوئی سے ہوتا ہے۔آپ کا سب سے بڑا شاہ کار یہ ہے کہ آپ نے ''مسدّسِ حالی'' پیش کرکے قوم کے شعور کو بیدار کیا اور اُس کے ضمیر کو جھنجھوڑا۔اس کے بعد مثنوی ''حُبِّ وطن'' کی وجہ سے اردو شاعری میں وطنی نظموں کا آغاز ہوا۔مثنوی کی صنف کو حالاتِ حاضرہ سے وابستہ کیا اور شخصی مرثیے کے ذریعے اردو مرثیہ نگاری میں ایک بہت بڑی تبدیلی پیدا کی۔

حالیؔ کی نظم نگاری کی امتیازی خصوصیات الفاظ کی بندش، خیالات کی پیش کش، اظہار کی تازگی اور زبان کا برجستہ اور برمحل استعمال ہے۔اس طرح کالب ولہجہ اور انداز نظمیہ شاعری میں حالیؔ سے شروع ہوا اور نہ اُن سے پہلے ہی نہیں بلکہ بعد میں بھی اردو شاعری مبالغہ اور غیرحقیقی واقعات سے آلودہ تھی۔آپ نے اردو شاعری کو حقیقت پسندی سے وابستہ کرتے ہوئے نظم کو زندگی کے حقائق کے اظہار کا سلیقہ عطا کیا۔آپ کے دَور سے ہی نظمیہ شاعری کی اس روایت کا آغاز ہوا ہے جسے حقیقت پسندی اور مسائلی شاعری وغیرہ کا نام دیا جاتا ہے۔حالیؔ نے نظمیہ شاعری کو گلے شکوے سے پاک کرکے فطری جذبات اور احساسات کی پیش کش کے لئے سازگار ماحول تیار کیا۔اس لئے نظمیہ شاعری میں حالیؔ کی امتیازی خصوصیات کو صرفِ نظر نہیں کیا جاسکتا۔

﴿۱﴾ **نظموں کی لفظیات:** حالیؔ نے اپنی ابتدائی غزلوں میں روایتی لفظیات کی پیروی کی تھی اور مرزا غالبؔ کی طرح پیچیدہ زبان اور لفظیات استعمال کرتے رہے لیکن سرسید سے ملنے کے بعد آپ کی شاعری میں ایک بہت بڑی تبدیلی ظاہر ہوتی ہے وہ یہ کہ انہوں نے اپنی شاعری میں سادہ الفاظ کو جگہ دینے کی کامیاب کوشش کی۔دَورِ حالیؔ میں عربی اور فارسی الفاظ کا چلن عام تھا۔سنسکرت، ہندی اور بھاشا کے الفاظ

اگر کوئی اپنے کلام میں استعمال کر لے تو اسے بے ادبی تصوّر کیا جاتا تھا مگر حالؔی نے اپنی نظموں میں لاتعداد بھاشا، ہندی اور سنسکرت کے الفاظ استعمال کر کے اردو ادب میں نہ صرف نئی لفظیات کا اضافہ کیا بلکہ آنے والی نسلوں کو دوسری زبانوں سے استفادے کے اصول بھی سکھائے۔

سرسید کی رفاقت کے تحت حالؔی کے خیالات میں بڑی وسعت پیدا ہوئی۔ انہوں نے اردو زبان میں نہ صرف سنسکرت اور بھاشا کے الفاظ شامل کیے بلکہ جہاں تک ممکن ہو سکا وہاں تک انگریزی الفاظ کے استعمال پر بھی خصوصی توجہ دی۔ تاہم انہوں نے شاعری میں انگریزی الفاظ استعمال نہیں کیے۔ ان کی نثر میں انگریزی الفاظ کا استعمال زیادہ نظر آتا ہے۔ حالؔی نے ''حیاتِ جاوید'' میں بے شمار انگریزی لفظیات کا استعمال کیا ہے۔ البتہ ان کی نظموں میں ہندی کے سادہ اور عام فہم الفاظ کی کثرت دکھائی دیتی ہے۔ اُن کی اس روش پر اہلِ لکھنؤ نے اعتراض بھی کیا مگر انہوں نے اس اعتراض کی کوئی پروا نہیں کی بلکہ اپنا کام پورے انہماک سے کرتے رہے۔

﴿۲﴾ نظموں میں ارتقائی عمل: نظمیہ شاعری میں کسی ایک خیال کو پیشِ نظر رکھ کر اس کے تحت مختلف بند تحریر کرنا جس میں خیال کا ربط و تسلسل قائم رہے تو ایسی شاعری کو نظم کہتے ہیں۔ حالؔی سے قبل دکنی دَور کی مثنویوں میں خیال کے تسلسل کی وجہ سے نظموں کی سی کیفیت پیدا ہوتی تھی لیکن حالؔی کی شعر گوئی کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے اردو نظم کو ارتقائی صورت سے وابستہ کر دیا۔ ان کی نظموں میں نہ صرف تازگی کا عمل دکھائی دیتا ہے بلکہ نظم کی تحریر کے دوران وہ ارتقائی عمل کے وسیلے کو بھی کام میں لاتے ہیں۔ ارتقائی عمل سے مراد نظم کا ایسا انداز ہے جس سے پہلے تمہید باندھی جاتی ہے پھر موضوع پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے اسے نقطۂ عروج پر پہنچا دیا جاتا ہے اور آخر میں نظم کے انجام کی صورت نکل آتی ہے۔ اس تمام کیفیت کو نظم کا ارتقائی عمل کہا جاتا ہے۔ اردو میں نظم نگاری کے دوران اس قسم کے ارتقائی عمل کو استعمال کرنے والے شاعروں میں مولانا حالؔی اوّلیت کا درجہ رکھتے ہیں۔ ان کی تمام نظموں کا مطالعہ کیا جائے تو ان میں ارتقائی عمل، تمہید، موضوع کا احاطہ، نقطۂ عروج اور انجام سے وابستہ دکھائی دیتا ہے جو اس بات کا کھلا ثبوت ہے کہ حالؔی اپنی نظموں میں ارتقائی عمل کو بروے کار لاتے ہیں۔

﴿۳﴾ نظموں کے موضوعات: حالؔی کو اردو کے نیچرل شاعر کا درجہ دے کر عام طور پر یہ تصوّر کیا جاتا ہے کہ حالؔی نے صرف فطرت پرستی پر ہی نظمیں لکھی ہیں۔ ایسا تصوّر ایک خام خیال کی نشان دہی کرتا ہے کیوں کہ حالؔی کی شاعری میں مختلف موضوعات ہیں۔ انہوں نے ملی، قومی، معاشی، معاشرتی اور سیاسی موضوعات کو ہی اپنی شاعری کا وسیلہ نہیں بنایا بلکہ سماجی ناانصافی، نابرابری، عورت کے حقوق کی پامالی، اخلاقی گراوٹ اور قوم کی تعلیمی پسماندگی پر بھی نظمیں تحریر کیں۔ حالؔی ایک ایسے نظم گو شاعر ہیں جنہوں نے نظم کے موضوعات کو ایک نیا انداز دیا اور اپنی نظموں کو اپنے دَور کے سماج کا عکاس بنا دیا۔ یہ کیفیت سب سے پہلے حالؔی کی نظموں میں ہی دکھائی دیتی ہے۔ وہ اپنی مثنویوں، نظموں، شخصی مرثیوں اور شہر آشوب کے ذریعے قدرتی مناظر کے ساتھ ساتھ اپنے زمانے کے وطنی، ملی، سماجی اور معاشرتی مناظر کی نمائندگی کرتے ہیں۔ ان کی شاعری میں مظاہرِ کائنات کے علاوہ انسان کے بنائے اصول و قوانین اور طرزِ زندگی بھی نظموں کے موضوعات میں شامل ہیں۔ یہ اس بات کا کھلا ثبوت ہے کہ حالؔی کی شاعری اور نظموں کے موضوعات محدود ہونے کے باوجود بھی اس دَور کے تمام عناصر کی عکاسی کرتے ہیں۔

﴿۴﴾ نظموں میں قدیم و جدید کا امتزاج: اگرچہ حالؔی پابند نظم کے شاعر ہیں اور موضوعات بھی محدود ہیں مگر ان میں تازگی ہے، وقت کی پکار ہے، عصری تقاضے اور ضروریات ہیں۔ اُن کی نظموں میں اکثر خطیبانہ رنگ جھلک کر سامنے آجاتا ہے۔ حالؔی کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے نظم کو بیانیہ شاعری سے قریب کر کے قدیم اور جدید کے امتزاج کی کامیاب کوشش کی ہے۔ مرثیے کی صنف واقعاتِ کربلا کی حد تک

محدود تھی۔اس قدیم انداز کو جدید انداز سے ہم آہنگ کرتے ہوئے حاؔلی نے مرثیے کی صنف کو شخصی مرثیوں کی جہت عطا کی۔ یہ اردو شاعری کو حاؔلی کی دین نہیں بلکہ موؔمن اور غاؔلب سے شخصی مرثیوں کا آغاز ہوتا ہے۔

اردو مثنوی کے موضوعات بھی اب تک بندھے ٹکے تھے۔حاؔلی نے مثنوی کو نئے نئے موضوعات سے روشناس کروایا۔اس کے بعد مثنوی جیسی روایتی صنف حاؔلی کے کلام میں داخل ہوکر ایک زندہ صنف کا درجہ حاصل کر لیتی ہے۔مولانا حاؔلی نے نعتیہ قصیدے کے علاوہ دوسرے دو ایک قصیدے بھی لکھے۔فطری طور پر انہیں قصیدہ سے کوئی لگاؤ نہیں تھا۔مقدمہ میں تو انہوں نے قصیدے کی مذمت کی ہے۔ اُسلوبِ سخن میں بھی حاؔلی نے غیر شعوری طور پر بڑی تبدیلیاں کی ہیں۔انہوں نے زبان کو سلاست اور سادگی عطا کی۔صنعتوں کے استعمال اور تکلفات سے زبان کو آزاد کیا۔ ہندی اور انگریزی کے وہ الفاظ جو بول چال میں شامل ہیں، بے محابہ استعمال کیے۔حاؔلی کی شاعری میں یہ موضوعات اور لسانی تبدیلیاں منصوبہ بند طریقے سے شامل ہوتی ہیں۔

03.07 نظم ''برکھارُت'' متن

گرمی کی تپش بُجھانے والی　　سردی کا پیام لانے والی
قدرت کے عجائبات کی کان　　عارف کے لئے کتابِ عرفان
وہ شاخ و درخت کی جوانی　　وہ مور وہ ملخ کی زندگانی
وہ سارے برس کی جان ، برسات　　وہ کون ؟ خدا کی شان برسات
آئی ہے بہت دعاؤں کے بعد　　اور سیکڑوں التجاؤں کے بعد
وہ آئی تو آئی جان میں جان　　سب تھے کوئی دن کے ورنہ مہمان
گرمی سے تڑپ رہے تھے جان دار　　اور دھوپ میں تپ رہے تھے کہسار
بھوبل سے سوا تھا ریگِ صحرا　　اور کھول رہا تھا آبِ دریا
تھی لوٹ سی پڑ رہی چمن میں　　اور آگ سی لگ رہی تھی بَن میں
سانڈے تھے بلوں میں مُنہ چھپائے　　اور ہانپ رہے تھے چار پائے
تھیں لومڑیاں زباں نکالے　　اور لُو سے ہرن ہوئے تھے کالے
چیتوں کو نہ تھی شکار کی سُدھ　　ہرنوں کو نہ تھی قطار کی سُدھ
تھے شیر پڑے کچھار میں سُست　　گھڑیال تھے رُودبار میں سُست
ڈھوروں کا ہوا تھا حال پتلا　　بیلوں نے دیا تھا ڈال کندھا
بھینسوں کے لہو نہ تھا بدن میں　　اور دودھ نہ تھا گئو کے تھن میں
گھوڑوں کا چُھٹا تھا گھاس دانہ　　تھا پیاس کا اُن پہ تازیانہ
گرمی کا لگا ہوا تھا بھبکا　　اور انس نکل رہا تھا سب کا

طوفان تھے آندھیوں کے برپا اُٹھتا تھا بگولے پر بگولا
آرے تھے بدن پہ لُو کے چلتے شعلے تھے زمین سے نکلتے
تھی آگ کا دے رہی ہوا کام تھا آگ کا نام مفت بدنام
رستوں میں سوار اور پیدل سب دھوپ کے ہاتھ سے تھے بےکل
گھوڑوں کے نہ آگے اُٹھتے تھے پاؤں ملتی تھی کہیں جو روکھ کی چھاؤں
تھی سب کی نگاہ سوے افلاک پانی کی جگہ برستی تھی خاک
پنکھے سے نکلتی جو ہوا تھی وہ بادِ سموم سے سوا تھی
بجھتی نہ تھی آتشِ درونی لگتی تھی ہوا سے آگ دونی
سات آٹھ بجے سے دن چھپے تک جان داروں پہ دھوپ کی تھی دستک
ٹٹی میں تھا دن گنواتا کوئی تہ خانے میں مُنہ چھپاتا کوئی
بازار پڑے تھے سارے سنسان آتی تھی نظر نہ شکلِ انسان
چلتی تھی دکان جن کی دن رات بیٹھے تھے وہ ہات پر دھرے ہات
خلقت کا ہجوم کچھ اگر تھا یا پیاؤ پہ یا سبیل پر تھا
تھا شہر میں قحطِ آدمی زاد سلطان کا اک کنواں تھا آباد
پانی سے تھی سب کی زندگانی میلا تھا وہیں جہاں تھا پانی
تھیں برف پہ نیتیں لپکتی فالودے پہ رال تھی ٹپکتی
پھل پھول کی دیکھ کر طراوت پاتے تھے دل و جگر طراوت
کُنجڑوں کی وہ بولیاں سہانی بھر آتا تھا سن کے مُنہ میں پانی
تھے جو خفقانی اور مراقی گرمی سے نہ تھا کچھ ان میں باقی
کھانے کا نہ تھا انہیں مزا کچھ آٹھ آٹھ پہر نہ تھی غذا کچھ
بن کھائے کئی کئی دن اکثر رہتے تھے فقط ٹھنڈائیوں پر
شب کٹتی تھی ایڑیاں رگڑتے مر پیٹ کے صبح تھے پکڑتے
اور صبح سے شام تک برابر تھاالعطش العطش زباں پر
بچوں کا ہوا تھا حال بے حال کمہلائے ہوئے تھے پھول سے گال
آنکھوں میں تھا اُن کا پیاس سے دَم تھے پانی کو دیکھ کرتے مَم مَم
ہر بار پکارتے تھے ماں کو ہونٹوں پہ تھے پھیرتے زباں کو

پانی دیا گر کسی نے لاکر پھر چھوڑتے تھے نہ مُنہ لگا کر
بچے ہی نہ پیاس سے تھے مضطر تھا حال بڑوں کا اُن سے بدتر
تخصیص تھی کچھ نہ میری تیری پانی سے نہ تھی کسی کو سیری
کل شام تلک تو تھے یہی طَور پر رات سے ہے سماں ہی کچھ اور
پُروا کی دہائی پھر رہی ہے پچھوا سے خدائی پھر رہی ہے
برسات کا بج رہا ہے ڈنکا اک شور ہے آسماں پہ برپا
ہے ابر کی فوج آگے آگے اور پیچھے ہیں دَل کے دَل ہوا کے
ہیں رنگ برنگ کے رسالے گورے ہیں کہیں ، کہیں ہیں کالے
ہے چرخ پہ چھاؤنی سی چھاتی ایک آتی ہے فوج ، ایک جاتی
جاتے ہیں مہم پہ کوئی جانے ہم راہ ہیں لاکھوں توپ خانے
توپوں کی ہے جب کہ باڑ چلتی چھاتی ہے زمین کی دہلتی
مِینہ کا ہے زمیں پر دڑیڑا گرمی کا ڈبو دیا ہے بیڑا
بجلی ہے کبھی جو کوند جاتی آنکھوں میں ہے روشنی سی آتی
گھنگھور گھٹائیں چھارہی ہیں جنت کی ہوائیں آرہی ہیں
کوسوں ہے جدھر نگاہ جاتی قدرت ہے نظر خدا کی آتی
سورج نے نقاب لی ہے مُنہ پر اور دھوپ نے تہ کیا ہے بستر
باغوں نے کیا ہے غسلِ صحت کھیتوں کو ملا ہے سبز خلعت
سبزہ سے ہے کوہ و دشت معمور ہے چار طرف برس رہا نور
بٹیا ہے نہ ہے سڑک نمودار اٹکل سے ہیں راہ چلتے رہوار
ہے سنگ و شجر کی ایک وردی عالم ہے تمام لاج وردی
پھولوں سے پٹے ہوئے ہیں کہسار دولہا سے بنے ہوئے ہیں اشجار
پانی سے بھرے ہوئے ہیں جل تھل ہے گونج رہا تمام جنگل
کرتے ہیں پیہے پیہو پیہو اور مور چنگھاڑتے ہیں ہر سُو
کوئل کی ہے کوک جی لبھاتی گویا کہ ہے دل میں بیٹھی جاتی
مینڈک جو ہیں بولنے پہ آتے سنسار کو سر پہ ہیں اُٹھاتے
سب خوان کرم سے حق کے ہیں سیر پانی میں مگر ، کچھار میں شیر

زردار ہیں اپنے مال میں مست — قلانچ ہیں اپنی کھال میں مست
ابر آیا ہے گھِر کے آسماں پر — کلمے ہیں خوشی کے ہر زباں پر
مسجد میں ہے وردِ اہلِ تقویٰ — یـــا رَبِّ لَـــنَـــا وَلا عَـــلَـیـــنـــا
مندر میں ہے ہر کوئی یہ کہتا — کرپا ہوئی تیری میگھ راجا!
کرتے ہیں گرو ، گرو گرنتھی — گاتے ہیں بھجن کبیر پنتھی
جاتا ہے کوئی ملار گاتا — ہے دیس میں کوئی گنگناتا
بھنگی ہیں نشے میں گاتے پھرتے — اور بانسریاں بجاتے پھرتے
سرون کوئی گا رہا ہے بیٹھا — چھیڑا ہے کسی نے ہیر رانجھا
رکھشک جو بڑے ہیں جین مت کے — ڈھکنے ہیں دِیوں پہ ڈھکتے پھرتے
کرتے ہیں وہ یوں جیوں کی رکھیا — تا جل نہ بجھے کوئی پتنگا
ہیں شکر گزار تیرے برسات! — انسان سے لے کے تا جمادات
دنیا میں بہت تھی چاہ تیری — سب دیکھ رہے تھے راہ تیری
تجھ سے ہے کھُلا یہ رازِ قدرت — راحت ملتی ہے بعدِ کُلفت
گلشن کو دیا جمال تو نے — کھیتی کو کیا نہال تو نے
طاؤس کو ناچنا بتایا — کوئل کو الاپنا سکھایا
جب مور ہے ناچنے پہ آتا — آپے سے ہے اپنے گزرا جاتا
کوئل کو نہیں قرار اک پل — ایسی کوئی تو نے کوک دی کل
شب بھر میں ہوا سماں دِگر گوں — کیا پڑھ دیا آکے تو نے افسوں
سوئے تو اساڑھ کا عمل تھا — اُٹھے تو سماں ہے ماہ کا سا
لاہور میں شب ہوئی تھی لیکن — کشمیر میں پہنچے جب ہوا دن
امرت سا ہوا بھر دیا کچھ — اک رات میں کچھ سے کر دیا کچھ
دریا تجھ بن سسک رہے تھے — اور بن تری راہ تک رہے تھے
دریاؤں میں تو نے ڈال دی جان — اور تجھ سے بنوں کو لگ گئی شان
جن جھیلوں میں کل تھی خاک اُڑتی — ملتی نہیں آج تھاہ اُن کی
جو دانے تھے خاک میں پریشان — سب آگے چڑھائے تو نے پروان

دولت جو زمین میں تھی مخفی آگے ترے اُس نے سب اُگل دی
پڑے تھے ڈلاؤ جس زمیں پر واں سبزۂ گل ہیں جلوہ گستر
جن پودوں کو کل تھے ڈھور چرتے باتیں ہیں وہ آسماں سے کرتے
جن باغوں میں اُڑتے تھے بگولے واں سیکڑوں اب پڑے ہیں جھولے
تھے ریت کے جس زمیں پہ انبار ہے بیر بہٹیوں سے گل نار
سُھم باغوں میں جابجا گڑے ہیں جھولے ہیں کہ سو بہ سو پڑے ہیں
کچھ لڑکیاں بالیاں ہیں کم سِن جن کے ہیں یہ کھیل کود کے دن
ہیں پھول رہی خوشی سے ساری اور جھول رہی ہیں باری باری
جب گیت ہیں سارے مل کے گاتی جنگل کو ہیں سر پہ وہ اُٹھاتی
اک سب کو کھڑی جُھلا رہی ہے اک گرنے سے خوف کھا رہی ہے
ہے ان میں کوئی ملار گاتی اور دوسری پینگ ہے چڑھاتی
گاتی ہے کبھی کوئی ہنڈولا کہتی ہے کوئی بدیسی ڈھولا
اک جھولے سے وہ گری ہے جا کر سب ہنستی ہیں قہقہے لگا کر
ندی نالے چڑھے ہوئے ہیں تیراکوں کے دل بڑھے ہوئے ہیں
گھڑ ناؤ پہ ہے سوار کوئی اور تیر کے پہنچا پار کوئی
بگلوں کی ہیں ڈاریں آکے گرتی مرغابیاں تیرتی ہیں پھرتی
چکلے ہیں یہ پاٹ ندیوں کے دن بھر میں ہیں بیڑے جاکے لگتے
زوروں پہ چڑھا ہوا ہے پانی موجوں کی ہیں صورتیں ڈرانی
ناویں ہیں کہ ڈگمگا رہی ہیں موجوں کے تھپیڑے کھا رہی ہیں
ملاّحوں کے اُڑ رہے ہیں اَوسان بیڑے کا خدا ہی ہے نگہبان
منجھار کی رَو بھی زور پر ہے مچھلی کو بھی جان کا خطر ہے
بے زار اک اپنی جان و تن سے بچھڑا ہوا صحبتِ وطن سے
غربت کی صعوبتوں کا مارا چلنے کا نہیں ہے جس کو یارا
غم خوار ہے کوئی اور نہ دل جو اک باغ میں ہے پڑا لبِ جو
ہیں دھیان میں کلفتیں سفر کی آپے کی خبر ہے اور نہ گھر کی

ابر اتنے میں اک طرف سے اُٹھا اور رنگ سا کچھ ہوا کا بدلا
برق آکے لگی تڑپنے پیہم اور پڑنے لگی پھوار کم کم
آنے جو لگے ہوا کے جھوکے تھے جتنے سفر کے رنج بھولے
سامان ملے جو دل لگی کے یاد آئے مزے کبھی کبھی کے
دیکھے کوئی اُس گھڑی کا عالم وہ آنسوؤں کی جھڑی کا عالم
وہ آپ ہی آپ گنگنانا اور جوش میں کبھی یہ گانا
اے چشمۂ آبِ زندگانی! گھٹیو نہ کبھی تری روانی
جاتی ہے جدھر تری سواری بستی ہے اُسی طرف ہماری
پائے جو کبھی مری سبھا کو دیتا ہوں میں بیچ میں خدا کو
اول کہیو ! سلام میرا پھر دیجیو یہ پیام میرا
قسمت میں یہی تھا اپنی لکھا فرقت میں تمھاری آئی برکھا
آتا ہے تمہارا دھیان جس دَم مرغابیاں تیرتی ہیں باہم
ہم تم یوں ہی صبح و شام اکثر تالاب میں تیرتے تھے جاکر
جب سبزہ و گل ہیں لہلہاتے صحبت کے مزے ہیں یاد آتے
ہم تم یوں ہی ہات میں دیے ہات پھرتے تھے ہوائیں کھاتے دن رات
جب پیڑ سے آم ہے ٹپکتا میں تم کو اِدھر اُدھر ہوں تکتا
آخر نہیں پاتا جب کسی کو دیتا ہوں دعائیں بے کسی کو
رُت آم کی آئے اور نہ ہوں یار جی اپنا ہے ایسی رُت سے بے زار
تم بن جو ہے بوند تن پہ پڑتی چنگاری سی ہے بدن پہ پڑتی
ہے سرد ہوا بدن کو لگتی پر دل میں ہے آگ سی سلگتی
پردیس میں سچ ہے کیا ہو جی شاد؟ جب جی میں بھری ہو دیس کی یاد
نشتر کی طرح تھی دل میں چبھتی فریاد یہ دردناک اس کی
تھا سوز میں کچھ ملا ہوا ساز پکڑا دل سن کے اس کی آواز
حیرت رہی دیر تک کہ آخر روڑا ہے کہاں کا یہ مسافر؟
پھر غور سے اک نظر جو ڈالی نکلا وہ ہمارا دوست حالؔی

03.08 نظم ''برکھارُت'' تجزیہ

خواجہ الطاف حسین حالؔی نے انجمنِ پنجاب لاہور کے تحت ہونے والے مشاعروں میں چار نظمیں لکھیں اور یہ کافی مشہور ہوئیں۔ان میں پہلی نظم ''برکھارُت'' ہے،جس میں ۱۴۵/اشعار ہیں۔اس نظم میں انہوں نے تمہید باندھنے کے بعد برسات کی مختلف کیفیات کا ذکر کیا ہے۔ابتدا میں برسات سے قبل گرمی کی جو شدّت ہوتی ہے اس کی حالت بیان کی گئی ہے اور گرمی کی ساری جزئیات کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

جان داروں کا تڑپنا، کہساروں کا تپنا، دریا کے پانی کا کھولنا، جنگل میں گرمی کی شدّت، باغوں کی ویرانی، جانوروں کی بے حد پریشانی، آندھیوں کی تندی، لُو کی شعلہ سامانی، انسانوں کی بے چینی، شہر کی کیفیت اور چھوٹے بچوں کی بے حالی ان سب کی تصویر حالؔی نے بڑی خوبی سے کھینچی ہے۔

اس نظم میں یہ تصویریں بذاتِ خود بھی اہمیت رکھتی ہیں اور اصل موضوع کے خدوخال اُبھارنے اور نمایاں کرنے میں بھی ان کا خاصا دخل ہے۔گرمی کے پس منظر کے بغیر برسات کی تصویر نمایاں نہیں ہوسکتی تھی۔اس لئے حالؔی نے اس نظم کے ایک حصے میں گرمی کی کیفیت کا بیان اس قدر تفصیل سے کیا ہے کہ اس میں واقعہ نگاری، منظر نگاری اور جزئیات نگاری کی خصوصیات پیدا ہوگئی ہیں۔جزئیات نگاری کے ساتھ ساتھ ان اشعار میں مشاہدے کی تیزی اور احساس کی شدّت بھی اپنے شباب پر نظر آتی ہے۔

نظم کے دوسرے حصے میں حالی نے اس پس منظر میں برسات کی آمد کا ذکر کیا ہے اور پُروا کی آمد، ابر کی کیفیت، بجلی کی چمک، گھنگھور گھٹاؤں کا عالم، باغوں کی ہریالی، درختوں کی شادابی، کوئل کی کوک، پپیہے کی پیہو، مور کی چنگھاڑ، انسانوں کی مسرّت اور اس مسرّت سے سرشار ہوکر ان کی وارفتگی ان سب کو حالؔی نے آنکھوں کے سامنے اس طرح بے نقاب کردیا ہے کہ اس عالم کی ایک فضا تیار ہوجاتی ہے اور پڑھنے والا اس فضا میں اپنے آپ کو کھو دیتا ہے۔حالؔی برسات کے عام مناظر کو ضرور پیش کرتے ہیں لیکن ساتھ ہی ساتھ ان مناظر کا جو فطری ردِّعمل عام انسانوں کے جذبات واحساسات پر ہوتا ہے اس کو خاص طور پر سامنے رکھتے ہیں۔اس کی دل کشی کا راز اسی خصوصیت میں مضمر ہے۔اس کے بعد حالؔی نے برسات کے موسم کی تعریف کی ہے اور اس بات کو واضح کیا ہے کہ برسات کا موسم دنیا کو نئی زندگی بخشتا ہے، باغوں پر نکھار آتا ہے، کھیتیاں نہال ہوتی ہیں، طاؤس ناچنے لگتے ہیں، کوئل کوکنے لگتی ہے، ہواؤں میں مستی کا رنگ آجاتا ہے، دریا اُمنڈنے لگتے ہیں، زمین سونا اُگلنے لگتی ہے، لوگوں کے دلوں میں اُمنگیں جاگ اُٹھتی ہیں، باغوں میں جھولے پڑجاتے ہیں اور نوجوان اٹھکھیلیاں کرنے لگتے ہیں۔

زندگی کے انسانی پہلوؤں کا کتنا شدید احساس یہاں نظر آتا ہے؟ حالؔی روزمرّہ کی زندگی کی عام باتوں کا کتنا گہرا شعور رکھتے تھے؟ حالؔی نے ان مناظر کی ایسی تصویر کشی کی ہے کہ ان سے قبل اس کی مثال سوائے نظیرؔ اکبرآبادی کے اردو نظم میں کہیں اور نہیں مل سکتی۔حالؔی کو منظر نگاری پر بڑی قدرت حاصل ہے اور یہ سب ان کے شدید احساس، گہرے شعور اور وسیع تجربے کے نتائج ہیں۔''برکھارُت'' کو حالؔی نے ایک بڑے جذباتی انداز میں ختم کیا ہے لیکن ان کا یہ جذباتی انداز پوری طرح نفسیاتی ہے۔

حالؔی جب اس نظم میں اس بات کو پیش کرتے ہیں کہ برسات کے موسم میں غریب الوطن کی حالت، پردیس میں وطن کی یاد بہت زیادہ آتی ہے۔برسات کے موسم میں ٹھنڈی ہوا کے جھونکے اگرچہ اس کے دل کو فرحت اور روح کو تازگی بخشتے ہیں لیکن برسات کی یہ کیفیت اس کی آنکھوں کے سامنے ماضی کی رنگین اور دل موہ لینے والی یادوں کو سامنے لاکر کھڑا کردیتی ہیں اور اس کے دل میں اشکوں کی لہریں اُٹھنے لگتی ہیں۔

وہ بے کل و بے چین ہو جاتا ہے۔ آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ جاتی ہے۔ کبھی گنگناتا ہے کبھی خوشی میں آ کے گانے لگتا ہے۔ اس گیت کا موضوع وطن کی صحبتوں کی یاد ہوتی ہے۔ اس کی یہ فریاد دل میں نشتر کی طرح چبھنے لگتی ہے اور سننے والے دل پکڑ کر رہ جاتے ہیں۔ اگر چہ حالؔی نے اس نظم میں اپنی ذاتی ذہنی اور جذباتی کیفیت کا اظہار کیا ہے لیکن اس کی نوعیت آفاقی نظر آتی ہے۔ برسات کے موسم کو دیکھ کر غریب الوطنی کے عالم میں حالؔی پر جو ذہنی و جذباتی کیفیت طاری ہوتی ہے وہ ہر انسان پر طاری ہو سکتی ہے بلکہ ہوتی ہے۔

حالؔی کی بڑائی اس میں ہے کہ انہوں نے اس کیفیت کے اظہار کو ایک آفاقی رنگ دیا ہے۔ اس طرح حالؔی نے نظم ''برکھا رُت'' میں سادہ و عام الفاظ استعمال کر کے کو رواں دواں بنا دیا ہے۔ ان کی نظم میں فارسی اور عربی الفاظ کم اور ہندی الفاظ کی بہتات نظر آتی ہے جو کہ عام زبان کو فروغ دینے کے جذبے کی مدلل دلیل ہے۔ حالؔی نے اس نظم میں برسات کے متعلقات الفاظ کا ایک ذخیرہ اکٹھا کر دیا ہے۔ جانوروں کا ذکر آتا ہے تو ہرن، سانپ، لومڑی، چیتا، شیر اور سانڈے وغیرہ کا ذکر کیا گیا ہے۔ جب گرمی کا بیان کیا ہے تو گرمی کے متعلقات جیسے لُو، آگ، شعلہ آندھی، طوفان بگولہ اور اس کے ساتھ بادِ سموم، پنکھے اور دھوپ کا تفصیلی ذکر موجود ہے۔ گرمی کے بعد جب بارش کا سماں باندھتے ہیں تو پروائی، گھٹا، سبزہ، شجر، پھول اور جل تھل کا ذکر کر کے بارش کا نقشہ کھینچ دیتے ہیں۔ بارش کے بعد ندی نالوں کی کیفیت اور اس موسم میں پیدا ہونے والے کیڑوں کا ذکر کرتے ہیں۔

عوام میں جب بارش کا استقبال ہوتا ہے تو مختلف طبقات کی مصروفیات بیان کرتے ہیں۔ باغوں میں جھولے، ملار، ہنڈولہ، تیراکی، بگلوں کی قطاریں، ندی کے پاٹ، موجوں کا تلاطم، ناؤ کی ڈگمگاہٹ، ملاّحوں کی نگہبانی اور مچھلیوں کی منجدھار سے نکلنے کی کشمکش ان تمام عناصر کو پیش کر کے خواجہ الطاف حسین حالؔی نے نظم ''برکھا رُت'' کے حُسن کو دوبالا کر دیا ہے۔

03.09 خلاصہ

خواجہ الطاف حسین حالؔی اردو ادب کے ایک بہترین ادیب تھے اور اس کے ساتھ ساتھ کامیاب نظم نگار بھی تھے۔ آپ نے نظم نگاری کی روایات کو جدید تقاضوں سے وابستہ کیا۔ وہ اردو کے پہلے جدید نظم نگار شاعر قرار دیے جاتے ہیں۔ انہوں نے روایتی مثنوی کو موجودہ دَور کی مسائلی مثنوی میں تبدیل کر کے مثنوی کی صنف کو ایک نئی جہت عطا کی۔ چنانچہ ان کی مثنوی ''برکھا رُت'' کے مطالعے سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے کہ آپ نے داستانوی، عشقیہ، متصوفانہ اور دیگر اقسام کی مثنویوں سے الگ انداز اختیار کرتے ہوئے قدرت کے حسین مناظر کو مثنوی کا موضوع بنایا۔

حالؔی نیچرل شاعری کے بانیوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ شاعری کو سچائی اور حقیقت پسندی کا راستہ دکھانے والے شاعروں میں حالؔی کا اوّلین مقام ہے۔ آپ نے مصطفیٰ خاں شیفتہؔ اور مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ سے شعری تربیت حاصل کی۔ آپ کی پیدائش پانی پت میں ہوئی اور علمی ادبی ذوق کو جلا دہلی میں ملی۔ مولانا حالؔی نے ''مسدّسِ حالی'' اور ''مقدمۂ شعر و شاعری'' لکھ کر اردو ادب میں اہم اضافے کیے۔ وہ ایک ہمہ جہت نثر نگار ہونے کے ساتھ ساتھ حقیقت پسند شاعر بھی ہیں۔ انہوں نے غزل کے علاوہ شخصی مرثیے، جدید مثنوی، موضوعاتی نظمیں، پیامی شاعری اور نیچرل شاعری کے ذریعے اردو شاعری میں ایک اہم مقام بنایا۔ بنیادی طور پر آپ سادہ زبان استعمال کیا کرتے تھے۔ چنانچہ ان کی تمام شاعری میں عربی و فارسی الفاظ بہت کم ہیں۔

آپ کا نظریہ یہی تھا کہ اردو ایک ملی جلی زبان ہے اس لئے اس کو معرب ومفرس نہ بنایا جائے بلکہ اسے عام بول چال کی زبان کی حیثیت دی جائے۔انہوں نے پوری زندگی اسی مخلوط زبان میں شاعری کی۔وہ انسان دوست،قوم پرست اور خوددار انسان تھے۔شاعری میں ان کی انفرادی خصوصیات نمایاں ہیں۔انہوں نے اپنے شعری کارناموں سے اردو دنیا کو متاثر کیا۔ان کی نظموں میں ارتقائی عمل اور موضوعات میں ندرت ہے۔ان کی شاعری میں قدیم وجدید کی حسین آمیزش موجود ہے۔خواجہ الطاف حسین حالؔی کی اہمیت ان کی نظموں میں سچائی اور حقیقت پسندی،سادگی اور سلاست کی وجہ سے نمایاں ہے۔

03.10 فرہنگ

ابتذال پسندی : ذلیل پن

ابتر : زیادہ خراب

ازسرِنَو : دوبارہ،شروع سے

استفادہ : فائدہ حاصل کرنا

اعتدال : برابر

افسوں : جادو،منتر

افلاک : فلک کی جمع،آسمان

انہماک : غوروفکر

اوسان : حالت

بادِسموم : گرم ہوا

باضابطہ : قاعدہ کے ساتھ

بٹیا : پگڈنڈی

برمحل : موقع پر

بروے کار : کام میں لانا

بَن : جنگل

بھوبل : گرم راکھ

پیاؤ : پانی پینے کی جگہ

تازیانہ : کوڑا،چابک

تخصیص : خاصیت

تعلیمی پسماندگی : تعلیم کے میدان میں پیچھے ہونا

تلمذّ : شاگرد ہونا

زبوں حالی : حال خراب ہونا

سانڈے : ایک جانور کا نام

سبیل : پانی پلانے کی جگہ

سرمایہ : پونجی

سوقیانہ : بازاری پن

صعوبت : مشکلات،پریشانی

عامیانہ : جاہل پن

عبور : مہارت

فرقت : جدائی

فلاح وبہبود : خیریت وبھلائی

قدغن : روک،بندش

قعرِضلالت : گمراہی کا گڑھا

کان : معدن،کھان

کچھار : شیر کے رہنے کی جگہ

کندھا ڈال دینا : کام کرنے سے جانوروں کا رک جانا

کہسار : پہاڑی علاقے

لائحہ عمل : پروگرام،منصوبہ

لُو : گرم ہوا

مبالغہ : کسی بات میں حد سے زیادہ بڑھ جانا

مخرب : بگاڑنے والی

مراقی : جنونی

تمہید	شروعات، دیباچہ	مزاج داں	مزاج جاننے والا
توازن	ہم وزن، برابر	مصلحین	اصلاح کرنے والے
تھاہ	پانی کی گہرائی ناپنا	مضطر	بے چین
جدّت	نیاپن	مکتوبات	مکتوب کی جمع، خطوط
جوہر	اصل، خلاصہ	مکدر	کدورت پیدا کرنے والا
حب الوطنی	وطن سے محبت کرنا	ملہار ودیس	دونوں راگ کے نام ہیں
خفقانی	دل کی بیماری والا	مَم مَم	بچوں کی زبان میں پانی
ڈھوروں	جانوروں	مور وملخ	چیونٹی اور ٹڈی
رودبار	ندی نالے	نبّاض	نبض دیکھنے والا
روشناس	واقف	نمایاں	ظاہر، صاف

03.11 سوالات

مختصر سوالات

سوال نمبر ۱ : خواجہ الطاف حسین حالؔی کی نیچرل شاعری پر اظہارِ خیال کیجیے؟

سوال نمبر ۲ : خواجہ الطاف حسین حالؔی کے کارنامے بیان کیجیے؟

سوال نمبر ۳ : خواجہ الطاف حسین حالؔی کی حقیقت پسندی کا جائزہ لیجیے؟

سوال نمبر ۴ : خواجہ الطاف حسین حالؔی کی نظم نگاری کی خصوصیات لکھیے؟

سوال نمبر ۵ : نظم ''برکھا رُت'' کے آخری بند کا تجزیہ پیش کیجیے؟

تفصیلی سوالات

سوال نمبر ۱ : نظم ''برکھا رُت'' کی منظر نگاری اپنے الفاظ میں لکھیے؟

سوال نمبر ۲ : خواجہ الطاف حسین حالؔی کے حالاتِ زندگی اپنے الفاظ میں لکھیے؟

سوال نمبر ۳ : خواجہ الطاف حسین حالؔی کا اردو نظم نگاری میں مقام ومرتبہ متعین کیجیے؟

معروضی سوالات

سوال نمبر ۱ : خواجہ الطاف حسین حالؔی کی پیدائش کہاں ہوئی؟

(الف) آگرہ (ب) دہلی (ج) پانی پت (د) انبالہ

سوال نمبر ۲ : خواجہ الطاف حسین حالؔی نے کس شہر میں تعلیم حاصل کی؟

(الف) دہلی (ب) لکھنؤ (ج) علی گڑھ (د) پانی پت

سوال نمبر۳ : خواجہ الطاف حسین حالؔی نے مسدس کس سنہ میں لکھی؟

(الف) ۱۸۷۷ء (ب) ۱۸۷۸ء (ج) ۱۸۷۹ء (د) ۱۸۸۰ء

سوال نمبر۴ : نظم ''برکھارت'' میں کتنے اشعار ہیں؟

(الف) ۱۴۴ (ب) ۱۴۵ (ج) ۱۴۶ (د) ۱۴۷

سوال نمبر۵ : خواجہ الطاف حسین حالؔی کی شعری تصنیف کون سی ہے؟

(الف) حیاتِ سعدی (ب) یادگارِ غالب (ج) حیاتِ جاوید (د) مسدسِ حالی

سوال نمبر۶ : خواجہ الطاف حسین حالؔی پانی پت سے دہلی کس سنہ میں پہنچے؟

(الف) ۱۸۵۲ء (ب) ۱۸۵۴ء (ج) ۱۸۵۶ء (د) ۱۸۵۸ء

سوال نمبر۷ : خواجہ الطاف حسین حالؔی نے حیاتِ جاوید میں کس کے حالات تحریر کیے ہیں؟

(الف) شیخ سعدی (ب) مرزا غالبؔ (ج) سرسید (د) اقبالؔ

سوال نمبر۸ : خواجہ الطاف حسین حالؔی نے کس بند میں ''دیس'' کا ذکر کیا ہے؟

(الف) پہلے (ب) دوسرے (ج) آخری بند (د) کسی میں نہیں

معروضی سوالات کے جوابات

جواب نمبر۱ : (ج) پانی پت — جواب نمبر۲ : (الف) دہلی

جواب نمبر۳ : (ج) ۱۸۷۹ء — جواب نمبر۴ : (ب) ۱۴۵

جواب نمبر۵ : (د) مسدّسِ حالؔی — جواب نمبر۶ : (ب) ۱۸۵۴ء

جواب نمبر۷ : (ج) سرسید — جواب نمبر۸ : (ج) آخری بند

03.12 حوالہ جاتی کتب

۱۔ جدید شاعری از عبادت بریلوی

۲۔ حالی بحیثیتِ شاعر از شجاعت علی سندیلوی

۳۔ جدید نظم حالؔی سے میراجی تک از کوثر مظہری

۴۔ تحقیقی مطالعہ حالؔی از ظہیر احمد صدیقی

اکائی 04 : اکبرالہ آبادی ''فرضی لطیفہ''

ساخت :

04.01 : اغراض ومقاصد

04.02 : تمہید

04.03 : اکبرالہ ابادی کے حالاتِ زندگی

04.04 : اکبرالہ ابادی کی نظم نگاری

04.05 : نظم ''فرضی لطیفہ'' متن

04.06 : نظم ''فرضی لطیفہ'' تجزیہ

04.07 : خلاصہ

04.08 : فرہنگ

04.09 : سوالات

04.10 : حوالہ جاتی کتب

04.01 اغراض ومقاصد

اس اکائی میں آپ اکبرالہ ابادی کی شخصیت، سوانحی حالات اور اردو شاعری میں خصوصاً اردو نظم گوئی میں ان کی اہم اور نمایاں شاعرانہ خدمات، حیثیت، مقام ومرتبے اور فنّی خصوصیات سے متعلق معلومات حاصل کرسکیں گے اور اس اکائی میں اکبرالہ ابادی کی مشہور نظم ''فرضی لطیفہ'' کا متن اور تجزیہ پیش کیا جائے گا۔ سبق کے آخر میں مکمل سبق کا خلاصہ، فرہنگ، امتحانی سوالات کے نمونے اور حوالہ جاتی کتب کی فہرست دی جائے گی۔ جس سے آپ اکبر کی شاعری، ان کے موضوعات، طنز ومزاح اور زبان وبیان کی خوبیوں سے واقفیت حاصل کرسکیں گے۔

اس کے علاوہ ان کی شاعری کے پس منظر کا بھی علم ہو سکے گا اور اکبرالہ آبادی کے مخصوص لب ولہجے، لفظیات، اصطلاحات اور طرزِ اُسلوب کا بھی علم حاصل کرسکیں گے اور یہ بھی اندازہ ہوجائے گا کہ اردو نظم اور اردو طنز ومزاح کی تاریخ میں اکبرالہ ابادی کا مقام ومرتبہ کیا ہے اور قوم کی اصلاح اور ذہنی بیداری میں انہوں نے یا ان کے کلام نے کیا کردار ادا کیا ہے۔

04.02 تمہید

سید اکبر حُسین اکبرالہ آبادی کا شمار اردو کے اہم طنز ومزاح نگار نظم گو شعرا میں ہوتا ہے۔ کسی بھی بڑے اور اہم شاعر کے کلام کو سمجھنے کے لئے اس کے سوانحی حالات اور اس کے عہد کے حالات کو جاننا اور سمجھنا بہت ضروری ہے کہ اس نے اس دور میں اپنے فکر وفن کو شاعری کے قالب میں کیسے ڈھالا اور اپنی شاعری میں کیا پیغام دیا ہے۔ اس طرح اس کے کلام کو سمجھنے میں بڑی آسانی ہوتی ہے۔

04.03 اکبرالہٰ آبادی کے حالاتِ زندگی

سید اکبر حسین ، اکبرالہٰ آبادی ۱۶ر نومبر ۱۸۴۶ء کو بارہ، ضلع الہٰ آباد میں پیدا ہوئے۔ان کے والد کا نام سید تفضّل حسین تھا۔ان کی ابتدائی تعلیم گھر پر مذہبی ماحول میں ہوئی۔وہ بچپن سے ہی ذہین تھے۔خوش مزاجی، ذہانت اور طبّاعی ان کی شخصیت کے خاص وصف تھے۔صغر سنی میں مکتب میں داخل کیے گئے اور پڑھنے کا شوق دیکھ کر ان کے والد نے انہیں ۱۸۵۶ء میں جمنا مشن اسکول میں داخل کر دیا لیکن ۱۸۵۷ء کے ہنگاموں کے سبب اسکول میں ان کی تعلیم کا سلسلہ جاری نہ رہ سکا۔گھر کے معاشی حالات کے سبب وہ ملازمت کی تلاش میں مصروف ہو گئے۔ بالآخر انہیں ایک انگریز کے زیرِ نگرانی عدالت کی ملازمت مل گئی۔دورانِ ملازمت انہیں انگریزوں کی طرزِ معاشرت کو دیکھنے اور سمجھنے کے جو مواقع ملے اس کا مشاہدہ اور موازنہ انہوں نے اپنی تہذیب و معاشرت سے کیا اور پھر یہی حالات اور معاملات ان کی شاعری کے موضوعات بن گئے۔اکبرالہٰ آبادی نے کئی چھوٹی بڑی نوکریاں کیں اور اپنے مطالعے کے شوق کو جاری رکھا۔کلکتہ سے میٹرک کا کورس پاس کیا اور اردو، عربی، فارسی زبانوں میں قدرت حاصل کر لی۔

۱۸۶۸ء/۱۸۶۹ء میں وہ ضلع الہٰ آباد میں نائب تحصیل دار کے عہدے پر فائز ہو گئے۔ ۱۸۷۳ء میں انہوں نے وکالت کا امتحان پاس کر لیا۔ابتداً کچھ عرصہ وکالت کی اور پھر ۱۸۸۱ء میں منصف مقرر ہوئے اور ترقی کر کے سب جج بن گئے۔ان کی خدمات کے اعتراف میں انگریز حکومت نے انہیں ''خان بہادر'' کا خطاب عطا کیا۔اپنی صحت کی خرابی کے سبب اکبرالہٰ آبادی نے قبل از وقت پنشن لے لی اور پوری سنجیدگی کے ساتھ علمی، ادبی، قومی اور فلاحی کاموں میں مصروف ہو گئے۔دنیاوی ضرورتوں اور متعلقین کی کفالت کے سبب اکبر نے نوکری ضرور کی لیکن ان کی خوددار طبیعت اور بیدار ذہن نے سرکاری ملازمت کے بندھنوں کو پسند نہیں کیا اور ملازمت سے سبک دوش ہونے میں ہی عافیت محسوس کی۔ان کے یہ اشعار ان کے مزاج کی اسی کیفیت کے غماز ہیں:

پراگندہ بہت ہے دل مرا دنیا کے دھندوں سے
چھڑا دے مجھ کو یارب! نوکری کے سخت دھندوں سے

غلامانہ طریقوں پر مجھے مجبور کرتے ہیں
خدایا! بے نیازی دے مجھے ان شرپسندوں سے

نیشنل وقعت کے گم ہونے کا ہے اکبر کو غم
آفیشل عزت کا اس کو کچھ مزا ملتا نہیں

اکبرالہٰ آبادی کی ازدواجی زندگی کامیاب اور خوش گوار نہ تھی۔ملک کے ابتر سیاسی حالات، ملازمت کی سختیاں اور ناکام ازدواجی زندگی کے ناموافق حالات نے اکبر کے مزاج کو خاصا متاثر کیا۔ان کی دوسری بیوی ان کی ہم مزاج و ہم خیال تھیں، جس کے سبب اکبر کو کسی قدر سکون و چین حاصل ہوا۔دوسری بیوی سے دو بیٹے اور ایک بیٹی پیدا ہوئے۔ایک بیٹا اور بیٹی کا کم عمری میں ہی انتقال ہو گیا البتہ بڑے بیٹے سید عشرت حسین کو انہوں نے باضابطہ طور پر تعلیم حاصل کرنے کے مواقع دیے۔اُنہیں لندن بھی بھیجا لیکن وہ ان کی توقعات پر پورے نہیں اُتر سکے۔اکبرالہٰ آبادی کی زندگی کا آخری زمانہ سخت مشکلوں میں بسر ہوا۔

۱۹۱۰ء میں ان کی چہیتی بیوی کا انتقال ہو گیا۔اکبر کا آخری زمانہ غم و الم میں گزرا اور ۹ر ستمبر ۱۹۲۱ء کو ان کا انتقال ہو گیا۔اکبرالہٰ آبادی کا خاندان مذہبی تھا۔اکبر بھی مذہبی انسان تھے۔ان کی زندگی میں مذہب کی بڑی اہمیت تھی اور اسلام سے انہیں گہرا لگاؤ تھا۔مذہبی اُمور پر وہ خود بھی سختی سے پابند رہے اور قوم کے افراد کو بھی اس کی تلقین کرتے رہے۔

مذہبی انسان ہونے کے سبب اکبر کی شخصیت میں سادگی، خودداری، مشرقیت، خلوص ومحبت، کفایت شعاری اور عزتِ نفس کوٹ کوٹ کر بھری تھی اور اسی سبب سے وہ مغربی تہذیب کے مُضر اثرات سے بخوبی واقف اور اس کی کورانہ تقلید کے سخت خلاف تھے۔ اکبرالہ آبادی کو اپنے ملک ہندوستان، مذہبِ اسلام، ہم وطنوں اور اپنی تہذیبی اقدار سے دلی لگاؤ تھا۔ وہ نہ صرف مشرقی تہذیبی اقدار واصولوں کے قائل تھے بلکہ ان کی بقا اور تحفظ کے لئے ہمیشہ کوشاں رہتے تھے۔

ہندوستان میں بڑھتے ہوئے انگریزی تہذیب کے اثرات کو کم کرنے کے لئے اور مشرقی اقدار کو بحال کرنے کی انہوں نے حتی المقدور کوششیں کیں۔ اپنے کلام میں انہوں نے غلامی، افلاس، ہندوستانی عوام کی بے چارگی، عورتوں کی بے جا آزادی، فیشن پرستی اور بے پردگی کے خلاف بار بار آوازِ احتجاج بلند کی ہے۔ وہ تعلیمِ نسواں کے خلاف نہ تھے لیکن ایسی تعلیم کے خلاف تھے جس سے عورتوں کی خودداری، شرم وحیا، وفا شعاری، خوش سلیقگی اور وقار متاثر ہوجاتا ہو۔ وہ ایسی تعلیم کے قائل تھے جس سے خواتین میں امورِ خانہ داری کا سلیقہ پیدا ہوسکے اور وہ اپنے شوہر، اولاد کی تربیت اور گھر گرہستی کے کاموں میں معاون ثابت ہوسکیں۔

اکبرالہ آبادی نے جس وقت آنکھیں کھولیں اس وقت ہندوستان میں مغلیہ سلطنت آخری سانسیں لے رہی تھی۔ انہوں نے جب ہوش سنبھالا تو اپنے ملک کو انگریزی حکومت کے تحت پایا۔ ہندوستانیوں پر انگریزوں کی ظلم وزیادتی کو دیکھا۔ قوم کی بدحالی، افلاس اور بے چارگی نے ان کے دلِ دردمند کو خاصا متاثر کیا اور وہ قوم پرست اور وطن دوست شاعر بن گئے۔ اپنے مافی الضمیر کا اظہار انہوں نے شاعری کے ذریعے کیا اور اپنے افکار وخیالات کو مؤثر طور پر ظاہر کرنے کے لئے ان کے مخصوص اُسلوب نے لوگوں کے ذہن ودل کو گدگدایا بھی اور جھنجھوڑا بھی، لطف وانبساط وتفریح کا سامان بھی بہم کیا اور عبرت ونصیحت وفکر وعمل کی باتیں بھی بیان کیں۔

اکبرالہ آبادی بنیادی طور پر طنز ومزاح نگار تھے۔ انہوں نے غزلیں اور نظمیں بھی لکھیں۔ انہیں مقبولیت طنزیہ ومزاحیہ نظم نگار کی حیثیت سے حاصل ہوئی کہ اس میدان میں ان کا کوئی ثانی نظر نہیں آتا۔ جب معاشرہ زوال پذیر ہو اور اس میں سیاسی، سماجی، معاشی اور معاشرتی بے اعتدالیاں اور ناہمواریاں راہ پاگئی ہوں اور قوم اپنے مقصد اور مقام سے بھٹک گئی ہو تو طنز ایک کارگر حربے کے طور پر کام انجام دیتا ہے۔ اکبر دراصل ایک دردمند مخلص انسان اور مصلحِ قوم تھے۔ انہوں نے اپنے عہد کے حالات کا بغور مشاہدہ اور مطالعہ کیا تھا۔ قوم کو بیدار وباعمل بنانے اور اسے اپنے حقیقی منصب اور مقصد سے آگاہ کرنے کی خاطر انہوں نے طنز ومزاح کا سہارا لیا اور شاعری خصوصاً نظم گوئی کے ذریعے اپنے دل کی بات عوام تک پہونچانے کی کامیاب کوشش کی۔

اکبرالہ آبادی کا عہد ۱۸۴۶ء سے ۱۹۲۱ء طنز وظرافت کے لئے بڑا سازگار تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ مشرقی اور مغربی تہذیبیں آپس میں صف آرا تھیں۔ عوام وخواص کا ایک گروہ مشرقی تہذیبی اقدار کا قائل تھا تو دوسرا گروہ مغربی اقدار کی چکاچوند میں محو ہوکر اسی رنگ میں رنگتا چلا جارہا تھا۔ ان متضاد حالات اور ذہنی کشمکش کو اکبر نے اپنی شاعری کا موضوع بنایا اور طنز وظرافت کے ذریعے مثبت انداز میں بغرضِ اصلاح وعمل اپنی بات عوام تک پہنچانے کی بھرپور کوشش کی۔ اکبرالہ آبادی کے اس عہد میں سرسید احمد خاں اور ان کے رفقائے کار خصوصاً حالی کی آوازیں بھی گونج رہی تھیں۔ اکبر ابتداً سرسید تحریک کے مخالف تھے لیکن بعد میں وہ ان کے ہم نوا بن گئے تھے۔ دارالعلوم دیوبند اور ندوۃ العلما لکھنؤ اگر مشرقی علوم واقدار کے حامی تھے تو سرسید مشرقی علوم کے ساتھ ساتھ مغربی علوم کے حصول کو بھی ضروری سمجھتے تھے۔

اکبرالہ آبادی نے سرسید تحریک سے بعض امور میں اختلاف کیا ہے لیکن وہ اس کے مخالف نہیں تھے۔ بقول ڈاکٹر صغریٰ مہدی:

''اکبر کے کلام کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے جابجا سرسید اور ان کی تحریک پر اظہارِ خیال کیا ہے۔ وہ سرسید اور ان کی تحریک کے بہت بڑے مخالف سمجھے جاتے ہیں۔ لیکن اگر ان کے کلام کا غور سے مطالعہ کیا جائے تو یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ نہ سرسید کے مخالف تھے نہ ان کی تحریک کے بلکہ اس کے کمزور پہلوؤں کے نقاد تھے۔''

(اکبر کی شاعری کا تنقیدی مطالعہ.ص۲۹۔۳۰)

جس دَور اور حالات میں اکبرالہ آبادی نے شاعری کا آغاز کیا دراصل وہ دَور بحرانی تھا اور حالات ہنگامی تھے۔ سیاسی، سماجی، تہذیبی اور معاشرتی زندگی میں تیزی کے ساتھ تبدیلیاں واقع ہو رہی تھیں۔ بعض تبدیلیاں مثبت تھیں تو بیش تر منفی اثرات کی حامل تھیں۔ اکبرالہ آبادی تمام منفی اثرات کے سخت خلاف تھے۔ وہ اپنی طرزِ معاشرت اور تہذیب کو رُو بہ زوال دیکھنا نہیں چاہتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ ہماری وہ تہذیبی اور تمدنی اقدار برقرار رہیں جو کہ ہماری پہچان اور ہمارے وجود کا سبب ہیں۔ اکبرالہ آبادی کی شاعری دراصل احتجاج اور ردِّعمل کی شاعری ہے۔

بقول ڈاکٹر صغریٰ مہدی:

''اکبر ترقی چاہتے تھے مگر ایسی جس کے رستے ان کے ہم وطن ملک کی تہذیب اور صالح روایات کے پیشِ نظر متعین کریں۔ جن کا مرکز مذہب اور اخلاق ہو.....اس لئے وہ ان تحریکوں اور ان اداروں کے حامی تھے جو ان کے مذہبی اور اخلاقی تصور کے مطابق یا اس سے قریب تھے۔''

(اکبر کی شاعری کا تنقیدی مطالعہ.ص۵۲)

اکبرالہ آبادی ایک فطری شاعر تھے۔ انہوں نے عام روایت کے مطابق غزل گوئی سے شاعری کا آغاز کیا۔ ان کی ابتدائی دَور کی شاعری روایتی طرز کی حامل تھی۔ اکبرالہ آبادی چوں کہ ایک حساس دل، بیدار ذہن، قوم پرست اور ملک دوست انسان تھے۔ اس لئے ملک کی ترقی، قوم کی اصلاح اور خوش حالی ان کا اصل مقصد تھا۔ وہ شاعری سے بھی یہی کام لینا چاہتے تھے۔ انہوں نے اس خاص مقصد کی تکمیل کے لئے نہ صرف نظم گوئی اختیار کی بلکہ اپنی بات کو مؤثر طریقے سے بیان کرنے کے لئے طنزیہ و مزاحیہ اُسلوب کا سہارا لیا۔ یہ دونوں کام دراصل ان کے عہد کے حالات کا تقاضہ تھے۔ لہٰذا انہوں نے اسی کے ذریعے اپنے دل کی بات کو عوام و خواص تک پہنچایا بلکہ قوم کے افراد کو بیدار اور باشعور بنانے میں اہم کردار کیا۔

اکبر کی شاعری ان کے دور کے تہذیبی حالات اور سماجی و سیاسی تبدیلیوں کی بہترین ترجمانی کرتی ہے۔ وہ اپنے کلام سے قارئین کو محظوظ ہی نہیں کرتے بلکہ غور و فکر و عمل پر آمادہ بھی کرتے ہیں۔ انہوں نے اپنے مقصد کے حصول کی خاطر بعض انگریزی نظموں کے ترجمے کیے اور اپنے قطعات اور منظومات میں مخصوص مضامین کو عنوان بنا کر اخلاقی اور اصلاحی موضوعات پر اظہارِ خیال کیا ہے۔ اکبرالہ آبادی ملک کو آزاد دیکھنا چاہتے تھے۔ انہیں انگریزوں اور ان کی تہذیب سے سخت نفرت تھی۔ وہ ہر اس تحریک کے حامی تھے جو انگریزں کے خلاف تھی۔ گاندھی جی کی تحریکِ آزادی کی حمایت میں انہوں نے کئی نظمیں لکھیں، قطعات کہے۔ ان کے یہ اشعار ان کے فکر و خیال کے ترجمان ہیں:

داخل مری دانست میں یہ کام ہے پُن میں پہنچائے گا قوّت شجرِ ملک کی بُن میں
تحریکِ بدیشی پہ مجھے وجد ہے اکبر کیا خوب یہ نغمہ ہے چھڑا دیش کی دُھن میں

اکبرالہ آبادی کوانگریزوں کی چالاکیوں اور گاندھی جی کی بے بسی کا بھی احساس تھا کہ:

صاحب میں سب برائی لیکن وہ خوب چوکس گاندھی میں سب بھلائی لیکن وہ محض بے بس

لیکن اکبرالہ آبادی کے سامنے جوسیاسی صورتِ حال تھی اور گاندھی جی اوراہلِ وطن جس طرح جدوجہدِ آزادی میں مصروف تھے اسے دیکھ کروہ اپنی خوشی اوراطمینان کا اظہاراس طرح کرتے ہیں:

انقلاب آیا ، نئی دنیا ، نیا ہنگامہ ہے شاہ نامہ ہوچکا اب دَورِ گاندھی نامہ ہے

اکبرالہ آبادی نے ایک چھوٹا مجموعہ ''گاندھی نامہ'' بھی مرتب کیا تھا۔ان کے چوتھے دیوان میں تحریکِ آزادی،عدمِ تعاون اورترکِ موالات پرکئی اشعارشامل ہیں۔سرکاری ملازم ہونے کے سبب اکبرالہ آبادی انگریزوں کے عتاب سے ڈرتے تھےلیکن اندرہی اندر پیچ وتاب کھاتے تھے۔اپنے عہد کے حالات کی ترجمانی انہوں نے جرأت مندی کے ساتھ کی ہے۔اس ضمن میں انہیں خود بھی یہ احساس تھا:

اکبر کا نغمہ قوم کے حق میں مفید ہے دل کو تو گرم رکھتا ہے گو بے سرا سہی

04.04 اکبرالہ ابادی کی نظم نگاری

اکبرالہ آبادی نے ۷۵/سال کی عمر پائی۔ان کی شاعری ۶۰/سال کے عرصے کومحیط ہے۔ان کی کلّیات چارحصوں میں شائع ہوئی ہے۔کلیات کے ابتدائی دو حصے اکبر کی زندگی میں شائع ہوگئے تھے بقیہ دو حصے ان کی وفات کے بعد شائع ہوئے۔اکبر نے کلیات کے پہلے حصے میں شامل غزلوں کودرج ذیل تین ادوار میں تقسیم کیا ہے:

پہلا دور : ابتدا سے ۱۸۶۶ء تک
دوسرا دور : ۱۸۶۶ء سے ۱۸۸۴ء تک
تیسرا دور : ۱۸۸۵ء سے ۱۹۰۸ء تک

مولانا عبدالماجد دریا آبادی نے ان کے کلام کے چوتھے دَور کو ۱۹۰۹ سے ۱۹۱۲ء تک اور پانچویں دَور کو ۱۹۱۴ء سے ۱۹۱۹ء تک تقسیم کیا ہے جب کہ ڈاکٹر سید عابد حسین کلامِ اکبر کودرج ذیل تین ادوار میں تقسیم کرتے ہیں:

پہلا دَور : جس میں انہوں نے تغزّل اختیار کیا
دوسرا دَور : نصیحت آمیز ظرافت
تیسرا دَور : ظرافت آمیز نصیحت

پروفیسر صغریٰ مہدی نے اپنے تحقیقی مقالے اکبر کی شاعری کا تنقیدی مطالعہ میں مذکورہ بالا تین ادوار کو تین مختلف رنگوں سے تعبیر کیا ہے۔

پروفیسر صغریٰ مہدی نے اس سلسلے میں لکھا ہے:

''.....اکبر کی شاعرانہ زندگی میں دو واضح موڑ آئے ہیں۔ایک ۱۸۷۷ء کے لگ بھگ اور دوسرا ۱۹۰۰ء کے آس پاس۔اس طرح ان کی شاعری کا پہلا دَور ابتدا سے ۱۸۷۶ء تک اور دوسرا دور ۱۸۷۷ء سے ۱۹۰۰ء تک اور تیسرا دور ۱۹۰۱ء سے وفات تک سمجھنا چاہیے۔''

اکبرالہ آبادی کا ابتدائی کلام عشقِ مجازی اور تغزّل کا حامل تھا لیکن ملک وقوم کے حالات اور رسالہ ''اودھ پنچ'' (لکھنؤ) کی اشاعت نے اکبر کے کلام کے رُخ کو طنز وظرافت کی جانب موڑ دیا اور وہ طنزیہ ومزاحیہ شاعر کے بطور مشہور ہو گئے۔سرسید تحریک، تحریکِ آزادیِ ہند اور محمد حسین آزاد کی جدید شاعری کے آغاز کے سبب ان کے کلام میں موضوعات کا تنوّع ہی نہیں خیالات کی گہرائی بھی پیدا ہوئی۔جو ابتدائی کلام روایتی طرز کا حامل تھا اس میں سیاسی اور سماجی حالات کی جھلکیاں پیش کی جانے لگیں۔طنز ومزاح کے اچھے نمونے پیش کیے جانے لگے۔

اکبرالہ آبادی سے قبل اردو شاعری میں طنز ومزاح کی روایت موجود تھی لیکن وہ اتنی مستحکم اور مستقل نہ تھی جتنی کہ اکبر کے یہاں نظر آتی ہے۔اکبرالہ آبادی سے قبل اردو میں جعفر زٹلی کی زٹلیات، سودا کی ہجویات، شعرائے دہلی کے شہر آشوب، نظیر کی بعض منظومات، انشاء اللہ خاں انشا اور مرزا غالب کے بعض اشعار میں طنز وظرافت کی جھلکیاں نمایاں طور پر نظر آتی ہیں لیکن اردو شاعری میں باقاعدہ اور مستقل طور پر طنزیہ و مزاحیہ طرزِ اسلوب کو اختیار کرنے کا سہرا اکبرالہ آبادی کے سر بندھتا ہے اور وہ اردو کے پہلے منفرد ومقبول طنز ومزاح کے شاعر تسلیم کیے جاتے ہیں۔اکبر نے طنز ومزاح کے پیرایے کو ایک کارگر حربے کے بطور اختیار کیا۔ان کا مقصد تفنّن وتفریح بہم پہنچانا ہی نہ تھا بلکہ وہ طنز ومزاح کے ذریعے معاشرے کی اصلاح کرنا چاہتے تھے۔بگڑے ہوئے کو بنانا اور سوتے ہوئے کو جگانا چاہتے تھے۔

اکبرالہ آبادی نے اپنے طنز ومزاح کی نوعیت اور مقصد کو ان اشعار میں بیان کیا ہے:

معقول مزاح ہے تو یہ ہے — شرعاً جو مباح ہے تو یہ ہے
ہر چند کہ زجر بیش تر ہے — گو فقرۂ طعن نیشتر ہے
لیکن وہ قند میں گُھلا ہے — یہ آبِ حیات میں بُجھا ہے
بگڑے ہوئے بن گئے ہنسی میں — حکمت ہے تو ایسی دل لگی میں

اکبرالہ آبادی کے عہد میں انگریزی حکومت کے زیرِ اثر ہندوستانی معاشرے میں جس تیزی کے ساتھ تبدیلیاں ہو رہی تھیں اور ہندوستانی عوام جس طرح انگریزی تہذیب ومعاشرت سے متاثر ہو کر اپنی تہذیب ومعاشرت کو بھول رہے تھے اکبر نے اُنہی برائیوں پر طنز و مزاح کے ذریعے اپنی بات کہنے کی کوشش کی ہے۔انہوں نے ہندوستانی عوام کو مغربی تہذیب کی اندھی تقلید سے بچنے کی تلقین کی اور اس مضحکہ خیز صورتِ حال کو اپنے طنز ومزاح کا نشانہ بنایا جس کے سبب ہماری قوم اپنے مذہب اور تہذیب سے دور ہو کر اپنی شناخت کھوتی جا رہی تھی۔ اکبر کی شاعری کا بیش تر حصہ اسی مقصدِ خاص کی طرف اشارہ کرتا ہے۔چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

چھوڑ لٹریچر کو ، اپنی ہسٹری کو بھول جا — شیخ و مذہب سے تعلق ختم کر، اسکول جا
کیسی نماز ، ہال میں ناچو جنابِ شیخ — تم کو خبر نہیں کہ زمانہ بدل گیا
ہوئے اس قدر مہذّب کبھی گھر کا منھ نہ دیکھا — کٹی عمر ہوٹلوں میں ، مَرے اسپتال جا کر
میں کیا کہوں احباب کیا کارِ نمایاں کر گئے — بی۔اے ہوئے،نوکر ہوئے،پنشن ملی پھر مر گئے

اکبر دراصل قوم کی ترقّی اور نئے علوم سے واقفیت کے مخالف نہ تھے لیکن ایسی روش کے سخت خلاف تھے جس کے سبب قوم اپنی اصل تہذیبی شناخت کو ختم کر دے۔ وہ اس اعتدال وتوازن کے قائل تھے، جس کا اشارہ انہوں نے اپنے ان اشعار میں واضح طور پر کیا ہے:

قدیم وضع پہ قائم رہوں اگر اکبر تو صاف کہتے ہیں سیّد کہ رنگ ہے میلا
جدید طرز اگر اختیار کرتا ہوں تو اپنی قوم مچاتی ہے ہائے واویلا
جو اعتدال کی کہیے تو وہ اِدھر نہ اُدھر زیادہ حد سے دیے سب نے پاؤں ہیں پھیلا
اِدھر ہے دفترِ تدبیر و مصلحت ناپاک اُدھر ہے وحی ولایت کی ڈاک کا تھیلا

حقیقت یہ ہے کہ اکبر قوم میں حدِّ اعتدال پیدا کرنا چاہتے تھے۔ اپنے پیغام کو عام کرنے کی خاطر انہوں نے طنزیہ ومزاحیہ انداز اختیار کر کے اصلاح وعمل کی تلقین کی ہے۔ وہ قوم کو اَندھی تقلید سے محفوظ رکھنا چاہتے تھے۔

بقول وزیر آغا:

''یہ بات یقیناً کہی جاسکتی ہے کہ ان کے طنز نے تعمیری کام ضرور انجام دیا۔''

(ماخوذ: اردو ادب میں طنز ومزاح ص ۱۱۱)

عبدالماجد دریا آبادی نے اکبر کی شاعری کے متعلق لکھا ہے:

''ان کا مطمحِ نظر وطن کے بجائے عاقبت، ملک کے بجائے حقانیت اور قوم کے بجائے خدا تھا۔''

کلامِ اکبر سے متعلق ظفر احمد صدیقی کی یہ رائے بڑی حد تک درست ہے:

''اُن کی شاعری میں آفاقیت اور ہمہ گیری ہے جو ان کو اقبالؔ اور غالبؔ جیسے شعرا کی محفل میں جگہ پانے کا مستحق بناتی ہے..... وہ ایک مستقل فلسفہ اور ایک ہم آہنگ نظریۂ حیات رکھتے تھے۔''

(اکبر کی سنجیدہ شاعری، علی گڑھ میگزین اکبر نمبر)

اکبر الٰہ آبادی سے متعلق ڈاکٹر صغریٰ مہدی لکھتی ہیں:

''حقیقت یہ ہے کہ اکبر نہ تو رجعت پسند مولوی تھے نہ مفکر وفلسفی، نہ وہ معمولی درجے کے شاعر تھے، نہ عظیم شاعروں میں ان کا شمار کیا جاسکتا ہے۔ اکبر کی شاعری میں فکری عناصر یقیناً ہیں لیکن بنیادی طور وہ بہت جذباتی ہیں..... ان کے نظریۂ حیات میں مذہب کو مرکزی حیثیت حاصل ہے..... ان کے یہاں ملک وقوم اور اپنی تہذیب کی بھی بڑی اہمیت ہے... انہوں نے صرف مذہب کا ماتم نہیں کیا ہے۔ قوم کو راہِ ترقی پر چلنے کی ہدایت بھی کی ہے..... اکبر کی شاعری کا مطالعہ ان کے عہد کے مطالعے کے مترادف ہے۔''

پروفیسر آل احمد سرور کا یہ خیال درست ہے کہ:

''اردو شاعری میں کوئی ایسا شاعر نہیں جس نے ایک معاشرت اور تہذیب سے اس طرح عشق کیا ہو اور اس کے مختلف پہلوؤں کو ایک شاعر کی نگاہ سے دیکھ کر انہیں اپنے کلام میں محفوظ کر دیا ہو۔''

حقیقت یہ ہے کہ اکبر کی شاعری کا خاص مقصد قوم کو بیدار کرنا، باعمل بنانا اور اس میں خود اعتمادی پیدا کرنا تھا۔ اس اعتبار سے ان کا شمار اُردو کے ایسے شعرا میں ہوتا ہے جنہوں نے ایک خاص مقصد کے حصول کے تحت شاعری کی اور اپنا پیغام عوام تک پہنچایا۔ اکبر اپنے مشن میں کامیاب ہوئے اور ان کی بات عوام وخواص کے دلوں تک پہنچ کر انہیں غور وفکر وعمل کے لئے اُکساتی رہی ہے اور آج بھی ان کا کلام لطف و بصیرت کے ساتھ ساتھ فکر وعمل کی تلقین کرتا ہے۔

04.05 نظم ''فرضی لطیفہ'' متن

خدا حافظ مسلمانوں کا اکبر! مجھے تو ان کی خوش حالی سے ہے یاس
یہ عاشق شاہدِ مقصود کے ہیں نہ جائیں گے و لیکن سعی کے پاس
سناؤں تم کو اِک فرضی لطیفہ کیا ہے میں نے جس کو زیبِ قرطاس
کہا مجنوں سے یہ لیلیٰ کی ماں نے کہ بیٹا ! تو اگر کرلے ایم۔ اے پاس
تو فوراً بیاہ دوں لیلیٰ کو تجھ سے بِلا دقّت میں بن جاؤں تری ساس
کہا مجنوں نے یہ اچھی سُنائی کُجا عاشق ، کُجا کالج کی بکواس
کُجا یہ فطرتی جوشِ طبیعت کُجا ٹھونسی ہوئی چیزوں کا احساس
بڑی بی ! آپ کو کیا ہوگیا ہے؟ ہرن پر لادی جاتی ہے کہیں گھاس
یہ اچھّی قدر دانی آپ نے کی مجھے سمجھا ہے کوئی ہر چرن داس
دِل اپنا خون کرنے کو ہوں موجود نہیں منظور مغزِ سر کا آماس
یہی ٹھہری جو شرطِ وصلِ لیلیٰ
تو استعفیٰ مِرا با حسرت و یاس

اکبرالہ آبادی کا شمار اردو کے صفِ اوّل کے طنز ومزاح نگار شعرا میں ہوتا ہے۔ اکبرالہ آبادی ذہین، ذکی، ظریف اور پختہ کلام شاعر تھے۔ وہ فطری شاعر تھے لیکن انہوں نے شاعری نہ تو صلہ وستائش اور شہرت ومقبولیت حاصل کرنے کے لئے کی اور نہ ہی محض اپنے ذوق کی تسکین کی خاطر شاعری کو اظہار کا وسیلہ بنایا۔

اکبرالہ آبادی بیدار ذہن، حسّاس، دوراندیش اور قوم پرست شاعر تھے۔ اپنے وطن ہندوستان، مذہبِ اسلام اور مشرقی روایات و اقدار سے اُنہیں خاص لگاؤ تھا۔ ہندوستان اور ہندوستانی قوم پر انگریزوں کے جابرانہ تسلط اور ظلم وزیادتی کو وہ پسند نہیں کرتے تھے۔ قوم کی ذہنی مرعوبیت، مغربی تہذیب کی کورانہ تقلید، فیشن پرستی، تن آسانی اور بے عملی اُنہیں خون کے آنسو رُلاتی تھی۔ وہ قوم کو خوددار، فعّال، باعمل اور باوقار دیکھنا چاہتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ قوم مشرقی تہذیب واقدار وروایات پر عمل پیرا رہ کر کامیاب اور باوقار زندگی بسر کرے۔

اکبرالہ آبادی نے شاعری کو ایک مِشن کے بطور استعمال کیا اور تمام عمر ملک کی آزادی اور قوم کی اصلاح کی خاطر سرگرمِ عمل رہے۔ اکبرالہ آبادی نے قوم کے نام اپنے پیغام کو مؤثر اور کارگر بنانے کے لئے اپنی بات براہِ راست نہیں کی بلکہ طنز ومزاح کا سہارا لے کر اپنی بات

عوام تک پہنچانے کی سعی کی۔ اکبر ایک خلاّق فن کار تھے۔ انہوں نے اپنے عہد کے حالات اور ماحول کا گہری نظر سے مشاہدہ ومطالعہ کیا تھا۔ وہ ملک وقوم کے حالات اور مسائل کے نبض شناس ہی نہ تھے بلکہ ایک کامیاب معالج کی طرح امراض کی تشخیص کر کے اس علاج کے لئے بہتر حل کی تدبیر بھی کرتے تھے۔ ان کا مقصد محض ہنسنا ہنسانا یا گدگدانا ہی نہ تھا بلکہ وہ طنز ومزاح کے نشتر سے سماج کے بہت سے ناسوروں کا کارگر علاج کرنا چاہتے تھے۔

اکبرالہ آبادی نے تمام عمر اپنی شاعری سے یہی کام انجام دیا۔ ان کے بہت سے اشعار وقطعات اور منظومات آج بھی اہل فکر ونظر کو متاثر کر کے غور وفکر وعمل پر آمادہ کرتے ہیں۔ اکبرالہ آبادی کا بیش تر کلام اسی رنگ وآہنگ میں ڈوبا ہوا ہے۔ انہوں نے ایک خاص مقصد یعنی اصلاح وبیداری وعمل کے لئے شعر کو ذریعہ بنایا۔ اکبرالہ آبادی بات کہنے اور دلوں کو متاثر کرنے کے فن سے بخوبی واقف تھے۔ ان کی ہر بات میں ایک اہم نکتہ پوشیدہ ہوتا تھا۔

04.06 نظم ''فرضی لطیفہ'' تجزیہ

زیرِ نظر نظم ''فرضی لطیفہ'' بھی دراصل ایسی ہی متاثر کن نظم ہے جس میں اکبر نے ہلکے مزاح اور گہرے طنز سے کام لے کر اپنی بات قوم تک پہنچانے کی سعی کی ہے۔ اکبر نے موضوع کو اہم بنانے میں اور اس کی جانب فوری توجہ مبذول کرانے کی خاطر طنز ومزاح یا پر لطف اُسلوب کا سہارا لیا ہے۔ اپنی بات میں لطف، گہرائی اور اثر پیدا کرنے کے لئے انہوں نے اپنی نظموں میں انگریزی الفاظ ومصطلحات کا برمحل اور دل چسپ اور بامعنی استعمال کیا ہے۔

''فرضی لطیفہ'' کے پہلے شعر میں وہ نہایت سنجیدگی کے ساتھ خود کو مخاطب کرتے ہوئے مسلمانوں کی خودساختہ اور فرضی خوش حالی یعنی بے خبری اور تعیش پر چوٹ کرتے ہوئے اپنی نا اُمیدی اور فکرمندی اس لئے ظاہر کرتے ہیں کہ مسلمان محض ظاہری اور وقتی عیش وخوش حالی میں مبتلا ہو کر اپنی آخرت اور مستقبل کے تقاضوں کو فراموش کیے ہوئے ہیں۔ یعنی حالات اور وقت کے تقاضوں سے منہ موڑے ہوئے ہیں۔ عیش پسندی، تن آسانی، بے فکری اور بے حسی کے عمل نے انہیں اپنے حقیقی فرائض سے غافل کر دیا ہے۔ یہی وہ تاثر ہے جس کے سبب اکبر مسلمانوں کو خدا کے سپرد کرتے ہوئے اپنی فکرمندی ظاہر کر رہے ہیں۔

نظم کا دوسرا شعر اسی خیال کی مزید وضاحت سے متعلق ہے جس میں شاعر مسلمانوں کے اس عمل اور رویے کی جانب اشارہ کر رہا ہے جو کہ ان کی بے حسی اور بے عملی کا سبب ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ مسلمان زندگی کے حقیقی مقاصد سے دور اور ظاہری مقاصد میں ایسے اُلجھ کر رہ گئے ہیں کہ وہ کسی طرح اپنے مستقبل کو سنوارنے کی کوشش کرتے نظر نہیں آتے۔ مذکورہ بالا دونوں اشعار میں شاعر نے اپنی قوم کی بے عملی، بے حسی اور آرام طلبی پر طنز کا وار کیا ہے تاکہ قوم میں غیرت، حمیت، تفکر اور شعور پیدا ہو سکے۔

اکبرالہ آبادی اپنی بات کو مزید مؤثر ودل چسپ بنا کر پیش کرنے کے لئے ایک دل چسپ لطیفے کا سہارا لیتے ہوئے مجنوں اور اس کی ساس کے درمیان مکالمہ کراتے ہوئے کہتے ہیں کہ ایک دن لیلیٰ کی ماں نے مجنوں کو مخاطب کرتے ہوئے اور اس کا امتحان لینے کی خاطر کہا کہ اگر تو ایم۔اے پاس کر لے تو میں اپنی بیٹی لیلیٰ کا بیاہ تیرے ساتھ کر کے تیری ساس بن جاؤں گی۔ ظاہر ہے کہ عاشق مزاج انسان دنیاوی جھمیلوں میں پڑنا نہیں چاہتا۔ لہٰذا لیلیٰ کی ماں کی بات سن کر مجنوں نے فوراً اپنا ردِّعمل ظاہر کرتے ہوئے لیلیٰ کی ماں کو جواب دیا کہ ''آپ نے

یہ اچھی سنائی''، یعنی کیا بات کہہ دی؟ ایک عاشق کو بھلا کالج کی تعلیم سے کیا سروکار ہوسکتا ہے؟ مجنوں اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے مزید وضاحت کرتا ہے کہ کہاں یہ آزادی، بےفکری اور فطری طبیعت کا جوش اور لطف اور کہاں ذمے داریوں کا بوجھ! وہ ساس کو مخاطب کرتے ہوئے اپنی حیرانی کا اظہار کرتا ہے کہ آخر آپ کو کیا ہو گیا ہے؟ آپ یہ بھی نہیں سمجھتیں کہ کس کو کیا کام دیا جانا چاہیے۔یعنی ایک عاشق کو تعلیم حاصل کرنے سے کیا فائدہ؟ مجنوں مزید کہتا ہے کہ یہ کون سی قدردانی ہے؟ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ مجھ سے یہ مطالبہ کیوں کیا جارہا ہے؟ شعر میں ''ہرچرن داس'' قافیہ پیمائی اور مزاح کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔

اگلے شعر میں شاعر مجنوں کے ذریعے کہتا ہے کہ میں اپنے دل کا خون کرنے کے لئے موجود ہوں یعنی عاشقی کے معاملے میں ہر عاشقانہ عمل پر تیار ہوں۔لیکن اپنے دماغ پر کوئی بوجھ منظور نہیں ہے۔اپنی دیوانگی، اپنا جذبہ وجنون اور عشق عزیز ہے۔میں اس کا علاج نہیں کرانا چاہتا اور نہ ہی اس سے دست بردار ہونا چاہتا ہوں۔یعنی میں عاشق کے منصب سے ہٹنا نہیں چاہتا یا سوائے عشق کے کوئی اور کام میرے بس میں نہیں ہے۔جوشِ عشق اور عالمِ دیوانگی میں وہ یعنی مجنوں اپنی ساس کو یہ تک کہہ دیتا ہے کہ اگر وصلِ لیلیٰ کی شرط یہی ہے کہ مجھے ایم۔اے پاس کرنا پڑے گا تو میں حیرت و یاس کے ساتھ استعفیٰ دے کر اپنے عاشقانہ منصب سے دست بردار ہوتا ہوں۔یعنی مجھے سوائے عاشقی کے اور کوئی بھی کام منظور نہیں ہے۔

فرضی لطیفہ خالص طنزیہ ومزاحیہ نظم ہے جس میں اکبرؔ نے مجنوں اور اس کی ساس کے درمیان دل چسپ مکالمے کے ذریعے قوم کی حالتِ زار اور اس کے نوجوانوں کے ضدّی رویے اور ہٹ دھرمی کو مؤثر انداز میں پیش کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔یہ نظم اس صورتِ حال کی ترجمانی کرتی ہے جب کہ قوم کے نوجوان حصولِ تعلیم اور فرائض کی ادائیگی سے دور ہو چکے تھے۔تن آسانی، بےحسی، بےعملی اور غفلت ان کا شعار بن چکا تھا اور وہ اپنے روشن مستقبل سے بےخبر اور بےفکر ہو گئے تھے۔اس نظم کے ذریعے اکبرؔ نے قوم کے نوجوانوں میں بیداری، شعور اور عمل کی تلقین کی ہے۔اکبرؔ کا کلام ایک خاص مقصد کا حامل ہے۔اس نظم میں بھی اکبرؔ نے اپنے مقصد کو ایک خاص انداز میں بیان کیا ہے۔

04.07 خلاصہ

سید اکبر حسین اکبرؔ الٰہ آبادی کا شمار اردو کے طنز ومزاح کے صفِ اوّل کے طنز ومزاح نگار شعرا میں ہوتا ہے۔اکبر نے اپنی شعرگوئی کا آغاز غزل گوئی سے کیا تھا لیکن حالات کے تقاضے اور موضوعات کی وسعت کے سبب انہوں نے نظم گوئی کو اظہار کا وسیلہ بنایا اور اپنے مافی الضمیر اور اپنے عہد کے حالات اور مسائل کو اپنی شاعری میں جگہ دی۔

اکبرؔ الٰہ آبادی ایک مقصدی شاعر تھے۔ان کا ایک خاص مشن تھا۔یہ مشن ملک کی آزادی، قوم کی بیداری، اصلاح، مشرقی اقدار، اپنی شاندار تہذیبی روایات کا تحفظ اور خودداری و وقار کو قائم رکھنا تھا۔اکبرؔ الٰہ آبادی نے اپنے مافی الضمیر کا اظہار براہِ راست نہ کرتے ہوئے طنز ومزاح وظرافت اور مخصوص لفظیات ومصطلحات کے ذریعے کیا۔اکبرؔ کا مقصد تفنّنِ طبع یا تفریح بہم پہنچانا نہیں تھا۔وہ اپنی بات اس طرح ظاہر کرنا چاہتے تھے کہ پڑھنے والا اس سے لطف اندوز بھی ہو اور متاثر ہو کر اس پر غور وفکر کر کے عمل کرنے کی کوشش کرے۔

اکبرؔ نے اُنہی موضوعات اور مسائل کو اپنی شاعری میں پیش کیا جو کہ ان کے سامنے تھے اور جن کی وجہ سے قوم زوال، بےحسی اور بےعملی کا شکار ہو کر اپنے شاندار ماضی سے دور ہوتی جارہی تھی اور اپنی خودداری اور پہچان بھی کھوتی جارہی تھی۔اکبرؔ نے نصف صدی سے زیادہ

عرصے تک شاعری کی اور کئی اہم منظومات، قطعات اور غزل کے اشعار یادگار چھوڑے ہیں۔ان کے کلام کے مطالعے سے ان کے عہد کے سیاسی، سماجی اور تہذیبی حالات کا اندازہ ہوتا ہے اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس عہد میں ہمارا ملک اور ہماری قوم کن حالات سے گزر رہی تھی؟ اس وقت کے تقاضے کیا تھے؟ وہ کن مسائل اور مصائب کا شکار تھی؟ اور اس وقت کے افراد کا مزاج اور رویّہ کیا تھا؟.....اکبرؔ مشرقی تہذیب کے حامی شاعر تھے اور وہ قوم کے افراد کو بھی اُنہی مشرقی تہذیبی اقدار و روایات پر عمل پیرا دیکھنا چاہتے تھے۔

اکبرؔ مغرب کی اچھی روایات اور عصری علوم کے مخالف نہ تھے لیکن ایسی تعلیم اور تہذیب جو ہندوستانی عوام کی پہچان اور وقار کو مسخ و مجروح کر دے انہیں گوارا نہ تھی۔ وہ ہر حال میں اپنی تہذیب و تمدن کو محفوظ و قائم رکھنا چاہتے تھے۔ وہ کامیاب عملی زندگی اور دنیاوی ضرورتوں کے قائل تھے لیکن تہذیب و مذہب کی پاس داری انہیں بہر حال عزیز تھی۔ تمام عمر وہ اپنی شاعری کے ذریعے اسی خاص مقصد کی تلقین کرتے رہے۔ان کی شاعری مقصدی شاعری تھی۔ان کے دل کی آواز تھی۔

یہی سبب ہے کہ آج بھی ان کا کلام پڑھنے اور سننے والوں کو متاثر کرتا ہے اور آج بھی ان کے کلام کو پسندیدگی اور شوق کے ساتھ پڑھا جاتا ہے۔یہی وہ خصوصیات ہیں جن کے سبب اکبرؔ الٰہ آبادی کا شمار اردو کے اہم اور مقصدی شعرا میں ہوتا ہے۔اردو کے وہ پہلے اور اہم طنز و مزاح نگار شاعر تھے اور ان جیسا دوسرا شاعر اردو میں نظر نہیں آتا۔وہ اپنی طرز کے موجد اور خاتم بھی تھے۔

04.08 فرہنگ

آماس	:	سوجن، ورم، وزن	رُوبہ زوال	:	زوال کی طرف جانے والی
آوازِ احتجاج	:	مخالفت یا مذمت کی آواز	زیبِ قرطاس	:	کاغذ کی زینت: یعنی کاغذ پر تحریر کرنا
ازدواجی	:	گھریلو	سرگرمِ عمل	:	مصروفِ کار
اُسلوب	:	طرز، انداز	سعی	:	کوشش
اعتدال	:	توازن، درمیان کا راستہ	صالح	:	اچھّی
اقدار	:	قدر کی جمع، روایات	صغرسنی	:	بچپن، کم عمری
اُمور	:	امر کی جمع، کام	صلہ	:	انعام، بدلا
اُمورِ خانہ داری	:	گھر گرہستی کے کام	طبّاعی	:	ذہانت، شوخی
انبساط	:	خوشی	ظریف	:	ہنسوڑ، بذلہ سنج
بحرانی دور	:	ہنگامی دور، مسائل والا	عبرت	:	ایسی باتیں جن سے سبق حاصل ہو
برمحل	:	مناسب، موقع کے مطابق	عتاب	:	غصہ، غیظ و غضب
بن	:	جڑ	کارگر	:	بہتر، کامیاب
پُن	:	ثواب، کارِ خیر	کارِنمایاں	:	نمایاں کام، اہم کام

پوشیدہ	: چھپا ہوا	مثبت	: تعمیری
پیچ و تاب	: بے چینی، غم و غصہ، اُلجھن	محو ہونا	: کھو جانا
تدبیر	: کوشش، ترکیب	محیط	: پھیلی ہوئی
تسلّط	: قبضہ	مصطلحات	: اصطلاحات
تعلیمِ نسواں	: عورتوں کی تعلیم	مصلح	: اصلاح کرنے والا، سماج سُدھارک
تقلید	: نقل، پیروی	مضحکہ خیز	: مزاحیہ، قابلِ مزاح
حتی المقدور	: ہر ممکن، مقدور بھر	مطمحِ نظر	: نقطۂ نظر، سوچنے کا انداز
حصول	: حاصل	معالج	: علاج کرنے والا، حکیم
حمیّت	: غیرت	مُنصف	: فیصلہ کرنے والا، جج
دانست میں	: سمجھ میں، اپنے طور پر	نبض شناس	: جانکار، واقف کار
رجعت پسند	: دقیانوس، پرانے خیال کے	نصیحت	: مشورہ، رائے، فائدے کی باتیں
ردِعمل	: عمل کے جواب میں	نقاد	: تنقید کرنے والا

04.09 سوالات

مختصر سوالات

سوال نمبر ۱ : اکبر کا پورا نام کیا تھا؟ وہ کب اور کہاں پیدا ہوئے؟

سوال نمبر ۲ : اکبر کو انگریز حکومت نے کون سا خطاب عطا کیا تھا؟

سوال نمبر ۳ : اکبر الہ آبادی نے شاعری میں کس طرز کو اختیار کیا؟

سوال نمبر ۴ : جس عہد میں اکبر الہ آبادی نے شاعری کا آغاز کیا وہ دور کیسا تھا؟

تفصیلی سوالات

سوال نمبر ۱ : اکبر الہ آبادی کے سوانحی حالات تحریر کیجیے۔

سوال نمبر ۲ : اکبر الہ آبادی کی شاعری کے موضوعات کیا تھے؟

سوال نمبر ۳ : اکبر الہ آبادی کے شاعرانہ اسلوب کی خصوصیات بیان کیجیے۔

سوال نمبر ۴ : اکبر الہ آبادی کے عہد کے سیاسی اور سماجی حالات پر روشنی ڈالیے۔

سوال نمبر ۵ : اردو شاعری میں اکبر الہ آبادی کی اہمیت اور مقام و مرتبے پر اظہارِ خیال کیجیے۔

معروضی سوالات

سوال نمبر۱ : اکبرالہ آبادی کس سنہ میں پیدا ہوئے؟

(الف) ۱۸۴۸ء (ب) ۱۸۴۶ء (ج) ۱۸۵۰ء (د) ۱۸۴۵ء

سوال نمبر۲ : اکبرالہ آبادی نے میٹرک کا کورس کہاں سے پاس کیا تھا؟

(الف) الہ آباد (ب) لکھنؤ (ج) کلکتہ (د) دہلی

سوال نمبر۳ : اکبرالہ آبادی کس سنہ میں منصف کے عہدے پر فائز ہوئے؟

(الف) ۱۸۸۱ء (ب) ۱۸۸۰ء (ج) ۱۸۷۸ء (د) ۱۸۸۲ء

سوال نمبر۴ : اکبر کے بیٹے کا نام کیا تھا؟

(الف) سید تفضّل حسین (ب) نیاز حسین (ج) سید عشرت حسین (د) سید سجاد حسین

سوال نمبر۵ : اکبر کا انتقال کس سنہ میں ہوا؟

(الف) ۱۹۲۰ء (ب) ۱۹۲۵ء (ج) ۱۹۲۲ء (د) ۱۹۲۱ء

سوال نمبر۶ : اکبر کس تہذیب کے حامی تھے؟

(الف) مشرقی (ب) مغربی (ج) ایرانی (د) ہندی

سوال نمبر۷ : اکبر نے کس اُسلوب کو اختیار کیا؟

(الف) سادہ (ب) طنزیہ ومزاحیہ (ج) رنگین (د) مرصع

سوال نمبر۸ : اکبر کی شاعری میں ان کے عہد کے کس اہم شخص کو زیادہ نشانہ بنایا گیا ہے؟

(الف) حالی (ب) شبلی (ج) سرسید (د) نذیر احمد

سوال نمبر۹ : اکبر کی شاعری کو کیا نام دیا جا سکتا ہے؟

(الف) رنگین شاعری (ب) احتجاج وردِعمل کی شاعری (ج) سادہ شاعری (د) سنجیدہ شاعری

سوال نمبر۱۰ : اکبر نے گاندھی جی سے متعلق جو مجموعہ مرتب کیا تھا اس کا نام کیا ہے؟

(الف) گاندھی نامہ (ب) گاندھی کی آواز (ج) گاندھی تحریک (د) گاندھی کا پیغام

معروضی سوالات کے جوابات

جواب نمبر۱ : (ب) ۱۸۴۶ء

جواب نمبر۲ : (ج) کلکتہ

جواب نمبر۳ : (الف) ۱۸۸۱ء

جواب نمبر۴ : (ج) سید عشرت حسین

جواب نمبر۵ : (د) ۱۹۲۱ء

جواب نمبر۶ : (الف) مشرقی

جواب نمبر۷ : (ب) طنزیہ ومزاحیہ

جواب نمبر۸ : (ج) سرسید احمد

جواب نمبر۹ : (ب) احتجاج اور ردِعمل کی شاعری

جواب نمبر۱۰ : (الف) گاندھی نامہ

04.10 حوالہ جاتی کتب

۱۔ اکبر کی شاعری کا تنقیدی مطالعہ از صغریٰ مہدی
۲۔ اردو ادب میں طنز و مزاح از وزیر آغا
۳۔ کلیاتِ اکبر الہ آبادی
۴۔ علی گڑھ میگزین: اکبر نمبر

اکائی 05 : دُرگا سہائے سرورؔ ''مادرِ وطن''

ساخت :

05.01 : اغراض ومقاصد

05.02 : تمہید

05.03 : دُرگا سہائے سرورؔ کے حالاتِ زندگی

05.04 : دُرگا سہائے سرورؔ کی وطنی وقومی شاعری

05.05 : دُرگا سہائے سرورؔ کی نظم نگاری

05.06 : نظم ''مادرِ ہند'' متن (اقتباس)

05.07 : نظم ''مادرِ ہند'' تجزیہ (اقتباس)

05.08 : خلاصہ

05.09 : فرہنگ

05.10 : سوالات

05.11 : حوالہ جاتی کتب

05.01 اغراض ومقاصد

انسان کو ماضی کے حالات وواقعات سے بہت کچھ سیکھنے اور اپنی زندگی میں داخل کرنے کے مواقع فراہم ہوتے ہیں۔ اُردو کی بیش تر نظمیں ایسے حالات وواقعات سے بھری ہوئی ہیں جن سے انسان نہ صرف بہت کچھ سیکھ سکتا ہے بلکہ ماضی کی تاریک اور روشن روایات سے بھی واقفیت حاصل کرسکتا ہے۔ اُنہی اغراض ومقاصد کے تحت مختلف اُدبا وشعرا کی شخصیات کا جائزہ لینا اور اُن کی خدمات وتخلیقات کا مطالعہ کرنا ناگزیر ہے۔ اُردو زبان کے اہم نظم گو شعرا کی صف میں ایک اہم نام دُرگا سہائے سرورؔ جہان آبادی کا بھی ہے۔

آپ اس اکائی کے مطالعے سے دُرگا سہائے سرورؔ جہان آبادی کی حیات وشخصیت کے اہم گوشوں سے واقف ہوں گے اور اُن کی نظم گوئی کی انفرادی خصوصیات سے بھی روشناس ہوں گے۔ اس اِکائی میں اُن کی شہرۂ آفاق نظم ''مادرِ ہند'' کے اصل متن کو بطورِ اقتباس شامل کیا گیا ہے۔ نظم کی اہم خصوصیات پر روشنی ڈال کر اُس کا تجزیہ پیش کیا جائے گا۔ تجزیے اور خصوصیات کی روشنی میں اس نظم کے اندازِ بیان سے واقفیت کرائی جائے گی ساتھ ہی یہ بھی کوشش کی جائے گی کہ آپ کو اُن کی اس نظم کی تفہیم کے علاوہ اُن کی دیگر نظموں کے مفاہیم بھی سمجھ میں آسکیں۔ آپ کے علم میں اضافے کی غرض سے سرورؔ کی تصانیف پر بھی روشنی ڈالی جائے گی۔ اس اکائی میں سرورؔ کی نظموں کے موضوعات، اُسلوب، اندازِ بیان اور لب ولہجے سے بھی واقفیت کرائی جائے گی۔

05.02 تمہید

کوئی بھی ادیب، شاعر یا فن کار اپنے عہد کے سیاسی، سماجی، معاشی اور تہذیبی اثرات سے بے نیاز نہیں رہ سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ اُس کی تخلیقات پر ان عوامل کی کہیں واضح اور کہیں دھُندلی پرچھائیاں ضرور نظر آتی ہیں۔ ان کے علاوہ اُس کی شخصیت پر خاندانی ماحول، نسلی امتیازات وموروثی خصوصیات اور تعلیم وتربیت کا بھی اثر پڑنا لازمی ہے۔ وہ جس مخصوص سماجی، تہذیبی اور سیاسی ماحول میں زندگی بسر کرتا ہے اُس کی تخلیقات اُس مخصوص ماحول کی آئینہ دار ہوتی ہیں۔ اگر دُرگا سہائے سرورؔ جہان آبادی کی شاعری کو اس کسوٹی پر پرکھا جائے تو وہ اصلی سونے کی طرح کھری نظر آئے گی۔ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں ہندوستانیوں کی شکست کو کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ عہدِ سرورؔ میں اس شکست کے اثرات نمایاں طور پر نظر آنے لگے تھے۔ انگریز حکمراں ہندوستانیوں کو آئینی گرفت میں جکڑتے جا رہے تھے۔ ظلم وتشدّد ہر ہندوستانی کا مقدّر بن چکا تھا۔ ایک طرف انتقام اور انقلاب کی زیریں لہروں کو دبانے کے لئے خوف وہراس کے ماحول کا سہارا لیا جارہا تھا تو دوسری طرف کچھ سماجی اور سیاسی تحریکیں ہندوستانیوں کے دلوں میں قومیت کا احساس پیدا کرنے کے لئے سرگرمِ عمل تھیں۔

سرورؔ جہان آبادی نے ایسے پُرآشوب اور رست خیز دَور میں اپنی شاعری اور بالخصوص نظموں کے ذریعے لوگوں کے دلوں میں آزادی کی روح پھونکنے کا قابلِ قدر کارنامہ انجام دیا۔ سرورؔ کو مادرِ وطن ہندوستان سے والہانہ عشق تھا۔ اُن کے کلام کا ایک بڑا حصّہ اس مُلک کی آزادی اور خوش حالی کے ارمانوں کا آئینہ دار ہے۔ اُن کے یہاں یہی ارمان کبھی حق وانصاف اور خیر وبرکت کا مطالبہ بن کر اُبھرتے ہیں تو کبھی سامراجی نظام اور ظلم کے خلاف شعلہ وشرارہ بن کر ظاہر ہوتے ہیں اور کبھی اعلیٰ اقدار، قومی روایات اور مشرقی تہذیب کی پامالی کے پُر درد مرثیے کی شکل میں رونما ہوتے ہیں۔ اگر آپ اس اکائی کا بغور مطالعہ کریں گے تو پتہ چلے گا کہ سرورؔ کے کلام میں ایک ایسا دھڑکتا ہوا دل ہے جس میں مادرِ ہند کی محبت وعظمت رچی بسی ہوئی ہے۔ انہوں نے عقیدت ومحبت سے سرشار ہوکر مادرِ وطن کی عظمت کے گیت گائے ہیں۔ اُن کی نظمیں ہندوستانی تہذیب وتمدّن، عقائد وروایات اور حُبّ الوطنی کے جذبے سے عبارت ہیں۔ آپ کو اس اکائی کے ذریعے یہ بھی پتہ چلے گا کہ محمد حُسین آزادؔ اور خواجہ الطاف حُسین حالیؔ نے جس نظمِ جدید کی بنیاد رکھی تھی اُسے سرورؔ اور اُن کے ہم عصر شعرا نے اپنے افکار وخیالات اور رنگ وآہنگ کے ذریعے شان دار عمارتوں میں تبدیل کر دیا۔

05.03 دُرگا سہائے سرورؔ کے حالاتِ زندگی

فن کار خواہ نثر نگار ہو یا شاعر وہ سماج کا فرد ہوتا ہے۔ وہ سماجی، سیاسی، اقتصادی اور دیگر محرّکات پر نظر بھی رکھتا ہے اور اُس سے متاثّر بھی ہوتا ہے۔ اِس لئے اُس کی تخلیقات کو سمجھنے کے لئے اُس وقت کے حالات کے ساتھ ساتھ فن کار کی حیات وشخصیت کے اہم پہلوؤں سے واقفیت بھی ضروری ہے۔ مُنشی دُرگا سہائے سرورؔ کی ولادت ضلع پیلی بھیت کے قصبہ جہان آباد میں پوس سمبت ۱۹۲۹ مطابق دسمبر ۱۸۷۳ء میں ایک معزز سکسینہ کایستھ خاندان میں ہوئی۔ اُن کے والد کا نام پیارے لال ہے۔ سرورؔ کے آباواجداد عہدِ شاہ جہاں میں دلّی سے کوچ کر کے جہان آباد میں آکر آباد ہو گئے تھے۔ اُن کے بزرگ اسی قصبے کے رئیس اور زمین دار تھے مگر گردشِ زمانہ کے سبب سرورؔ کی مالی حالت روز بروز بدتر ہوتی گئی۔ سرورؔ نے ابتدائی تعلیم اپنے گھر میں اپنے والد سے حاصل کی تھی۔ اس کے بعد انہیں قصبے کے اردو مڈل اسکول میں داخل کرا دیا گیا۔ وہ نہایت ذہین اور بیدار مغز طالبِ علم تھے۔ اس لئے ہر سال اپنی جماعت میں اوّل آتے تھے۔

انہوں نے اسی اسکول سے اردو مڈل کا امتحان ۱۸۹۰ء میں امتیاز کے ساتھ پاس کیا۔ سرورؔ کو شعروادب سے فطری لگاؤ تھا اور کتب بینی ان کا شوق تھا۔ ان کے نصاب میں ادب کے علاوہ تاریخ، ریاضی، طب، فلسفہ اور منطق وغیرہ مضامین بھی پڑھائے جاتے تھے جنہیں وہ دل لگا کر پڑھتے تھے۔ انہیں فلسفہ، تصوّف اور قدیم وجدید تاریخ سے بھی دل چسپی تھی۔ اسی لئے ان کے کلام میں تصوّف، فلسفہ اور تاریخی واقعات کا ذکر بھی پایا جاتا ہے۔ سرورؔ کے والد حکیم منشی پیارے لال نہایت شریف، بردبار، نیک، فراخ دل اور خداترس انسان تھے۔ ان کا شمار اپنے دَور کے نامور اطبا میں کیا جاتا تھا۔ جہان آباد اور قرب وجوار کے مریض علاج ومعالجے کے لئے ان سے رجوع کرتے تھے جن کا علاج وہ حسبِ ضرورت یونانی یا آیورویدک طریقے سے کرتے تھے۔ وہ اپنی مادری زبان اردو کے علاوہ سنسکرت اور فارسی میں بھی اچھّی استعداد رکھتے تھے۔ اگرچہ وہ خود شاعر نہیں تھے مگر شعروادب کے دل داہ اور اعلیٰ درجے کے سخن سنج ضرور تھے۔ انہیں شعروشاعری کا اس قدر شوق تھا کہ وہ باقاعدہ ہر ماہ اپنے مکان پر بزمِ شعروسخن کا اہتمام کرتے تھے اور مقامی شعرا کے علاوہ بیرونی شعرا کو بھی کبھی کبھی مدعو کرلیا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ وہ مشاعروں اور نشستوں میں شعرا کا کلام سننے کے لئے اکثر لکھنؤ اور دلّی بھی جایا کرتے تھے۔

اردو مڈل کا امتحان پاس کرتے ہی ۱۷ سال کی عمر میں سرورؔ کی شادی جہان آباد کے ایک معزز کایستھ خاندان میں کردی گئی۔ ان کی بیوی کا نام شنکر دیوی تھا۔ شنکر دیوی حُسنِ صورت اور حُسن سیرت کے ساتھ نہایت مہذّب، سلیقہ شعار، سعادت منداور شوہر پرست خاتون تھیں۔ سرورؔ بھی اپنی اہلیہ کے اس قدر شیدا تھے کہ عشق کی حد تک اُنہیں چاہتے تھے اور بڑے پیار سے دیوی کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔ یہی فریفتگی اُن کی اعلیٰ تعلیم کی راہ میں حائل ہوگئی کیوں کہ وہ جہان آباد کو چھوڑ کر باہر جانا نہیں چاہتے تھے۔ سرورؔ نے ''زنِ خوش خو'' کے عنوان سے ایک عمدہ نظم بھی کہی ہے جس کے متعلّق قیاس کیا جاتا ہے کہ اُنہوں نے اس نظم میں اپنی اہلیہ شنکر دیوی کے خصائل اور اوصافِ حمیدہ کا ذکر نہایت خوب صورت لب ولہجے میں کیا ہے۔ پیش ہیں اس نظم کے دو بند:

خوش چہرہ وخوش وضع، خوش اسلوب وخوش اندام دل سوز، دل افروز، دل آویز، دل آرام
گُل پیرہن و غنچہ لب و شاہدِ گلفام آسائشِ پہلو و شکیبِ دلِ نا کام
صورت ہے جو پاکیزہ تو سیرت بھی نکو ہے
خوش رنگ جو ہے پھول تو نکہت بھی نکو ہے

فرزانہ ہے، زیرک ہے، عقیلہ ہے، نکو ہوش کم گو ہے، مودّب ہے، رضا جو ہے، وفا کوش
صرفِ سخنِ خوب ہے، گاہے گہے خاموش آرامِ جگر، راحتِ جاں، زینتِ آغوش
حُسن اُس میں نہیں ہے کہ وفائیں نہیں اُس میں
ہاں کون سی پاکیزہ ادائیں نہیں اُس میں

اپنی شادی کے بعد سرورؔ قصبے کے ایک سب پوسٹ ماسٹر سے انگریزی زبان کی تعلیم حاصل کرنے لگے۔ اُنہوں نے بہت جلد انگریزی سیکھ لی اور دو سال ہی میں انگریزی مڈل کا امتحان بھی پاس کرلیا۔ اس کے بعد وہ اپنے طور پر بھی انگریزی ادب کی کتابوں کا مطالعہ کرتے رہے۔ وہ انگریزی زبان کے رومانی شعرا کیٹس، شیلی اور براؤننگ کے کلام کا مطالعہ نہایت دل چسپی سے کرتے تھے۔

اُنہوں نے انگریزی کی کئی بہترین نظموں کے اردو میں ترجمے بھی کیے۔اُن کے یہ تراجم روانی،سلاست اور شگفتہ اُسلوب کے سبب طبع زاد معلوم ہوتے ہیں۔سرورؔ کا آبائی پیشہ طبابت تھا۔اس لئے وہ بھی طب میں دل چسپی لینے لگے۔جہان آباد میں طب کی تعلیم کا کوئی انتظام نہیں تھا۔اس لئے انہوں نے اپنے والد سے آیورویداور یونانی طب کی تعلیم حاصل کی اور باقاعدہ طور پر علاج ومعالجہ کرنے لگے۔قدرت نے ان کے ہاتھوں میں شفا رکھی تھی۔دور دور سے لوگ ان کے پاس علاج کرانے کے لئے آتے تھے۔وہ دِق اور سرسام کے علاج میں مہارت رکھتے تھے۔ان کے والد کبھی کبھی ان سے علاج ومعالجے کے بارے میں مشورہ کرلیا کرتے تھے۔سرورؔ نے طب کے پیشے کو کبھی ذریعۂ معاش نہیں بنایا۔وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ طبیب کو رحم دل،کریم النفس اور خداترس ہونا چاہیے۔اُن کا خیال تھا کہ اللہ تعالیٰ اپنے خاص بندوں کو یہ صفت اس لئے عطا کرتا ہے کہ وہ لوگوں کے دُکھ درد کو دور کریں اور غریبوں کا علاج بھی خوش دلی سے کریں۔

سرورؔ کا ابتدائی کلام میرٹھ سے شائع ہونے والے رسائل کایستھ ہتکاری،آریہ سندیش اور انیسِ ہند میرٹھ میں شائع ہوتا تھا۔اخبار انیسِ ہنداور مطبع وِدّیادرپن میرٹھ کے مالک رام چندرویشیہ نے اُنہیں ۱۸۹۷ء میں میرٹھ بُلا لیا اور معقول مشاہرے کے عوض اخبار ومطبع کے اسسٹنٹ ایڈیٹر اور اسسٹنٹ مینیجر کے عہدے پر فائز کردیا۔یہ ملازمت اُن کے مزاج اور طبع کے موافق نہ تھی اس لئے وہ ۱۸۹۸ء میں اس سے دست بردار ہوگئے۔اس کے بعد ہلدور ضلع بجنور کے رئیس لالہ ڈال چند نے اُنہیں اپنے فرزند کا اتالیق مقرر کردیا۔سرورؔ نے اُن کے بیٹے کی تعلیم وتربیت کے ساتھ لالہ ڈال چند کو بھی شعر کہنا سکھادیا۔لالہ ڈال چند کی ایما پر انہوں نے چند ماہ سَو روپیے ماہ وار مشاہرے پر نہٹور کے راجا کے بچّوں کی تعلیم وتربیت کا کام بھی کیا۔سرورؔ نے نہٹور میں چھ سات مہینے کی مدّت ہی گزاری تھی کہ انہیں اپنی اہلیہ کے بیمار ہونے کی اطلاع ملی۔وہ فوراً جہان آباد آگئے اور اپنی بیوی کا علاج کرنے لگے۔نہ کوئی دوا کارگر ہوئی اور نہ دعاؤں ہی نے اثر کیا۔آخر کار دسمبر ۱۸۹۹ء میں اُن کی اہلیہ کی وفات ہوگئی۔اس صدمے نے اُن کی زندگی کی تمام مسرّتیں چھین لیں۔بس ان کی تسلّی اور ان کی امّیدوں کا سہارا ان کا ایک دوسال کا بیٹا تھا۔وہ اپنے بیٹے کی خاطر ملازمت چھوڑ کر گھر ہی پر رہنے لگے۔بیوی کے داغِ مفارقت سے وہ اس قدر رنجیدہ وملول رہتے تھے کہ انہوں نے شعر گوئی ترک کردی اور تقریباً تین سال تک ایک بھی شعر نہیں کہا۔بیوی کی وفات کا غم جب کچھ کم ہوا تو وہ اپنے قصبے کے قریبی گاؤں فتح گنج غربی کے رئیس عبدالواحد خاں کے پسر عبدالواجد خاں اور پیلی بھیت کے رئیس ساہو منگل سین کے بیٹے دامودر داس کے اتالیق مقرر ہوئے اور درس وتدریس کے فرائض انجام دینے لگے۔

اپنی اہلیہ کی وفات کا غم بھلانے کے لئے سرورؔ نے شراب پینی شروع کردی۔رسالہ زمانہ،کان پور کے مدیر منشی دیانرائن نگم نے ۱۹۰۵ء میں انہیں کان پور بُلا لیا اور زمانہ کے مینیجر کی حیثیت سے اُن کی تقرری کردی۔وہ نظموں کا معاوضہ شراب کی نذر کردیتے تھے اور طبابت کو ذریعۂ معاش بنانا نہیں چاہتے تھے۔لہٰذا رفتہ رفتہ ان کی مالی حالت بدتر ہوتی گئی۔نومبر ۱۹۰۶ء میں سرورؔ کو اپنے اکلوتے بیٹے کے بیمار ہونے کی خبر ملی۔وہ کان پور سے جہان آباد آگئے۔ان کے بیٹے کو نمونیا ہوگیا تھا۔وہ رات دن ایک کرکے تیمارداری اور علاج کرتے رہے مگر بیٹا جاں بَر نہ ہو سکا۔آخر کار اس کا بھی انتقال ہوگیا۔رفیقۂ حیات کی وفات کے بعد بیٹے کے انتقال نے انہیں رنج ومحن کا مجسّمہ بنادیا۔انہوں نے خاموشی اختیار کرلی اور ان کی آنکھوں کے آنسو خشک ہوگئے۔ان کے والد نے بیوی اور بیٹے کے انتقال کا غم بھلانے کے لئے اس روز انہیں بہت زیادہ

شراب پلا دی مگر اس شراب نے ان کا غم غلط کرنے کے بجائے ان کے غم میں اور اضافہ کر دیا۔ وہ اپنے جگر گوشہ کو نذرِ آتش کرنے کے بعد اپنے ایک دوست منشی عبداللہ خاں کے مکان میں نڈھال ہو کر بیٹھ گئے۔ انہوں نے وہیں بیٹھے بیٹھے اپنے جواں مرگ بیٹے کے لئے ایک لوری نظم کی اور لوری لکھے ہوئے اس کاغذ کو اپنے دوست کے ہاتھ پر رکھ کر چلتے بنے۔ بطورِ نمونہ پیش ہیں اس لوری کے چند اشعار:

کسی مستِ خواب کا ہے عبث انتظار سو جا کہ گذر گئی شب آدھی ، دلِ بے قرار سوجا
یہ نسیم ٹھنڈی ٹھنڈی ، یہ ہَوا کے سرد جھونکے تجھے دے رہے ہیں لوری ، مرے غم گسار سوجا
نہ تڑپ زمیں پہ ظالم ، تجھے گود میں اُٹھا لوں تجھے سینے سے لگا لوں ، تجھے کرلوں پیار سوجا

سرورؔ غالباً ۱۹۰۷ء میں زمانہ کان پور کی ملازمت سے سبک دوش ہو گئے اور مستقل طور پر جہان آباد ہی میں رہنے لگے۔ اس دوران اُن کا کلام مخزن، زمانہ، تنویر الشرق کلکتہ، شمس بنگالہ کلکتہ، عصمت دلّی، ادیب الٰہ آباد، اُردوئے معلّٰی علی گڑھ اور زبان دہلی وغیرہ میں شائع ہوتا تھا۔ سرورؔ کا مجموعۂ کلام انڈین پریس الٰہ آباد سے طبع ہونے والا تھا جس کا پروف پڑھنے کے لئے وہ ۲۹ر نومبر ۱۹۱۰ء کو جہان آباد سے الٰہ آباد کے لئے روانہ ہوئے۔ پیلی بھیت پہنچتے ہی ان کے سینے میں درد ہونے لگا۔ شراب نوشی کی کثرت کی وجہ سے ذات الجنب کا عارضہ لاحق ہو گیا تھا۔ علاج معالجے اور تمام کوششوں کے باوجود اُن کی جان بچائی نہ جا سکی۔ ۳ر دسمبر ۱۹۱۰ء کو اُن کی رحلت ہو گئی اور جدید اُردو شاعری کا یہ آفتاب ہمیشہ کے لئے غروب ہو گیا۔

﴿تصنیفات﴾: سرورؔ کے مجموعۂ کلام ''جامِ سرور، خم خانۂ سرورؔ اور خم کدۂ سرورؔ'' کے علاوہ کئی کتابچے بھی زیورِ طبع سے آراستہ ہو چکے ہیں جن کا ذکر یہاں بطورِ تعارف ضروری ہے۔ پنڈت لیکھ رام آریہ مسافر کی ناگہانی وفات سے متاثر ہو کر سرورؔ نے ایک پُر درد مرثیے کے علاوہ مسدّس، مخمّس اور رباعیات بھی کہی تھیں جنہیں ''خونِ ناحق'' کے عنوان سے ایک کتابچے کی شکل میں شائع کیا گیا تھا۔ اُن کا دوسرا کتابچہ ''نیرنگِ قلق'' ۱۸۹۸ء میں منظرِ عام پر آیا۔ اس کتابچے میں بھی پنڈت لیکھ رام آریہ مسافر کی وفات سے متاثر ہو کر کہے گئے کلام کو شامل کیا گیا ہے۔ اس کتابچے کو ''خونِ ناحق'' کا تتمّہ کہا جانا چاہیے۔ ''دشنۂ قلق'' سرورؔ کا ایک اہم کتابچہ ہے جس میں پچھتّر بند پر مشتمل ایک مسدّس کو شامل کیا گیا ہے۔ ''نشترِ ماتم'' سولہ صفحات کا کتابچہ ہے جس میں ایک غم نصیب بیوہ کی داستانِ حسرت ناک کو مسدّس کی شکل میں نظم کیا گیا ہے۔ ''نالۂ خوں چکاں و مثنوی سوزِ فغاں'' بھی ایک غم نصیب بیوہ کی حسرت ناک کہانی ہے جو دو مثنویوں پر مشتمل ہے۔ ''شیون'' ایک منظوم ڈراما ہے۔ اس ڈرامہ میں بھی ایک ستم رسیدہ بیوہ کی داستانِ حیات کو نظم کیا گیا ہے۔ اس کتابچے کے سرورق پر مندرج شعر رقم کیا گیا ہے:

فغاں میں، آہ میں، فریاد میں، شیون میں، نالے میں سناؤں دردِ دل طاقت اگر ہو سننے والے میں

''ہنگامۂ محشر'' سرورؔ کے ایک مختصر ناول کا نام ہے مگر اس کی کوئی جلد اب تک دستیاب نہیں ہو سکی ہے۔ قیاس ہے کہ یہ ناول ۱۸۹۷ء میں شائع ہوا ہوگا۔ حُسن و عشق کے موضوع پر سرورؔ نے ''وصال'' نامی ایک دل چسپ ناول تخلیق کیا تھا۔ یہ ناول بھی اب نایاب ہے۔ اس ناول میں حُسن و عشق کے معاملات کو اچھوتے پیرایے میں بیان کیا گیا ہے۔ کچھ کتابوں کی پُشت پر اس ناول کا اشتہار شائع ہوتا تھا جس کا آغاز اس شعر سے کیا جاتا تھا:

شبِ وصال کی ہتھ پھیریاں خدا کی پناہ مَلے دَلے گئے کیا کیا شباب کے پھوڑے

سرورؔ کی نظموں کے پہلے مجموعۂ کلام کا نام ''جامِ سرورؔ'' ہے جسے وہ خود مرتّب کر رہے تھے مگر یہ مجموعہ اُن کی وفات کے بعد شائع ہوا۔ وہ نومبر ۱۹۱۰ء میں اس مجموعے کا پروف دیکھنے کے لئے الٰہ آباد جا رہے تھے کہ پیلی بھیت پہنچتے ہی وہ دردِ سینہ میں مبتلا ہو گئے۔ تمام علاج کے باوجود ۳؍دسمبر ۱۹۱۰ء کو اُن کی وفات ہو گئی۔ اس لئے اُن کا یہ مجموعۂ کلام اُن کی وفات کے بعد منظرِ عام پر آیا۔ یہ مجموعہ ۸۰؍نظموں اور ۱۴؍ رباعیوں پر مشتمل ہے۔ سرورؔ کے دوسرے مجموعے کا نام ''خم خانۂ سرورؔ'' ہے جو مارچ ۱۹۱۱ء میں زمانہ پریس کان پور سے شائع ہوا تھا۔ اس مجموعے میں شامل نظموں کی تعداد ۴۹؍ ہے۔ اس میں وہی نظمیں شامل کی گئی ہیں جو رسالہ زمانہ کان پور کے مختلف شماروں میں شائع ہو چکی تھیں۔ جامِ سرورؔ اور خم خانۂ سرورؔ میں ۴۷؍نظمیں مشترک ہیں۔ مختلف اخبار و رسائل میں سرورؔ کے منتشر کلام کو قاضی محمّد غوث فضاؔ حیدر آبادی نے نہایت تلاش و مشقّت سے یکجا کیا تھا اور اسے ''خم کدۂ سرورؔ'' کا نام دے کر زیورِ طبع سے آراستہ کیا تھا۔ اس مجموعے میں ایک نایاب نثری مضمون اور کئی ایسی نظموں کی شمولیت ہے جو کسی مجموعے میں شامل نہیں ہیں۔ سرورؔ جہان آبادی کے منتخب کلام کے مجموعے کا نام ''نوائے سرورؔ'' ہے جسے ڈاکٹر حکم چند نیّر نے مرتّب کیا ہے۔ اس انتخاب کو ادارہ روزنامہ ہندوستان، بنارس نے ۱۹۶۷ء میں شائع کیا تھا۔

05.04 دُرگا سہائے سرورؔ کی وطنی و قومی شاعری

سرورؔ جہان آبادی نے مختلف موضوعات پر طبع آزمائی کی ہے۔ انہوں نے مذہبی اور تاریخی واقعات پر بھی کئی بہترین نظمیں کہی ہیں۔ اُن کی نظمیں حُسنِ فطرت اور مظاہرِ قدرت کی بہترین تصاویر ہیں۔

اس حصّے میں سرورؔ کی قومی و وطنی شاعری کا مختصر جائزہ لیا جا رہا ہے۔ حبّ الوطنی ایک فطری جذبہ ہے جو اپنے مُلک اور اہلِ وطن کی خیر خواہی، ہم دردی، ترقّی اور وفاداری سے عبارت ہے۔ یہی جذبہ مختلف حالات میں مختلف طریقوں سے رونما ہوتا ہے، کبھی یہ اخلاقی اقدار اور مذہبی فریضے کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے تو کبھی جذباتی لگاؤ اور سیاسی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔ غلامی، محکومی اور تنزّلی کے دَور میں اس جذبے کو کچھ زیادہ ہی تقویت حاصل ہوتی ہے۔ سرورؔ کی پیدائش بیسویں صدی کے آغاز میں ہوئی تھی۔ وہ اُس دَور کے شاعر ہیں جب ہندوستان میں اصلاحی اور سیاسی تحریکیں بڑی حد تک آپس میں مل جُل کر سرگرمِ عمل تھیں۔ وطن کی جغرافیائی حدود کی اہمیت کم ہوتی جا رہی تھی اور اس میں وسعت بھی پیدا ہو رہی تھی۔ حبّ الوطنی کا تصوّر بڑی تیزی سے پروان چڑھ رہا تھا، سیاسی جدّ و جہد تیز سے تیز تر ہوتی جا رہی تھی اور ہندوستان انقلاب و آزادی کے دَور میں داخل ہو رہا تھا۔

سرورؔ کے جسم کا خمیر اسی مُلک کی مٹّی سے اُٹھا تھا۔ انہوں نے اسی مُلک اور اسی ماحول میں اپنی آنکھیں کھولیں تھیں۔ وہ یہیں پلے بڑھے اور جوان ہوئے تھے۔ یہاں کی فضاؤں میں رچے بسے جذبات و احساسات اور فکر و شعور نے ان کی پرورش کی تھی۔ اسی لئے انہیں اس ماحول اور اس مُلک کے ذرّے ذرّے سے لگاؤ تھا۔ سرورؔ کی حبّ الوطنی کی ایک وجہ اُن کا آریہ قوم کا فرد بھی ہونا ہے۔ آریہ قوم تقریباً تین ہزار سال قبل ہندوستان میں آ کر آباد ہو گئی تھی۔ اُن کی تہذیب کا بیش تر حصّہ یہیں پروان چڑھا۔ وہ اسی مُلک میں آباد ہوئے، یہیں اُن کی نسلیں پیدا ہوئیں، پھلیں پھولیں اور اسی کی خاک میں مِل گئیں۔ وہ اسی مُلک کو اپنا مُلک اور وطن تصوّر کرتے تھے اور اسی کی محبت میں سرشار بھی رہتے تھے۔ وہ یہاں کی دھرتی کو ماتر بھومی یا مادرِ وطن تصوّر کرتے تھے۔ ماں اور دیوی کی طرح اس کی پوجا اور پرستش بھی کرتے تھے۔ سرورؔ نے بھی اسی آریہ قوم میں اسی دھرتی کی کوکھ سے جنم لیا تھا اور اسی ماحول میں اُن کی پرورش و تربیت بھی ہوئی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے رگ و پے میں حُب الوطنی کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔

دراصل سرورؔ کی شاعرانہ زندگی کا آغاز مُلکِ ہند کی آزادی اور خوش حالی کے ارمانوں سے ہوا ہے۔ یہی جذبات واحساسات اور یہی ارمان ان کے شعری وجدان کے لئے تحریک بن کر اُبھرتے ہیں۔ ان کے یہاں اِنہی ارمانوں اور جذبات کی نمود مختلف شکلیں اختیار کر لیتی ہے۔ کبھی یہ جذبہ خیر سگالی، امن، انصاف اور مساوات کا مطالبہ بن کر اُبھرتا ہے تو کبھی سامراجی نظام اور ظلم کے خلاف شعلے کی مانند ظاہر ہوتا ہے، کبھی ماضی کی عظمت ورفعت کی یاد دلاتا ہے تو کبھی قومی روایات اور اعلیٰ اقدار کی پامالی کے پُر درد مرثیے کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ سرورؔ اپنے آباواجداد کے بے مثال کارناموں کو اپنے احساسات میں تازگی اور زندگی میں حرکت وگرمی پیدا کرنے کا ذریعہ سمجھتے ہیں اور اُن پر فخر بھی کرتے ہیں۔ پیش ہے ان کی ایک نظم ''خاکِ وطن'' کا ایک بند:

آہ اے خاکِ وطن! اے دردمند و بے قرار! آہ اے شوریدہ قسمت! اے پریشاں روزگار!
اُڑ رہا تھا تیرا پرچم شوکتِ افلاک پر سرنگوں ہے تیری عظمت کا نشاں اب خاک پر
تیری شہرت کے نگیں خاکِ عدم میں ہیں نہاں اب نہ وہ تختِ مرصّع ہے نہ تاجِ زَر فشاں
جھلملا کر بُجھ گئے سب تیرے ایواں کے چراغ ہیں جگر کے داغ اب تیرے شبستاں کے چراغ

سرورؔ اُردو کے پہلے ایسے شاعر ہیں جنہوں نے وطن کے لئے مقدّس ماں اور دیوی کا تصور پیش کیا۔ عقیدے کی طہارت اور خلوص و محبت نے اُن کے نغمات میں عبادت کی شان پیدا کر دی ہے یعنی اُن کی حُبّ الوطنی ایک پرستارِ وطن کی پرستش کے درجے کی چیز بن کر سامنے آتی ہے۔ کلامِ سرورؔ میں مادرِ وطن کے لئے عزّت واحترام کا جو جذبہ پایا جاتا ہے وہ آج بھی ایک بلند ترین نقطہ ہے۔ انہوں نے اپنی ایک نظم بہ عنوان ''مادرِ ہند'' میں وطن کو مادرِ مشفق، مادرِ دل سوز، مادرِ دم ساز اور خلد کی پاک دیوی جیسے مقدّس القاب سے مخاطب کیا ہے۔ دیکھیے وہ کس احترام سے گویا ہوتے ہیں:

ظلِّ شفقت ہو ترا اے مادرِ مشفق ! دراز خاک پر کیا کیا تری ، تیرے مکینوں کو ہے ناز
سرزمینِ عیش ہے اے مادرِ دل سوز! تو آرزوؤں کی ہے بزمِ انبساط افروز ! تو
آسماں کے نور کی ہے جلوہ گاہِ ناز تو خلد کی ہے پاک دیوی ، مادرِ دم ساز تو

یہی نہیں انہوں نے مادرِ وطن کو لکشمی، سرسوتی اور دُرگا دیوی کے پیکر میں ڈھال کر اپنی بے پناہ عقیدت ومحبت کا ثبوت بھی فراہم کیا ہے وہ کہتے ہیں:

تیرا دیواستھان دیوی! دل کے کاشانے میں ہے تیری تصویرِ مقدّس ہر صنم خانے میں ہے
لکشمی ہے تو ، زمانے میں اُجالا ہے ترا ہر کنول کا پھول ، پانی میں شوالا ہے ترا
سَرسوَتی کا روپ ہے ، دُرگا کا ہے اوتار تو نطق و دانش کی ہے دیوی ، مادرِ غم خوار تو

واہ! سُندر چھَب تری ، یہ سانولی صورت تِری
دل کے مندر کی ہے زینت موہنی مورت تِری

حُبّ الوطنی کے جذبے سے معمور ''عروسِ حُبِّ وطن'' سرورؔ کی ایک منفرد انداز کی نظم ہے۔اس نظم کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ اس نظم میں وطن کو قدرِاعلیٰ کی حیثیت حاصل ہے۔وطن کے ساتھ ان کی تمام آرزوئیں اور تمنّائیں وابستہ ہیں۔وہ اسے ہم سفر اور شریکِ زندگی بھی تصوّر کرتے ہوئے مذہب وملّت ،فرقہ ومصلحت غرض کسی بھی شے یا فرد کو حُبّ الوطنی کے درمیان حائل نہیں کرنا چاہتے۔وہ وطن کو ایک ایسا پرستش کدہ تصوّر کرتے ہیں جہاں ناقوس واذاں، کُفر ودیں اور شیخ وبرہمن کے درمیان کوئی امتیاز وتفریق نہیں۔اسی لئے وہ وطن کے لئے بڑی سے بڑی قربانی دینے کے لئے بھی تیّار رہتے ہیں۔وہ عروسِ حُبِّ وطن کو مخاطب کرتے ہوئے اپنی تمنّاؤں اور آرزوؤں کا اظہار کس قدر لطیف پیرایے میں کرتے ہیں،پیش ہیں چند اشعار:

آ ! اے عروسِ حُبِّ وطن میرے بر میں تو　　آنکھیں تری تلاش میں ہیں محوِ جستجو
آ ! اے نگار تجھ کو گلے سے لگاؤں مَیں　　آ ! مجھ سے ہم کنار ہو اے شوخ، خوش گلو
ٹوٹیں وہ پاؤں جن کو نہ تیری تلاش ہو　　پھوٹے وہ آنکھ جس کو نہ ہو تیری جستجو
وہ گھر ہو بے چراغ جہاں تیری ضو نہ ہو　　وہ دل ہو داغ جس میں نہ ہو تیری آرزو
ناقوس اور اذاں میں نہیں قیدِ کفر و دیں　　اُس کے لئے کہ جس کا پرستش کدہ ہے تو
جلوہ نہ ہو کسی بُتِ رعنا کا سامنے　　وہ دن خدا کرے کہ ہو آنکھوں میں تو ہی تو

سرورؔ ایک سچّے وطن پرست شاعر ہیں۔اُن کے یہاں حُبِّ وطن کا جذبہ نہایت عظیم اور بلند ہے۔وہ شمعِ انجمن کی طرح سوزِ غمِ وطن میں ہمیشہ جلتے رہتے ہیں جس کا اظہار انہوں نے شمعِ انجمن کو مخاطب کرتے ہوئے اپنی ایک نظم ''شمعِ انجمن'' میں اس طرح کیا ہے:

راتوں کو جس طرح تُو جلتی ہے انجمن میں　　جلتا ہوں مَیں بھی یوں ہی سوزِ غمِ وطن میں
لپٹے ہوئے ہیں شعلے دونوں کے پیرہن میں　　آتش بجاں ہیں دونوں اس محفلِ کہن میں
یعنی گدازِ الفت دونوں کے ہے دلوں میں
دونوں کی روشنی ہے دنیا کی محفلوں میں

حُبِّ وطن کے اظہار کے جو مختلف طریقے سرورؔ نے اپنائے ہیں وہ طریقے اُردو کے کسی شاعر کے یہاں نظر نہیں آتے۔گلِ لالہ ایک قِسم کا سُرخ پھول ہوتا ہے جس کے اندر سیاہ داغ ہوتا ہے۔سرورؔ اپنی ایک مشہور نظم ''لالۂ صحرا'' میں گلِ لالہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اگر مجھے صحرا میں تھوڑی سی جگہ مل جائے اور تیرا ساتھ میسّر ہو جائے تو مَیں یہ واضح کرنے کی کوشش کروں کہ مَیں بھی تیری ہی طرح ایک شرارِ غم ہوں جس کے سینے میں حُبِّ وطن کے تپِ دروں کے پھپھولے اور جگر میں تیری ہی طرح سیاہ داغ ہیں یعنی میرے سینہ وجگر وطن کی بہارِ باغ کے بہترین نمونے ہیں:

ذرا سی رہنے کو دے کُنج دل نشیں میں جگہ　　مجھے بھی تھوڑی سی صحرا کی سرزمیں میں جگہ
شرارِ غم ہوں، دلِ داغ آفریں میں جگہ　　ملے اگر ترے آغوشِ نازنیں میں جگہ
دکھاؤں اپنے وطن کی بہارِ باغ تجھے　　تپِ دروں کے پھپھولے، جگر کے داغ تجھے

سرورؔ اپنے عہد کے سیاسی شعور کی بیداری اور سماجی ترقّی کے احساس سے پوری طرح متاثر تھے۔ جغرافیائی حدود کی وسعت، تعلیم کے فروغ اور اخبار و رسائل کی اشاعت سے سیاسی شعور اور قومی ہم آہنگی میں بتدریج اضافہ ہو رہا تھا۔ معاشی بدحالی، بے انصافی، جبر، استبداد اور استحصال نے ہندوستانیوں کو افلاس و پس ماندگی میں زندگی گزارنے کے لئے مجبور کر دیا تھا۔ ہر ہندوستانی احساسِ کمتری کا شکار تھا۔ ایسے نازک اور ابتر حالات میں سامراجی طاقتوں کے خلاف ردِّ عمل ہونا ہی تھا۔ جسے سرورؔ بھی شدّت سے محسوس کر رہے تھے۔ اسی ردِّ عمل کے تحت سرورؔ نے اُس وقت ہندوستانیوں میں بیداری پیدا کرنے کے لئے مادرِ وطن کی عظمت کے گیت گائے۔ ہندوستان کی عظمتِ رفتہ کی داستانیں نہایت مؤثر پیرایے میں پیش کیں۔ اُن کی نظمیں خاکِ وطن، لکشمی جی، سرزمینِ وطن، نیرنگِ زمانہ، قومی نوحہ، چتّوڑ کی گذشتہ عظمت اور شیونِ عروس وغیرہ عظیم ہستیوں کے کارناموں سے بھری ہوئی ہیں۔ پیش ہیں اُن کی نظم ''چتّوڑ کی گذشتہ عظمت'' کے چند اشعار:

خاک میں تیری بسالت کے وہ جوہر ہیں کہاں — سرنگوں ہے اب زمیں پر تیری عظمت کے نشاں
رزم گہ میں باندھ کر اپنی ہَوا دو چار دن — کھول کر کیوں تُو نے رکھ دی آہ تیغ خوں فشاں
خوں رلاتی ہے تیری نوکِ سناں کو دل کی یاد — بن کے نشتر لیتی ہے اب تک جگر میں چٹکیاں
او کماں کش! یاد کر کے کارناموں کو ترے — روتی ہے رکھ رکھ کے پلّا تیر کا مُنہ پر کماں
کارناموں کو ترے بھولی نہیں وہ سر زمیں — تیری عظمت کی ہے اب تک آہ لب پر داستاں

سرورؔ کی حُبّ الوطنی مذہب کی طرح عظیم ہے۔ وہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین تفریق کے قائل نہیں۔ وہ رنگ و نسل، ذات پات، فرقہ و مذہب اور علاقہ و زبان سے بالاتر ہو کر وطنِ ہند سے محبت کرتے ہیں۔ وہ جس شان و شوکت سے ہندو عہد کے ہندوستان کی عظمت کے گیت گاتے ہیں، اُسی خلوصِ دل سے مسلم عہد کے ہندوستان کا تذکرہ بھی کرتے ہیں۔ انہوں نے مغلیہ عہد کی تنزّلی اور پامالی کا ذکر نہایت دردانگیز لہجے میں کیا ہے۔ انہیں صرف ایک عظیم سلطنت کے ختم ہونے کا افسوس نہیں تھا بلکہ ایک بے مثل تہذیب اور عظیم کلچر کے مٹ جانے کا شدید ملال تھا۔ وہ کہتے ہیں:

جس پہ لہرایا کیا صدیوں تک اسلامی نشاں — نذرِ طوفاں ہو گیا وہ تختۂ عہدِ کہن
خانہ ویرانی برستی ہے در و دیوار پر — نقشِ عبرت اب ہیں آثارِ صنادیدِ کہن
رزم میں تھی گُل کھلاتی جن کی تیغِ خوں فشاں — اُن کے مرقد پر ہے پھولا لالۂ خونی کفن
چھپ گئے کتمِ عدم میں کیسے کیسے حکمراں — لگ گیا افسوس کس کس ماہِ کامل کو گہن
سر پہ دِلّی کے جہاں داری کا سہرا اب کہاں — شاہدِ ماتم نشیں ہے اب یہ البیلی دُلہن

سرورؔ جہان آبادی کی وطنی شاعری کو ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی سے الگ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کی ناکامی نے ہندوستانیوں کے حوصلے پست کر دیے تھے۔ سرورؔ کے دل و ذہن پر بھی اس ناکامی کے گہرے اثرات مرتّب ہوئے۔ ہندوستانیوں کی پسپائی کے بعد انگریزی حکومت کی بنیادیں کافی مضبوط اور مستحکم ہو گئیں تھیں۔ انگریزوں کا ظلم و ستم شدید سے شدید تر ہوتا جا رہا تھا۔ باہمی خلفشار، سماجی اضطراب اور طبقاتی کشمکش کے اس نازک دَور میں سرورؔ جہان آبادی نے مادرِ وطن کی عظمت کے گیت گائے اور اپنی نظموں کے ذریعے حُبّ الوطنی، قوم پرستی، اتّحاد، یگانگت، ایثار و قربانی اور جدّ و جہد کا درس دے کر بے مثل کارنامہ انجام دیا۔

05.05 دُرگا سہائے سروؔر کی نظم نگاری

دُرگا سہائے سروؔر کو شعر و سخن سے فطری لگاؤ تھا۔ اُنہوں نے شروع میں اپنا تخلص وحشتؔ اختیار کیا تھا مگر کچھ عرصے کے بعد وہ وحشتؔ سے سروؔر ہو گئے اور اسی سے مشہور بھی ہوئے۔ شعر و شاعری میں سروؔر کے اساتذہ کے بارے میں مؤرّخوں اور تذکرہ نگاروں میں اختلافات ہیں۔ بعض کے مطابق انہوں نے کسی کی شاگردی اختیار نہیں کی تھی اور بعض کے مطابق وہ کرامت حُسین بہادر، میر بیان، یزدانؔی میرٹھی اور جنگ بہادر جنگؔ میرٹھی سے شعر گوئی میں مشورہ لیا کرتے تھے۔ وہ جدید اُردو شاعری کی تحریک کے ایک اہم رکن اور ممتاز شاعر تھے۔ اُن کا شمار اُردو نظم کے اوّلین معماروں میں کیا جاتا ہے۔ اُن کی نظموں کے موضوعات اپنے عہد کے شعرا سے ہم آہنگ بھی ہیں اور منفرد بھی۔ ہم آہنگ اس لئے کہ متعدد شعرا نے ایک ہی موضوع یا ایک جیسے موضوعات پر اپنی اپنی فکر کے موافق نظمیں لکھیں اور منفرد اس لئے کہ متعدد موضوعات پر سب سے پہلے سروؔر ہی نے طبع آزمائی کی ہے۔

سروؔر کا ایک اہم کارنامہ یہ بھی ہے کہ بیسویں صدی کے آغاز تک اُردو شاعری کے جو قدیم و جدید رجحانات ایک دوسرے سے مختلف و متضاد تھے انہیں وہ بڑی حد تک نہ صرف قریب لائے بلکہ اُنہیں ایک دوسرے میں پیوست بھی کر دیا۔ دراصل انہوں نے جدید شاعری کو جلا بخشنے اور مقبولِ خاص و عام بنانے کے لئے خارجی اور داخلی عناصر کے ساتھ شاعری کے قدیم و جدید تصوّرات و اقدار کے خوش گوار امتزاج سے ایک نئے اُسلوب، رنگ و آہنگ اور لب و لہجے کی بنیاد ڈالی۔ یہی نہیں بلکہ مواد اور موضوع کی نئی وسعتوں سے بھی اُردو شاعری کو روشناس کرایا۔ تخّیل کی تازگی، جذبے کی گرمی اور بلند خیالی سے جدید نظم کو ایک خاص قسم کی رعنائی اور تب و تاب عطا کر کے اس قابل کر دیا کہ وہ بے جھجھک غزل سے آنکھیں ملا سکے۔ اس اعتبار سے بھی جدید نظم کی تعمیر و تشکیل میں سروؔر جہان آبادی کی خدمات قابلِ قدر اور لائق تحسین ہیں۔

سروؔر کے کلام کا ایک بڑا حصّہ قوم و وطن کی محبت اور عظمت کے نغمات پر مشتمل ہے۔ وہ قوم و وطن کا ذکر کئی پہلوؤں سے کرتے ہیں۔ اُنہیں مادرِ وطن ہندوستان سے والہانہ عشق ہے۔ وہ اس سرزمین کے چپّے چپّے اور ذرّے ذرّے سے محبت کرتے ہیں اور اسی وارفتگی کی وجہ سے اُن کے کلام میں ایران و عرب کی روایتی اشیا کے ساتھ خالص ہندوستانی عناصر کی بھی جلوہ گری ہے۔ اُن کے کلام میں ہندو دیوی دیوتا، ہندوستان کے پہاڑ، دریا، اشیا، پھل پھول، چرند پرند، آب وہوا، جھرنے، جھیل، موسم اور دیگر اشیا اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ نظر آتی ہیں۔ یہی نہیں اُن کے یہاں ہندوستان کی قدیم و جدید تاریخ، روایات، رسوم و عقائد اور تہذیب و تمدّن کا ذکر بھی نہایت گہرائی اور گیرائی کے ساتھ نظر آتا ہے۔

سروؔر نے دیگر اصنافِ سخن کی بہ نسبت نظمیں زیادہ کہی ہیں۔ وہ روزمرّہ کے واقعات و مسائل کو دلچسپ طریقے سے بیان کرنے پر قدرت رکھتے ہیں۔ اُنہیں تصنّع، بناوٹ اور مبالغہ آرائی پسند نہیں۔ اسی لئے اُن کا کلام حقائق کا آئینہ دار ہے۔ وہ الفاظ کے انتخاب میں بہت احتیاط برتتے ہیں۔ اُنہیں اُردو اور فارسی کے ساتھ ہندی زبان و ادب سے بھی واقفیت تھی۔ اسی لئے وہ فارسی تشبیہات و تراکیب اور ہندی زبان کے الفاظ کے استعمال سے کلام میں زور و اثر اور چستی و روانی پیدا کرنے میں قدرت رکھتے تھے۔ سروؔر کی حبّ الوطنی، قوم پرستی اور اُن کے کلام میں موجود کیف و سرمستی اُردو شاعری کے لئے کسی گراں قدر تحفے سے کم نہیں۔ قوم و وطن سے والہانہ محبت کا ثبوت اُن کی زندگی کے حالات و واقعات سے فراہم کیا جا سکتا ہے۔

مولانا محمد حُسین آزاد اور خواجہ الطاف حُسین حالی جدید اُردو شاعری کے اوّلین معمار تسلیم کیے جاتے ہیں جن کی نیچرل شاعری نے جدید اُردو شاعری کی تحریک کی بنیاد ڈالی۔ سرور جہان آبادی کا شمار بھی جدید اُردو شاعری کے اہم معماروں میں کیا جاتا ہے۔ عہدِ سرور میں قدیم وجدید دَور کے نظریاتِ شعر میں کافی اختلافات رونما ہو گئے تھے۔ سرور نے دونوں اَدوار کے نظریاتِ شعر میں بڑی حد تک مفاہمت کرانے کی کوشش کی۔ اُنہوں نے قدیم اور جدید ادب کا گہری نظر سے مطالعہ کیا اور کھُلے ذہن سے دونوں اَدوار کی خوبیوں، خامیوں، اعتراضات و اعترافات پر غور وخوض کیا۔ اس کے بعد صالح کلاسیکی روایات اور جدید نظریات کی مدد سے نئی ادبی قدروں کی بنیاد رکھی۔ اس طرح انہوں نے شعروادب کے قدیم تصوّرات اور جدید نظریات کو ہم آہنگ کرنے کا بے مثل کارنامہ انجام دیا۔

سرور نے نظموں کی بہ نسبت غزلیں بہت کم کہی ہیں۔ انہوں نے زندگی کے گوناں گوں مسائل سے اپنے کلام میں ندرت وتنوّع پیدا کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ وہ ایک قادرالکلام شاعر تھے۔ نظم گو کی حیثیت سے ان کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ سرور کو اپنے گردوپیش کے ماحول سے بہت لگاؤ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے کلام میں مقامی رنگ کثرت سے نمایاں ہے۔ اُن کی متعدد نظمیں حُسنِ فطرت اور اپنے گردوپیش کے مناظر کی بہترین تصاویر ہیں جنہیں پڑھ کر اُن کی خوش طبعی اور مناظرِ قدرت سے اُن کی گہری وابستگی اور شعوری تعلّق کا پتہ چلتا ہے۔ اُن کا مقامِ پیدائش ایک سرسبز وشاداب خطّہ جہان آباد ضلع پیلی بھیت ہے جس کے اطراف کی سرسبزی، شادابی، رنگینی اور دل کشی اُن کا دل کھینچتی رہتی تھی۔ نور کے تڑکے بہنے والی ٹھنڈی ٹھنڈی ہَوائیں، آسمان پر چھائی ہوئی اُودی اُودی گھٹائیں، طائرانِ خوش الحان کی نغمہ سرائیاں، ندیوں، جھیلوں اور چشموں سے اٹھنے والی لہریں اور کیف انگیز فضائیں انہیں مست و بے خود کر دیتی تھیں۔ یہی نہیں بلکہ شباب ومحبت سے سرشار سرور کائنات کی جس چیز پر نظر ڈالتے تھے وہ انہیں حسین وخوب صورت نظر آتی تھی۔ اُن کا تخیّل مناظرِ فطرت اور خارجی آثار وکوائف کی تجسیم کر کے اس طرح پیش کر دیتا ہے کہ پورا منظر نگاہوں کے سامنے پھر جاتا ہے۔ دراصل سرور مناظرِ قدرت کو حُسن کے مرقعے میں ڈھالنے اور اُسے مجسّم حُسن کی حیثیت سے پیش کرنے میں بلا کی مہارت رکھتے ہیں۔ وہ کس خوب صورت انداز سے نسیمِ سحر کی پیکر تراشی کرتے ہیں۔

ملاحظہ فرمائیں:

گھونگھٹ اُلٹ اُلٹ کے رُخِ نازنیں سے تو کرتی ہے چھیڑ سلسلۂ عنبریں سے تو
ہونے کو ہم کنار گُل و یاسمیں سے تو چلتی ہے بس کے عطر میں خلدِ بریں سے تو

یوں دھیمی دھیمی آتی ہے تاروں کی چھاؤں میں
مہندی لگا کے جیسے چلے کوئی پاؤں میں

ٹھہری نہ اک جگہ اِدھر آئی اُدھر گئی وقتِ خرامِ ناز عجب گُل کتر گئی
چہرے پہ بن کے زلفِ معنبر بکھر گئی چڑھتے ہی دن کے صاف گھٹا سی اُتر گئی

سورج بڑھا فلک پہ ادھر اور صبا نہ تھی
جھونکے وہ سرد سرد وہ ٹھنڈی ہَوا نہ تھی

سرورؔ کی اس نظم میں مناظرِ فطرت کی رنگینی، کیف ومستی اور دل آویزی اپنے شباب پر ہے۔ انہوں نے یہاں فطرت کے اُن پہلوؤں کو بڑی چابک دستی سے اُجاگر کرنے کی کوشش کی ہے جن سے ذوقِ جمال اور احساسِ حُسن کی تسکین بھی ہو سکتی ہے۔

پیش ہیں اُن کی نظم ''ماریاسمیں'' کے چند اشعار:

آہ کس کافر ادا کی تو ہے زلفِ عنبریں   یہ قیامت کی شکن، یہ حلقہ ہائے خم بہ خم
بال کھولے گھر سے نکلے جیسے کوئی مہ جبیں   شب کو بانبی سے دُلہن بن کر نکلتا یوں ہے تو
پھن اُٹھا کر آہ وہ مستی میں لہرانا ترا
حُسن کی ماتی ہوئی ہو جیسے کوئی نازنیں

شبِ ماہ ہو یا تاروں بھری رات، شگوفوں کا چٹکنا ہو یا گلوں کا تبسّم، نسیمِ سحر کے جھونکے ہوں یا پھولوں کی بھینی بھینی خوشبو، برسات کی پھوہاریں ہوں یا قوسِ قزح کی رنگینی، کوئل کی کوک ہو یا پپیہے کی پیہو، گُلگونہٴ شفق ہو یا سرمئی شام غرض کل مناظرِ فطرت اور کل مظاہرِ قدرت نے سرورؔ کے شعری وجدان کو جلا بخشی۔ اُنہوں نے اپنی نظموں میں دل فریب اور دل نواز نظاروں کی تصاویر ایسی فن کارانہ چابک دستی سے کھینچی ہیں کہ عروسِ فطرت سولہ سنگار کیے ہوئے جلوہ گر ہو جاتی ہے۔ اُن کی نظموں کا ہندوستانی پس منظر اور ماحول ان تصاویر میں اس قدر جمالیاتی کیف ورنگ بھر دیتا ہے کہ قاری اور سامع پر محویت سی طاری ہو جاتی ہے۔ وہ اپنی ایک نظم ''فضائے برشگال'' میں موسمِ باراں میں فطرت کے خدوخال کو کس طرح اُبھار کر اپنے فن کا مظاہرہ کرتے ہیں، ملاحظہ فرمایئے:

چٹک رہے ہیں شگوفے برس رہی ہے پھوار   اُٹھا وہ جھوم کے ساقی چمن میں ابرِ بہار
کہ برج میں لبِ جمنا ہے گوپیوں کی قطار   سہی قدوں کا ہے جمگھٹ کنارِ آبِ رواں
کہ جیسے گاتی ہو مدھ بن میں کوئی سُندر نار   ترانہ ریز ہے یوں شاخِ سرو پر قمری
نئی دُلہن کی ہوں جیسے ہتھیلیاں گُل نار   حنائی پنجہ ہے یوں شاخ شاخ لالہ و گُل
ہَوا میں اُڑتے ہیں کہ چھوٹتے ہیں انار   ہے موتیوں کی لڑی یا قطار بگلوں کی

بیر بہوٹی سُرخ رنگ کا ایک چھوٹا سا کیڑا ہے جس کی جلد مخمل کے مشابہ ہوتی ہے۔ یہ کھیتوں میں کثرت سے نظر آتا ہے۔ گاؤں کا ہر شخص اس سے بخوبی واقف ہوتا ہے۔ بچّے اس کو اپنی ہتھیلی پر رکھ کر خوش ہوتے ہیں۔ عام شخص کے علاوہ اس کیڑے کو ادیبوں، شاعروں اور دانش وَروں نے بھی یقیناً اُسے دیکھا ہوگا مگر اُس کے حُسنِ نظارہ سوز کا ایسا بھرپور احساس اس سے پہلے صرف نظیرؔ اکبرآبادی ایک اکلوتے شاعر ہیں جنہیں ہوا اور انہوں نے اس کیڑے پر ایک نظم لکھی۔ سرورؔ نے صناعانہ فن کاری، تشبیہوں، ترکیبوں، زورِ بیان اور قوتِ اختراع سے ایک معمولی کیڑے کو غیر معمولی اور سحر آفریں بنا دیا ہے۔ پیش ہیں اس نظم کے چند بند:

سُرخ ڈورا ہے کسی چشمِ فسوں پرداز کا   کچھ عجب عالم ہے تیرے حُسن کے انداز کا
قلبِ خوں گشتہ ہے مژگاں پر کسی جاں باز کا   قطرۂ مضطر ہے خونِ کشتگانِ ناز کا
یا شفق کا کوئی ٹکڑا ہے زمیں پر جلوہ گر
جامِ زرّیں میں ہے یا صہبائے احمر جلوہ گر

گُل بداماں ہے شفق میں شعلۂ تنویرِ حُسن خونِ عاشق یا زمیں پر ہے گریباں گیرِ حُسن
یا عقیقِ سُرخ کی چھوٹی سی ہے تعمیرِ حُسن نقشِ نیرنگِ فسوں ہے یا کوئی تصویرِ حُسن
جلوۂ گُل ہے فضائے وادیِ کہسار میں
سُرخ تکمہ ہے قبائے سبزۂ کہسار میں

سرورؔ کی شاعری کا ایک موضوع عشق اور شباب بھی ہے۔ اُن کی متعدد نظمیں وارداتِ قلب، جذبات واحساسات، ہجر ووصال، حُسن وعشق کے راز ونیاز اور دل ودلبر کے ناز وانداز کی متنوع کیفیات کی ترجمان ہیں۔ سرورؔ ماورائی عشق کے قائل نہیں۔ اُن کا عشق خیالی اور عارفانہ نہیں بلکہ وہ پوری طرح جسمانی یا زمینی ہے یا جس کا تعلّق جسم وجمال سے ہے۔ اُن کے یہاں سوقیت، ابتذال، لذّت پرستی اور سستی جذباتیت ڈھونڈے سے بھی نہیں ملے گی۔ وہ عشق کے روایتی اور فرسودہ تصوّرات کو مستحسن نہیں سمجھتے۔ اسی لئے ان کے یہاں روایتی علائم بھی نظر نہیں آتے۔ اُن کے یہاں عشق کے پاکیزہ جذبات واحساسات کے ساتھ جسمانیت کی جلوہ گری ہے۔ اُن کی محبوب کوئی آسمانی شے یا تخیّلی پیکر نہیں بلکہ اسی دنیا کی پروردہ گوشت پوست کی عام عورت ہے۔ وہ عورت کو حُسن وخوبی کا مجسمہ اور قدرت کا بہترین مظہر تصوّر کرتے ہیں:

ننھی ننھی انگلیاں ، پتلی کمر ، بوٹا سا قد اُس پہ سونے پر سہاگا جامہ زیبی کی پھبن
بھینی بھینی بس کے آتی تھی تنِ نازک سے بو صانعِ قدرت نے صندل کا بنایا تھا بدن

سرورؔ کا کلام مادی حُسن کی بہترین اور مکمّل تصاویر کے لئے اپنی مثال آپ ہے۔ وہ جسمانی سکون کو سب سے بڑی نعمت سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک روحانی کیفیات کی بہرہ مندی تصوّف، ماورائی اشیا یا روایتی نظام سے نہیں بلکہ عشقِ مجازی ہی سے حاصل ہوتی ہیں وہ کہتے ہیں:

وہ روشناسِ سوزِ محبت ہوں مَیں سرورؔ پہلو میں داغِ عشق ہوں ، دل میں گدازِ عشق

سرورؔ شاعروں، ادیبوں، قومی رہنماؤں اور مُلک وقوم کے جاں نثاروں کی بہت قدر کرتے تھے۔ انہوں نے ایسی ہی چند ہستیوں کی وفات پر نہایت پُر درد مرثیے بھی کہے ہیں۔ سرورؔ کے یہ مراثی محض آنسوؤں کے سیلاب، نالہ وشیون اور سینہ کوبی تک ہی محدود نہیں بلکہ مرحومین کی شخصیت، سیرت اور صفات واخلاق کے بہترین ترجمان ہیں۔ سوامی رام تیرتھ کی وفات ایک قومی سانحہ تھی۔ اُن کا شمار کاروانِ آزادی کے رہنماؤں میں کیا جاتا تھا۔ اُن کی وفات پر کہے ہوئے مرثیے کا ایک بند پیش کیا جارہا ہے:

جاں نثارِ قوم ایسا غرقِ طوفاں آہ ہو ایسا جاں بازِ وطن آنکھوں سے پنہاں آہ ہو
ایسا مجموعہ تصوّف کا پریشاں آہ ہو بے چراغ اے قوم! یوں تیرا شبستاں آہ ہو
داغ ہو تیرے جگر کا تیری منزل کا چراغ
بجھ کے ہو پانی میں ٹھنڈا تیری محفل کا چراغ

داغؔ دہلوی کو فصیح الملک، فصیح البیاں، بُلبُلِ ہندوستاں اور جگت اُستاد کہا جاتا تھا۔ سرورؔ نے نہ کبھی داغؔ کو دیکھا تھا اور نہ اُن سے تعلّقات تھے لیکن وہ اُن کی نہایت قدر کرتے تھے اور اُن کے کلام کو پسند بھی کرتے تھے۔ داغؔ کی وفات پر کہے گئے مرثیے میں انہوں نے داغؔ کی جملہ خصوصیات یعنی رنگینی، بیان کی صفائی، محاورہ بندی، روزمرّہ اور تراکیب کی نشست وغیرہ کا ذکر نہایت پُر اثر انداز میں کیا ہے۔

بطورِ نمونہ پیش ہے اس مرثیے کا ایک بند:

مضمونِ حُسن و عشق کے او ترجماں چہک بزمِ سخن میں داغِ فصیح البیاں چہک
اے ہم صفیر طوطیِ خلد آشیاں چہک مطلع پہ اپنے بُلبُلِ ہندوستاں چہک
کس نے کہا کہ داغِ وفا دار مر گیا
وہ ہاتھ مل کے کہتے ہیں کیا یار مر گیا

سرورؔ ایک زندہ دل انسان تھے۔ انہوں نے کائنات اور زندگی کے حقائق کو نہ صرف بہت قریب سے محسوس کیا بلکہ اُس کی گوناگوں حقیقتوں اور مسائل پر سنجیدگی سے غور بھی کیا۔ وہ انسان کو صرف عاشق، صوفی، رشی، مُنی یا تارک الدّنیا ہی کے روپ میں نہیں دیکھتے بلکہ دنیا میں رہنے بسنے اور دنیا والوں میں دل چسپی لینے والے انسان کی حیثیت سے بھی دیکھتے ہیں۔ اسی لئے ان کے یہاں زندگی صرف غمِ عشق تک محدود نہیں۔ اُن کی بیش تر نظمیں طفلی کی معصومیت، جوانی اور شباب کی اُمنگوں کی آئینہ دار ہیں۔ عہدِ طفلی میں نہ تو تہذیب وتمدّن کی ملمع کاری ہوتی ہے اور نہ کسی قسم کا تصنّع۔ دیکھیے سرورؔ نے اپنی ایک نظم ''بچپن کی یاد'' میں عہدِ طفلی کی تمنّا کس خوب صورت انداز میں کی ہے:

پھر خاک کا گھروندا آنگن میں مَیں بنالوں چھوٹی سی اپنی کشتی پانی میں پھر بہالوں
طفلی کے پیارے پیارے معصوم گیت گالوں پھر بانسری بجالوں ، پھر جھُن جھُنا بجالوں
دو دن کو اے جوانی دے دے اُدھار بچپن

سرورؔ نے چند رباعیات بھی کہی ہیں۔ انہوں نے اگر چہ نئے موضوعات پر بھی طبع آزمائی کی ہے لیکن اُن کی بیش تر رباعیوں کے موضوعات روایتی ہیں۔ بطورِ نمونہ یہاں پیش ہے ''نَو روز'' کے عنوان سے کہی ہوئی ایک رباعی:

تصویرِ جمالِ عالم آرا بن کر زیبا صنم و نگارِ یکتا بن کر
نو روز آیا ہے لے کے پیغامِ نشاط چوتھی کی دلہن عروسِ رعنا بن کر

سرورؔ کی متعدّد نظمیں تمثیل نگاری کا بہترین نمونہ ہیں۔ انہوں نے کئی غیر مادی تصوّرات کو مادی اشیا بنا کر پیش کیا ہے۔ اُن کی تمثیلی نظموں کے مطالعے سے اُن کے خیالات، رجحانات اور دل چسپیوں کا بھی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اُن کی بیش تر تمثیلیں با مقصد ہیں۔ ''جلوۂ اُمّید، نیچرل شاعری، اُمّید اور طفلی، اُجڑی ہوئی دلہن اور دنیا کی اُجڑی ہوئی محفل'' کا شمار سرورؔ کی بہترین تمثیلوں میں کیا جاتا ہے۔ اُن کی ایک تمثیلی نظم بہ عنوان ''سالِ گزشتہ'' انگریزی سے ترجمہ شدہ ہے۔

سرورؔ نے ''شیونِ عروس'' میں اُردو شاعری کو ایک حسینہ کا پیکر عطا کیا ہے جو اپنی حالتِ زار کی کہانی خود اپنی زبانی نہایت درد انگیز لہجے میں بیان کرتی ہے۔ یہ تمثیل ستّر اشعار پر مشتمل ہے جس میں سرورؔ نے شاعری کی اصلاح کی طرف شعرا کو متوجّہ کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ بطورِ نمونہ اس نظم کے چند اشعار پیش ہیں:

سو گیا بالش پہ سر رکھ کر دمِ فکرِ سخن ناگہاں آئی نظر اک لُعبتِ سیمیں بدن
اُلجھے سلجھے بال، مستانہ ادا، متوالی چال تیکھی چتون، گورے گورے گال، چھوٹا سا دہن
ننھی ننھی انگلیاں ، پتلی کمر ، بوٹا سا قد اُس پہ سونے پر سہاگا جامہ زیبی کی پھبن

سرورؔ نے انگریزی اور سنسکرت زبانوں کی کئی مشہور نظموں کے ترجمے بھی کیے ہیں۔ ''اکسیرِ سخن، وقتِ اَجل، سالِ گزشتہ، مرغابی، ترانۂ خوب، خاتمۂ ہستی، وصفِ زبانی، رویاے اکبر اور آنے والی گھڑی'' اُن کے بہترین منظوم تراجم ہیں۔ مختصر طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ سرورؔ کا کلام سوز و گداز اور کیف و سرور سے عبارت ہے۔ اُن کے کلام میں اُن کی روح اپنی تمام تر رعنائیوں اور خلوصِ بے کراں کے ساتھ متکلّم ہے۔

05.06 نظم ''مادرِ ہند'' متن (اقتباس)

آہ ! یہ جاں بخش پانی ، یہ ہواے خوش گوار
ٹھنڈی ٹھنڈی عطر میں مہکی ہوئی بادِ جنوب
ظلِّ شفقت ہو ترا اے مادرِ مشفق ! دراز
اُف! یہ تیری چاندنی راتوں کا منظر خوش نما
سَو تبسّم تیرے اندازِ تکلّم پر نثار
سر زمینِ عیش ہے اے مادرِ دل سوز ! تو
لاکھوں آوازیں ہے تیرے گھر میں سرگرمِ خروش
تو جوانوں کی ہے ہمّت ، تو دلیروں کی سپر
نورِ دانش تو ، فروغِ جلوۂ ایماں ہے تو
قوّتِ بازو ہے، میری مادرِ غم خوار ! تو
تیرا دیواستھان دیوی ! دل کے کاشانے میں ہے
لکشمی تو ہے ، زمانے میں اُجالا ہے ترا
سُرستی کا روپ ہے ، دُرگا کا ہے اَوتار تو
اُف ! یہ سُندر چھب تری ، یہ سانولی صورت تِری
یہ تبسّم ہاے شیریں ، یہ اداے جاں نواز
سبزۂ خود رو کا گہوارہ ہے تیری سر زمیں
پاک گنگا جل سے بڑھ کر ہے ترا آبِ طہور
آسماں کے نور کی ہے جلوہ گاہِ ناز تو

یہ تر و شاداب و شیریں میوہ ہاے خوش گوار
سبز کھیتوں کی فضائیں اور یہ میدانوں کی دُوب
خاک پر کیا کیا تری ،تیرے مکینوں کو ہے ناز
آہ ! یہ اشجار ، یہ پھولوں کا زیور خوش نما
دل کو کرتی ہیں تری دل کش صدائیں بے قرار
آرزوؤں کی ہے بزمِ انبساط افروز ! تو
جاں نثاروں میں ہیں تیرے لاکھوں دستِ سرفروش
کانپتے ہیں دشمنوں کے، تیری ہیبت سے جگر
دل ہے تو ، سرمایۂ صبر و شکیبِ جاں ہے تو
سینۂ پُر غم میں ہے میرے نفس کا تار تو
تیری تصویرِ مقدّس ہر صنم خانے میں ہے
ہر کنول کا پھول پانی میں شوالہ ہے ترا
نطق و دانش کی ہے دیوی ، مادرِ غم خوار تو
دل کے مندر کی ہے زینت موہنی مورت تری
آہ ! یہ شفقت بھری تیری صداے جاں نواز
تختۂ خلدِ بریں ہے تیری خوش منظر زمیں
تیرے پاکیزہ ثمر ہیں میوۂ شاخِ سرور
خلد کی ہے پاک دیوی ، مادرِ دَم ساز تو

05.07 نظم ''مادرِ ہند'' تجزیہ (اقتباس)

جدید اُردو شاعری کی تحریک کے آغاز ہی سے اُردو کے بیش تر شعرا حُبِّ وطن کے موضوع پر نظمیں کہنے کی طرف متوجّہ ہوئے۔ اُردو ہی نہیں بلکہ ہندوستان کی دیگر بعض زبانوں کے شعرا بھی قوم و وطن کے موضوعات پر طبع آزمائی کرنے لگے۔ سرورؔ جہان آبادی نے بھی مختلف عنوانات کے تحت حُبِّ وطن کے جذبات سے معمور کئی بہترین نظمیں کہی ہیں جن میں ''سرزمینِ وطن، عروسِ حُبِّ وطن، پھولوں کا کُنج، چشمۂ وطن، یادِ وطن، خاکِ وطن اور مادرِ ہند'' خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

سرورؔ کا سب سے اہم کارنامہ یہ ہے کہ اُنہوں نے اُردو شاعری کے حوالے سے سب سے پہلے وطن کا تصوّر مقدّس ''ماں'' اور ''دیوی'' کی حیثیت سے کیا۔ برائے معلومات یہاں یہ ذکر بھی ضروری ہے کہ آریائی تہذیب ومعاشرت میں زمین یعنی دھرتی کو ماتا یعنی ماں کی حیثیت حاصل تھی۔ آریائی تہذیب سے قبل شمالی ہند میں دراوڑی تہذیب کا دَور دَورہ تھا۔ اس تہذیب میں عظیم ترین قوّت کی حیثیت سے شکتی یعنی دیوی کی پوجا کی جاتی تھی۔ آریائی تہذیب کا خاص ذریعۂ معاش زراعت تھا۔ اس تہذیب کے افراد کھیتی باڑی سے اپنی زندگی کی ضروریات کو پورا کرتے تھے۔ اشیائے خوردونوش بغیر کسی محنت کے زمین سے حاصل ہو جاتی تھیں اور کچھ اشیا یعنی زندگی کی ضروریات کی چیزیں تھوڑی بہت محنت ومشقت کرنے کے بعد میسّر ہوتی تھیں۔ اسی لئے آریائی تہذیب کے افراد زمین یعنی پرتھوی کو مادرِ مہربان، شفیق ماں یا ماتا تصور کرتے تھے۔ ہندوستان کے بیش تر باشندے شروع ہی سے تسخیرِ فطرت کے بجائے فطرت سے ہم آہنگ ہونے کو ترجیح دیتے رہے ہیں۔ اس کی وجہ بھی زمین یا دھرتی کا یہی تصوّر ہے یعنی دھرتی یا زمین ہی تمام افراد کو ضروریاتِ زندگی فراہم کر کے اُن کی پرورش اپنی اولادوں کی طرح کرتی ہے۔ سرورؔ اُردو کے پہلے ایسے اہم شاعر ہیں جن کا عقیدہ صدیوں پرانی اس ہندوستانی مزاج سے مناسبت رکھتا ہے جو وطن کو ماتر بھومی یعنی مادرِ وطن تسلیم کرتا ہے۔

سرورؔ اُس عہد کے شاعر ہیں جب ہندوستان میں سیاسی جدّ وجہد کی تحریکیں سرگرمِ عمل ہونے لگی تھیں۔ ہر طرف انقلاب وآزادی کے نعرے بلند ہو رہے تھے۔ انہوں نے اپنی شعری زندگی کا آغاز مُلکِ ہند کی آزادی اور خوش حالی کے ارمانوں سے کیا۔ اُنہی ارمانوں اور رجحانات نے اُن کے جذبات واحساسات اور فکر ونظر کو جلا بخشی۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کی شاعری کا ایک بڑا حصّہ مادرِ وطن کی عظمت کے نغمات پر مشتمل ہے۔ اُن کی نظم ''مادرِ ہند'' بھی حُبّ الوطنی یعنی دیش بھکتی کے جذبے سے پوری طرح معمور ہے۔ سرورؔ نے اپنی اس نظم میں وطن ہند کو مادرِ مشفق، مادرِ دَم ساز، مادرِ غم خوار اور پاک دیوی جیسے مقدّس القابات سے یاد کیا ہے۔ سرورؔ کا مقامِ ولادت جہان آباد ضلع پیلی بھیت کوہِ ہمالیہ کے دامن میں آباد ہے جو نہایت سرسبز وشاداب علاقہ ہے۔ درختوں کے جھُنڈ دور دور تک پھیلے ہوئے ہیں۔ بہتے ہوئے دریا، پہاڑوں سے گرتے ہوئے جھرنے خودرَو سبزے، انواع واقسام کے گل وغنچے اور چہچہاتے ہوئے پرندے دل ونظر کو سامانِ فرحت مہیا کرتے ہیں۔

سرورؔ نے اِنہی مناظر میں آنکھیں کھولیں، پرورش پائی اور یہیں جوان ہوئے۔ اسی لئے انہوں نے اپنی اس نظم میں بھی اِنہی مناظر کی عکّاسی کی ہے۔ اُنہیں اس مُلک کی آب وہَوا، تروتازہ پھل پھول، خوش گوار اور شیریں میوے، ہرے بھرے کھیت اور میدانوں میں اُگی ہوئی دوب کسی نعمتِ عظمیٰ سے کم نہیں۔ وہ ان تمام اشیا کو مادرِ مشفق یعنی مادرِ وطن کا بیش بہا عطیہ تصور کرتے ہیں۔ سرورؔ اپنے سینے میں ایک حسّاس اور دھڑکتا ہوا دل رکھتے ہیں۔ اُن کی نگاہ بہت وسیع ہے۔ اُنہیں خاکِ وطن کی ہر چیز میں حُسن ودل کشی نظر آتی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہاں کا پانی جاں بخش، ہَوائیں اور میوے خوش گوار، چاندنی راتوں کے مناظر اور درختوں پر زیوروں کی طرح سجے ہوئے گُل وغنچے اس قدر حسین وخوش نما ہیں کہ ان کے لئے یہ آرزوئیں کی کسی بزمِ انبساط افروز سے کم نہیں۔ سرورؔ اِسی پر اکتفا نہیں کرتے۔ وہ اس نظم کے ایک بند میں مادرِ وطن کو نوجوانوں کی ہمّت، دلیروں اور جاں بازوں کی سپر، نورِ دانش، جلوۂ فروغِ ایماں، سرمایۂ صبر وشکیبِ جاں، قوّتِ بازو اور نفس کا تار کہہ کر مخاطب کرتے ہیں۔ سرورؔ نے اس نظم میں مادرِ وطن کو دیوی شکتی کے پیکر میں ڈھال کر لکشمی، سرسوتی اور دُرگا کا روپ اور اوتار کہا ہے۔

وہ لکشمی کو زمانے کا اُجالا یعنی نطق و دانش یا علم و موسیقی کی دیوی تصوّر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ پانی میں کھلا ہوا ہر گُلِ نیلوفر یعنی کنول کا ہر پھول شوالہ کی طرح تیرا مقامِ مقدّس ہے۔ سرورؔ نے اس نظم کے آخر میں اس مُلک کی سرزمین کو سبزۂ خودرَو کا گہوارہ اور خلد بریں کا ایک خوش نما منظر تصوّر کیا ہے۔ وہ اس سرزمین کے آبِ طہور کو گنگا جل سے بھی بڑھ کر مقدّس خیال کرتے ہیں۔ دراصل سرورؔ کے دل میں اس مادرِ وطن کے لئے جو عزّت و احترام ہے وہ اس نظم کے ہر مصرعے سے پوری طرح عیاں ہو رہا ہے۔ اُنہوں نے ماں اور دیوی کے تصور کی توسیع کرتے ہوئے اس مقدّس تصور میں محبوبیت کی شان بھی پیدا کر دی ہے۔ وہ اس کی اداؤں کو ادائے جاں نواز، اُس کی صدا کو صدائے جاں نواز اور آسماں کے نور کی جلوہ گاہِ ناز کہہ کر اپنی شیفتگی اور فریفتگی کا ثبوت دیتے ہیں۔ دراصل سرورؔ کی یہ نظم عقیدے کی طہارت، بے پناہ خلوص، عبودیت اور محبوبیت کی شان کی وجہ سے اپنی مثال آپ ہے۔

05.08 خلاصہ

جدید نظم گو کی حیثیت سے سرورؔ کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ اُنہوں نے قدیم و جدید دَور کے شعری نظریات کے اختلافات کو کم کرنے اور اُن میں مفاہمت کرانے کا قابلِ قدر کارنامہ انجام دیا۔ کلامِ سرورؔ کی ایک اہم خصوصیت عنوانات کا انتخاب اور تنوّع بھی ہے۔ اُن کی بیش تر نظموں کے موضوعات معاصرین اور قدما کی نظموں کے موضوعات سے مختلف ہیں۔ سرورؔ کے رگ و پے میں حُبّ الوطنی اور قوم پرستی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ وہ آریہ قوم کے چشم و چراغ تھے اور وطن عزیز کو مادرِ مہربان، مادرِ مشفق، مادرِ دَم ساز اور دیوی جیسے القابات سے مخاطب کرتے تھے۔ وہ اُردو کے پہلے ایسے شاعر ہیں جنہوں نے وطن کے لئے ماں اور دیوی کا تصور پیش کیا۔

عہدِ سرورؔ میں ایک طرف باہمی خلفشار، طبقاتی کشمکش اور سماجی اضطراب کو ہَوا دی جا رہی تھی تو دوسری طرف ہندوستان سیاسی جدّ و جہد، انقلاب اور آزادی کے دَور میں داخل ہو رہا تھا۔ سرورؔ ایک نہایت حسّاس اور دردمند شاعر تھے۔ اُن کے دل و ذہن پر ایسے پُر آشوب حالات و ماحول کا اثر ہونا لازمی تھا۔ اسی لئے انہوں نے اپنی شاعری کا آغاز وطنِ ہند کی آزادی اور خوش حالی کے ارمانوں سے کیا۔ انہوں نے قوم و وطن کی محبت سے سرشار ہو کر وطن کی عظمت کے گیت گائے۔ اُن کے کلام میں یہی جذبات و احساسات اور یہی ارمان مختلف شکلوں میں نمودار ہوئے ہیں۔ کبھی وہ اپنے کلام کے ذریعے امن، انصاف اور مساوات کا مطالبہ کرتے ہیں تو کبھی سامراجی نظام کے خلاف آواز بلند کرتے ہیں، کبھی اہلِ ہند کو ماضی کی عظمت و رفعت کی یاد دلاتے ہیں تو کبھی اعلیٰ اقدار اور قومی روایات کے منتشر ہونے کی طرف واضح اشارے بھی کرتے ہیں۔ وہ مُلک کی آزادی اور خوش حالی کے لئے مذہب و ملّت کی تفریق سے بالاتر ہو کر اتّحاد، ہم آہنگی اور اجتماعیت پر زور دیتے ہیں وہ ہندوستان کی تشکیلِ نَو کے لئے ماضی اور حال کی صالح بنیادوں کو استوار کرنے کے خواہاں تھے۔

سرورؔ کا کلام حُسنِ فطرت اور مظاہرِ قدرت کی حسین تصاویر کا مرقّع ہے۔ انہوں نے کائنات کی خارجی تصویر کشی کے ساتھ داخلی کیفیات کی بھی جان دار عکّاسی کی ہے۔ سرورؔ کے یہاں روایتی عشق اور عشق سے متعلّق روایتی رموز و علائم نظر نہیں آتے۔ اُن کے یہاں عشق والہانہ لگاؤ، خستگی، ربودگی، شدید چاہت، ایثار اور روحانی ہم آہنگی سے عبارت ہے۔ اُن کے کلام میں محبت کی جسمانیت اور ارضیت کا واضح تصوّر پایا جاتا ہے۔ سرورؔ نے اپنے کلام میں صنفِ نازک کے جذبات و احساسات کی دل آویز تصویریں اور گوناگوں تفسیریں بھی پیش کی ہیں۔ اُنہیں زندگی اور کائنات کے مختلف حقائق و مسائل سے گہری واقفیت تھی۔

انہوں نے انسانی زندگی کے مختلف مدارج بالخصوص عہدِ طفلی کی بھرپور عکّاسی کی ہے۔ سرورؔ قنوطی نہیں بلکہ ایک رجائی شاعر تھے۔ وہ اگرچہ تمام عمر محرومیوں اور ناکامیوں کا شکار رہے مگر وہ اس کائنات کی رنگینی اور دل کشی کو سمیٹ کر ایک زندہ دل انسان کی طرح راحتوں اور مسرّتوں سے ہم کنار اور لطف اندوز ہونا چاہتے تھے۔ اُن کی بیش تر نظمیں اُن کے اسی نظریے کی ترجمان ہیں۔

سرورؔ کی زندگی اور کلام میں بڑی حد تک مطابقت پائی جاتی ہے۔ اُن کے شعروں میں اُن کا دل دھڑکتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ اُن کی شخصیت اُن کے کلام میں پوری طرح جلوہ گر ہے تو بے جا نہ ہوگا۔ مختصر طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ سرورؔ کا کلام اُن کی شخصیت، مزاج اور نظریے کے ساتھ اُن کے عہد کا بھی آئینہ دار ہے۔

05.09 فرہنگ

آبِ طہور : پاک پانی، آبِ شفّاف

اندازِ تکلّم : بات کرنے کا ڈھنگ، گفتگو کا طریقہ

اوتار : کسی دیوی یا دیوتا کا کسی کے جسم میں داخل ہو کر پیدا ہونا

بادِ جنوب : جنوبی ہَوا، دکن کی طرف سے چلنے والی ہَوا

بزمِ انبساط افروز : خوشیوں کو بڑھانے والی محفل، محفلِ عیش و نشاط

تختۂ خلدِ بریں : جنّت الفردوس کا ایک حصّہ، خلدِ بریں کا ایک ٹکڑا

جاں بخش : جان عطا کرنے والا، تازگی دینے والا، فرحت بخشنے والا

جگر کا نپنا : خوف سے جگر کا لرزنا، خوف زدہ ہونا

جلوہ گاہِ ناز : وہ جگہ جہاں ناز و انداز کے ساتھ جلوہ دکھایا جائے

چاندنی رات : شبِ ماہ، شبِ ماہ تاب، قمری مہینے کی چودھویں، پندرہویں اور سولہویں رات

چھَب : آرائش، زینت

خلدِ بریں : فردوسِ اعلیٰ، فردوسِ بریں، جنّت کا سب سے بلند اور بہترین حصّہ

خودرَو : اپنے آپ اُگا ہوا، خود بخود نمود پایا ہوا

سبزۂ خودرَو : اپنے آپ اُگا ہوا سبزہ، خود بخود نمود پائی ہوئی نبات

سپر : ڈھال، محافظ، مددگار

سرسوَتی : علم اور موسیقی کی دیوی

سرمایہ : دولت، اثاثہ، ملکیت

سرمایۂ صبر و شکیب : تحمل و بُردباری کا اثاثہ، دولتِ تحمل و بُردباری

سینۂ پُرغم : غم سے بھرا ہوا سینہ

شِوالہ : شیو کا مندر، مہادیو کا استھان، وہ مندر جہاں شیو کی مورت یا شیولنگ نصب ہو

صدائے دل نواز : دل کو تسلّی دینے والی آواز، وہ بات جس سے دل کو سکون حاصل ہو

صنم خانہ : بُت خانہ، مندر

ظلِّ شفقت : مہربانی کا سایہ، عنایت کی چھاؤں

غم خوار : غم گسار، ہم درد، دُکھ درد کی شریک، مصیبت میں ساتھ دینے والی

کاشانہ : مکان، چھوٹا گھر، رہنے کی جگہ

کنول کا پھول : گُلِ نیلوفر، ایک قسم کا پھول

گنگا جل : دریائے گنگا کا پانی جسے ہندو متبرک اور مقدّس خیال کرتے ہیں

خوش گوار	:	خوش آئند، خوش ذائقہ، لذیذ، پسندیدہ	گہوارہ	:	ہنڈولا، مہد، پالنا، جھولا
دُرگا	:	بھوانی دیوی، پاروَتی، شیو کی اہلیہ	لکشمی	:	لچھمی، دولت کی دیوی، دھن کی دیوی
دل کش	:	دل پسند، دل کو لُبھانے والا، مرغوب، پسندیدہ	مادرِدم ساز	:	مادرِ مہربان، مادرِ ہم درد، مشفق ماں
			مکین	:	مکان دار، مکان میں رہنے والا، صاحبِ خانہ
دُوب	:	ایک قسم کی نرم گھانس جو باریک اور عمدہ ہوتی ہے	مورت	:	مجسّمہ، پتّھر یا دھات کی بنی ہوئی شبیہ
دیواستھان	:	مقدّس جگہ، دیوی یا دیوتا کے رہنے کی جگہ	موہنی	:	موہ لینے والی، فریفتہ کرنے والی، دل فریب
دیوی	:	دیوتا کی تانیث، پاک باز عورت	نطق	:	گویائی، بولنے کی قوّت
روپ	:	شکل، صورت، اَوتار	نفس کا تار	:	تارِ نفس، سانس کا سلسلہ
سانولی	:	نمکین چہرے والی، نمکین صورت والی عورت یا دیوی	نورِدانش	:	علم کی روشنی
			ہیبت	:	دہشت، رعب

05.10 سوالات

مختصر سوالات

سوال نمبر۱ : نظم ''مادرِ ہند'' کا خلاصہ تحریر کیجیے۔

سوال نمبر۲ : سرورؔ کے قومی تصوّرات کی نشان دہی کیجیے۔

سوال نمبر۳ : سرورؔ کی وفات کے واقعے کو اپنے الفاظ میں بیان کیجیے۔

سوال نمبر۴ : سرورؔ کی نظم گوئی کی کسی ایک اہم خصوصیت کی نشان دہی کیجیے۔

سوال نمبر۵ : طفلی کے موضوع سے متعلّق سرورؔ کی کسی ایک نظم کا خلاصہ تحریر کیجیے۔

تفصیلی سوالات

سوال نمبر۱ : نظم ''مادرِ ہند'' کا تنقیدی تجزیہ پیش کیجیے۔

سوال نمبر۲ : سرورؔ کی نظم نگاری کی بنیادی خصوصیات پر روشنی ڈالیے۔

سوال نمبر۳ : سرورؔ کی وطنی شاعری کے عنوان سے ایک مضمون تحریر کیجیے۔

سوال نمبر۴ : سرورؔ کی نظموں میں حُسنِ فطرت اور مناظرِ قدرت کی نشاندہی کیجیے۔

سوال نمبر۵ : سرورؔ کا شمار جدید اُردو شاعری کے معماروں میں کیا جاتا ہے، اظہارِ خیال کیجیے۔

معروضی سوالات

سوال نمبر۱ : سرورؔ کی پیدائش کہاں ہوئی تھی؟

(الف) کان پور (ب) جہان آباد (ج) میرٹھ (د) رام پور

سوال نمبر۲ : سرورؔ کس صنفِ سخن کے لئے مشہور ہیں؟

(الف) نظم (ب) مرثیہ (ج) غزل (د) رباعی

سوال نمبر۳ : دُرگا سہائے نے شروع میں کیا تخلّص اختیار کیا تھا؟

(الف) جامؔ (ب) سرورؔ (ج) وحشتؔ (د) رندؔ

سوال نمبر۴ : رسالہ زمانہ کہاں سے شائع ہوتا تھا؟

(الف) الٰہ آباد (ب) آگرہ (ج) پیلی بھیت (د) کان پور

سوال نمبر۵ : سرورؔ کی پیدائش کس سنہ عیسوی میں ہوئی تھی؟

(الف) ۱۸۲۹ء (ب) ۱۸۱۰ء (ج) ۱۸۷۳ء (د) ۱۸۵۳ء

سوال نمبر۶ : درج ذیل میں سے کون سا مجموعۂ کلام سرورؔ کا نہیں ہے؟

(الف) جامِ سرور (ب) مے خانۂ سرورؔ (ج) خُم خانۂ سرور (د) خُم کدۂ سرورؔ

سوال نمبر۷ : پنڈت لیکھرام آریہ مسافر کی وفات سے متاثر ہوکر کہے گئے کلام کے مجموعے کا نام ہے۔

(الف) شیون (ب) نشترِ غم (ج) خونِ ناحق (د) نالۂ خوں چکاں

سوال نمبر۸ : ''نوائے سرورؔ'' کے مرتّب کا نام کیا ہے؟

(الف) حُکم چندنیّر (ب) گیان چند جین (ج) منشی دیا نرائن نگم (د) نذیر احمد

سوال نمبر۹ : دُرگا سہائے سرورؔ کی بیوی کا نام کیا تھا؟

(الف) مہادیوی (ب) لکشمی دیوی (ج) شنکر دیوی (د) دُرگا دیوی

سوال نمبر۱۰ : سرورؔ کی وفات کب ہوئی تھی؟

(الف) ۳؍دسمبر ۱۹۱۰ء (ب) ۳؍دسمبر ۱۹۱۲ء (ج) ۲۹؍نومبر ۱۹۱۰ء (د) ۲۹؍نومبر ۱۹۱۲ء

معروضی سوالات کے جوابات

جواب نمبر۱ : (ب) جہان آباد

جواب نمبر۲ : (الف) نظم

جواب نمبر۳ : (ج) وحشت

جواب نمبر۴ : (د) کان پور

جواب نمبر۵ : (الف) ۱۸۲۹ء

جواب نمبر۶ : (ب) مے خانۂ سرور

جواب نمبر۷ : (ج) خونِ ناحق

جواب نمبر۸ : (الف) حُکم چندنیّر

جواب نمبر۹ : (ج) شنکر دیوی

جواب نمبر۱۰ : (الف) ۳؍دسمبر ۱۹۱۰ء

05.11 حوالہ جاتی کتب

۱۔ سرورؔ جہان آبادی: حیات اور شاعری از ڈاکٹر حکم چندنیّر

۲۔ جامِ سرورؔ از سرورؔ جہان آبادی

۳۔ نوائے سرورؔ از ڈاکٹر حکم چندنیّر

۴۔ یادگارِ رفتگاں از جگرؔ بریلوی

بلاک نمبر 02

اکائی 06 پنڈت برج نرائن چکبست ......’آوازۂ قوم‘ ڈاکٹر شریف احمد قریشی

اکائی 07 شیخ محمد اقبالؔ......’ساقی نامہ، جبریل وابلیس‘ محمد افضل حسین

اکائی 08 جوشؔ ملیح آبادی......’بدلی کا چاند، شکستِ زنداں کا خواب‘ محمد افضل حسین

اکائی 06 : پنڈت برج نرائن چکبستؔ ''آوازۂ قوم''

ساخت :

06.01 : اغراض ومقاصد

06.02 : تمہید

06.03 : پنڈت برج نرائن چکبستؔ کے حالاتِ زندگی

06.04 : پنڈت برج نرائن چکبستؔ کی ادبی خدمات ومقام

06.05 : پنڈت برج نرائن چکبستؔ کی نظم نگاری

06.06 : نظم ''آوازۂ قوم'' متن (اقتباس)

06.07 : نظم ''آوازۂ قوم'' تجزیہ (اقتباس)

06.08 : خلاصہ

06.09 : فرہنگ

06.10 : سوالات

06.11 : حوالہ جاتی کتب

06.01 اغراض ومقاصد

انسان کو ماضی کے حالات وواقعات سے بہت کچھ سیکھنے اور انہیں اپنی زندگی میں داخل کرنے کے مواقع فراہم ہوتے رہتے ہیں۔ اُردو کی بیش تر نظمیں ایسے حالات وواقعات سے بھری ہوئی ہیں جن سے انسان نہ صرف بہت کچھ سیکھ سکتا ہے بلکہ ماضی کی تاریک اور روشن روایات سے بھی واقفیت حاصل کرسکتا ہے۔ اِنہی اغراض ومقاصد کے تحت مختلف ادبا وشعرا کی شخصیات کا جائزہ لینا اور اُن کی خدمات وتخلیقات کا مطالعہ کرنا ناگزیر ہے۔ اُردو زبان کے اہم نظم گو شعرا کی صف میں ایک اہم نام پنڈت برج نرائن چکبست کا بھی ہے۔ آپ کو اس اِکائی کے ذریعے چکبستؔ کی شخصیت کے خاص پہلوؤں، اُن کے فن اور اُن کی نظم گوئی کی اہم خصوصیات سے روشناس کرایا جائے گا۔

اسی اِکائی میں پنڈت برج نرائن چکبستؔ کی شہرۂ آفاق نظم ''آوازۂ قوم'' کے اصل متن کو بھی بطورِ اقتباس شامل کیا گیا ہے۔ نظم کی اہم خصوصیات پر روشنی ڈال کر اُس کا تجزیہ بھی پیش کیا جائے گا۔ تجزیے اور خصوصیات کی روشنی میں اس نظم کے اندازِ بیان سے بھی واقفیت کرائی جائے گی ساتھ ہی یہ بھی کوشش کی جائے گی کہ آپ کو چکبستؔ کی اس نظم کی تفہیم کے علاوہ اُن کی دیگر نظموں کو بھی سمجھنے میں زیادہ دشواریوں کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

06.02 تمہید

آپ دبستانِ دہلی اور دبستانِ لکھنؤ کی شاعری کی امتیازی خصوصیات سے بخوبی واقف ہوں گے اور آپ کے علم میں یہ بھی ہوگا کہ لکھنوی شاعری پر شروع ہی سے اعتراضات کیے جاتے رہے ہیں۔ یہ بات بھی زور و شور سے واضح کی جاتی رہی ہے کہ جب مُلکی سطح پر زندگی ومعاشرت کی بدلتی ہوئی اقدار سے متاثر ہو کر دوسرے مقامات کے شعرا و ادبا اپنی تخلیقات کے ذریعے اس کی عکّاسی کر رہے تھے اُس وقت بھی لکھنؤ اپنی عیش وعشرت کی خواب گاہ میں محوِ خواب تھا لیکن اِس کے برعکس اُس دَور میں بھی لکھنؤ میں شاعری کے ایک ایسے رجحان نے پُرزور دستک دے دی تھی جو محض زبان و بیان کے نقطۂ نظر ہی سے نہیں بلکہ عصری حالات ومسائل کے لحاظ سے بھی اہمیت کا حامل ہے۔ جس کی مثال میں خواجہ حیدر علی آتشؔ، میر انیسؔ اور پنڈت برج نرائن چکبستؔ کے سرمایۂ کلام کو پیش کیا جاسکتا ہے۔

چکبستؔ کے یہاں زبان و بیان کی تمام خوبیوں کے ساتھ قدیم وجدید روایات وخیالات کا حسین امتزاج نظر آتا ہے۔ انہوں نے اپنے دَور کی سیاسی ہلچل، قومی تحریکوں، اصلاحی کوششوں اور سانحوں کو اپنے جذبات و مشاہدات کے ساتھ نہایت فن کارانہ چابک دستی سے اشعار کے قالب میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے۔ اُن کی شاعری اور نثر دونوں عہدِ جدید کے تقاضوں، حالات، واقعات اور مسائل کی ترجمانی کا بہترین نمونہ ہیں۔ کلامِ چکبستؔ کی روشنی میں آپ اس اکائی کے ذریعے چکبستؔ کی حُبُّ الوطنی، اُس دَور کے سیاسی حالات، جدوجہدِ آزادی، ہندو مسلم اتّحاد، فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور اخلاقی اصلاحات کے ساتھ ہوم رول تحریک سے بھی واقفیت حاصل کریں گے۔

06.03 پنڈت برج نرائن چکبستؔ کے حالاتِ زندگی

پنڈت برج نرائن چکبستؔ ایک محبِ وطن اور قوم پرست شاعر تھے۔ اُنہیں اردو کے اُن شعرا کی صف میں نمایاں مقام حاصل ہے۔ جنہوں نے جدوجہدِ آزادی کو اپنے کلام کے ذریعے تقویت عطا کرنے کا ناقابلِ فراموش کارنامہ انجام دیا ہے۔ جب دَورِ غلامی میں ہندوستان کے رہ نما اور عوام و خواص وطن کی آزادی اور اپنے حقوق کی بحالی کے لئے جدوجہد کر رہے تھے اُس وقت چکبستؔ بھی اپنی بیدار کُن اور حوصلہ افزا نظموں کے ذریعے اُن میں جوش وولولہ بھرنے کا بے مثل کارنامہ انجام دے رہے تھے۔ اُن کی اصلاحی و پیامی نظمیں نہ صرف موقّر اخبارات ورسائل میں شائع ہوتی تھیں بلکہ سیاسی جلسوں میں بھی پڑھی جاتی تھیں۔ اُن کی بیش تر نظمیں اور غزلیں قومی ہم آہنگی اور حُبِّ وطن کے جذبے سے معمور نظر آتی ہیں۔ اُنہوں نے قومی یک جہتی اور حبِّ وطن کے علاوہ مختلف موضوعات پر بھی طبع آزمائی کی ہے مگر تقریباً ہر نظم میں ایسے عناصر کی جلوہ آرائیاں بھی ہیں جن سے وطنِ عزیز یعنی ہندوستان کی عظمت نمایاں ہوئے بغیر نہیں رہتی۔

کلامِ چکبستؔ ہندوستانی سماج، معاشرت اور سیاسی حالات کا ایسا آئینہ ہے جس میں مشترک تہذیب و تمدّن، اخلاق و اقدار اور تہذیب وشائستگی کی تصاویر نظر آتی ہیں۔ چکبستؔ ایک مہذّب، شریف اور باوضع انسان تھے۔ اُن کے رگ وپے میں لکھنوی تہذیب وشرافت رچی بسی ہوئی تھی۔ وہ اس قدر روشن خیال تھے کہ ماضی کی تابندہ روایت کے ساتھ اصلاحِ معاشرت کی بھی کُھل کر حمایت کرتے تھے۔ وہ قوم و مُلک کی فلاح و بہبودی کے لئے آخری دم تک کوشاں رہے۔ جدوجہدِ آزادی اور اصلاحِ معاشرہ سے معمور اُن کی نظموں کی وجہ سے اُنہیں دَورِ جدید کا پیغام بَر بھی کہا جاتا ہے۔ اُن کی غزلوں میں بھی پیامی رنگ کو نمایاں طور پر محسوس کیا جا سکتا ہے۔ فن یا فن پارہ عام طور سے فن کار کی شخصیت کا بے لوث اظہار ہوتا ہے۔

کسی فن کار کی تخلیق کی صحیح تفہیم اُس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ فن کار کی شخصیت سے پوری طرح واقفیت نہ ہو۔ پنڈت برج نرائن چکبستؔ کی شاعری اس نظریے کا جیتا جاگتا ثبوت ہے۔ چکبستؔ کی شخصیت کی تشکیل انسان دوستی، شرافت اور حُبّ الوطنی جیسے عناصر سے ہوئی تھی اور یہی خوبیاں یعنی شریفانہ جذبات، قومی یک جہتی اور وطن پرستی اُن کے کلام میں جابجا نظر آتی ہیں۔ اس لئے کلامِ چکبستؔ کی صحیح تفہیم کے لئے اُن کی شخصیت اور اُن کی زندگی کے اہم پہلوؤں سے واقف ہونا بھی ضروری ہے۔

پنڈت برج نرائن چکبستؔ کا تعلّق کشمیری پنڈتوں کے ایک مشہور خاندان سے تھا۔ اُن کے بُزرگ کشمیر سے آکر لکھنؤ میں آباد ہو گئے تھے۔ کشمیری برہمنوں کے ایک طبقے کا لقب چکبست تھا جسے اُنہوں نے بطورِ تخلّص اختیار کیا اور اِسی تخلّص یعنی چکبستؔ کے لقب سے دنیائے ادب میں مشہور ہوئے۔ اُن کی پیدائش ۱۹/جنوری ۱۸۸۲ء کی شب فیض آباد کے محلّہ راٹھ حویلی میں ہوئی تھی مگر اُن کی تعلیم و تربیت اور پرورش لکھنؤ میں ہوئی تھی۔ اُن کے والد پنڈت اُدِت نرائن چکبست پٹنہ میں ڈپٹی کلکٹر کے عہدے پر فائز تھے۔

چکبستؔ کی پیدائش کے پانچ سال کے بعد ۱۸۸۷ء میں اُن کے والد کی وفات ہوگئی۔ مجبوراً اُن کی والدہ کو اپنے بھائی پنڈت لالتا پرساد کے یہاں رہنا پڑا۔ چکبستؔ کی ابتدائی تعلیم گھر سے شروع ہوئی۔ اس کے بعد انہوں نے ۱۸۹۷ء میں کاظمین اسکول سے مڈل، ۱۹۰۰ء میں گورنمنٹ جوبلی کالج سے ہائی اسکول، ۱۹۰۲ء میں کیننگ کالج سے ایف.اے، ۱۹۰۵ء میں بی.اے کے امتحانات پاس کیے اور ۱۹۰۷ء میں ایل.ایل. بی. کی ڈگری حاصل کی۔ بی۔اے کی تعلیم حاصل کرنے کے دوران چکبستؔ کی شادی پنڈت پرتھوی ناتھ ناگو کی بیٹی کے ساتھ ہوگئی مگر دوسرے سال بیٹے کی ولادت کے وقت اُن کا انتقال ہو گیا اور چند روز کے بعد بیٹے کی بھی وفات ہوگئی۔ اُن کی دوسری شادی ۱۹۰۷ء میں ایک سرکاری وکیل پنڈت سورج ناتھ آغا کی دختر کھمبا دیوی سے ہوئی جن کے بطن سے کئی اولادیں پیدا ہوئیں۔

چکبستؔ کے والد پنڈت اُدِت نرائن چکبست بھی اچّھے اشعار کہتے تھے مگر اُن کا تمام کلام گردشِ زمانہ کی نذر ہو گیا۔ اب تک اُن کا ایک شعر ہی دستیاب ہو سکا ہے جو مندرج ہے۔ یہ شعر ہی اُنہیں قادرالکلام شاعر ثابت کرنے کے لئے کافی ہے:

اللہ اللہ اثر نالوں کا تیرے بُلبُل! پردۂ غیب سے گُل چاک گریباں نکلا

چکبستؔ کو بچپن ہی سے شاعری کا شوق تھا۔ ایسے بہت سے واقعات ہیں جو اُن کی شاعرانہ صلاحیت کا پتہ دیتے ہیں۔ ایک واقعہ اس طرح مشہور ہے کہ چکبستؔ اور نواب وزیر حسن کے مکانات بہت قریب تھے۔ ایک روز نواب وزیر حسن اپنے مکان کی چھت سے کبوتر اُڑا رہے تھے کہ اُسی درمیان کسی شخص کا ایک کبوتر اُڑتا ہُوا اُن کی چھت پر آ گیا۔ اُنہوں نے اُس کبوتر کو فوراً پکڑ لیا اور اُس کے پروں میں گرہ لگا کر اُسے اپنی چھت پر چھوڑ دیا۔ کبوتر نے زور سے اپنے پر پھڑ پھڑائے اور تھوڑی ہی دیر میں اُس کے پروں کی گرہ کُھل گئی۔ گرہ کُھلتے ہی وہ فوراً اُڑ گیا۔ نواب صاحب کبوتر کو اُڑتا دیکھ کر ہاتھ مَلتے رہ گئے۔ چکبستؔ اپنی چھت پر کھڑے اِس سارے منظر کو بغور دیکھ رہے تھے۔ اُنہوں نے اِس واقعے سے متاثر ہو کر تھوڑی دیر کے بعد یہ شعر کہا:

تڑپ کر توڑ ڈالے بند بازو کے، کبوتر نے بہت باندھا تھا کس کر ایک پَر کو دوسرے پر سے

بیش تر تاریخ نویسوں اور محقّقین کا خیال ہے کہ چکبستؔ شاعری میں کسی کے شاگرد نہیں تھے اور نہ اُنہوں نے کبھی کسی شاعر سے اصلاح لی مگر چند خطوط کے دستیاب ہو جانے سے پتہ چلتا ہے کہ چکبستؔ مظفر علی خاں اسیرؔ کے چھوٹے بیٹے سیّد فضل علی خاں افضلؔ کے شاگرد

تھے جو لکھنؤ میں چھوٹے بھیّا کے نام سے مشہور تھے۔ایل.ایل. بی کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد چکبستؔ لکھنؤ کے مشہور وکیل شہنشاہ حسین رضوی کے ساتھ وکالت کے پیشے سے وابستہ ہو گئے۔اپنی کارکردگی ،محنت،ذہانت اور کامیابی کے سبب بہت جلد اُن کا شمار لکھنؤ کے ممتاز اور نامور وکلا میں کیا جانے لگا۔چکبستؔ ایک مقدّمے کی پیروی کے لئے ۱۲/فروری ۱۹۲۶ء بروز جمعہ رائے بریلی گئے ہوئے تھے۔وہاں اُنہوں نے عدالت میں تقریباً ایک بجے تک بحث کی۔اِس کے بعد ریلوے اسٹیشن آئے۔اُن کے ساتھ اُن کے مخالف وکیل محمّد ایّوب بھی تھے۔یہ دونوں تقریباً دو بجے ٹرین پر سوار ہوئے۔اِس کے بعد چائے منگائی گئی۔چکبستؔ نے چائے کی پیالی کو جیسے ہی اپنے ہونٹوں کے قریب کیا ویسے ہی اُن کی زبان پلٹ گئی اور حالت دگرگوں ہونے لگی۔اُنہیں ٹرین سے اُتار کر ویٹنگ روم میں لٹا دیا گیا۔ڈاکٹروں نے فالج کا اثر تجویز کیا۔تمام علاج کے باوجود بھی وہ جاں بَر نہ ہو سکے اور تقریباً سات بجے شام کو اُنہوں نے آخری سانس لی۔دوسرے روز لکھنؤ میں دریائے گومتی کے کنارے اُن کی میّت کی آخری رسومات ادا کی گئیں۔

چکبستؔ کے مشہور شعر:

زندگی کیا ہے عناصر میں ظہورِ ترتیب مَوت کیا ہے اِنہی اجزا کا پریشاں ہونا

اِس شعر کے آخری مصرع سے کاظم حسین محشرؔ لکھنوی نے اِس طرح اُن کی تاریخِ وفات نکال کر نہ صرف حیرت زدہ کر دیا بلکہ اِس شعر کو بھی حیاتِ جاوید عطا کر دی:

اُن کے ہی مصرع سے تاریخ ہے ہمراہِ عزا مَوت کیا ہے اِنہی اجزا کا پریشاں ہونا

چکبستؔ پنڈت بشن نرائن درآبرؔ، بابو گنگا پرساد ورما، گوپال کرشن گوکھلے، بال گنگا دھر تلک، مہاتما گاندھی، مسز اینی بیسنٹ اور دادا بھائی نوروجی سے بہت متاثر تھے۔اِنہی بزرگوں کے خیالات کو اپنانے اور اِنہی کے نقشِ قدم پر چلنے کی کوشش بھی کرتے تھے۔وہ پنڈت بشن نرائن درآبرؔ کو اپنا آئیڈیل سمجھتے تھے۔اُن کی علمی اور اخلاقی زندگی چکبستؔ کے لئے مشعلِ راہ تھی۔وہ درآبرؔ کی طرح مذہبی حد بندیوں کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے تھے۔اُن کے نزدیک انسان کے دُکھ درد کا احساس کرنا ہی آدمیت اور انسانیت ہے۔

وہ مُلک کی آزادی اور حقوق کی بحالی کو اپنی ذمّہ داری اور قوم کی خدمت کو اپنا اہم فریضہ سمجھتے تھے۔وہ مذہبی تفریق، ہندو مسلم نفاق، فرقہ بندی، تعصب اور تنگ نظری کو وطن وقوم کے لئے سمِ قاتل سمجھتے تھے۔اُن کی خواہش تھی کہ آدمی آدمی کو انسان کی حیثیت سے دیکھے۔قومی یک جہتی اور ہم آہنگی کی ایسی فضا ہم وار ہو کہ ہر شخص ایک دوسرے کا خیال رکھے اور دوسرے کے دُکھ درد کو اپنا دُکھ درد سمجھے۔وہ سیاست میں بھی پنڈت بشن نرائن درآبرؔ کے ہم خیال تھے اور اُنہی کی طرح اعتدال پسند بھی تھے۔جب کانگریس میں باہمی اختلافات بڑھنے لگے اور معتدل مزاجوں کی کمی اور انتہا پسندوں کی اکثریت ہونے لگی تو انہوں نے پنڈت بشن نرائن درآبرؔ اور بابو گنگا پرساد ورما کے ساتھ کانگریس سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔وہ گوپال کرشن گوکھلے کی طرح تشدّد، افراتفری اور ہنگامے کے بغیر اپنے حقوق کی بحالی کے خواہاں تھے۔

مسز اینی بیسنٹ کے خیالات ونظریات سے چکبستؔ اس قدر متاثر ہوئے کہ انہوں نے ہوم رول کو ہندوستان کی نجات تصوّر کر لیا تھا۔اُن کا خیال تھا کہ ہوم رول کے ذریعے ہی مُلک وقوم کی بربادی وتباہ حالی کو دُور کیا جا سکتا ہے جس کا اظہار انہوں نے اپنی کئی نظموں میں بھی کیا ہے۔

06.04 پنڈت برج نرائن چکبستؔ کی ادبی خدمات ومقام

﴿۱﴾ **ادبی خدمات:** چکبستؔ نے نظم اور نثر دونوں اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ اُنہوں نے نظمیں بھی لکھی ہیں اور غزلیں بھی کہی ہیں، مراثی بھی لکھے ہیں اور رباعیات بھی کہی ہیں، مضامین بھی تحریر کیے ہیں اور ایک ڈراما بھی قلم بند کیا ہے۔ اس کے علاوہ اُنہوں نے اکتوبر ۱۹۱۸ء میں لکھنؤ سے ایک ادبی رسالہ ''صبحِ اُمّید'' بھی جاری کیا تھا جو تقریباً تین سال تک شائع ہوتا رہا۔ جب دیگر ذمّہ داریوں اور وکالت کے پیشے کی وجہ سے اُن کی مصروفیات بڑھنے لگیں تو اُنہوں نے اس رسالے کو بند کر دیا۔

یہاں اُن کی غزل گوئی، رباعیات، مضامین نویسی، ڈراما نگاری اور رسالہ ''صبحِ اُمّید'' کا سرسری جائزہ لیا جا رہا ہے۔

چکبستؔ کی نشو ونما لکھنؤ کی اُس آب وہوا میں ہوئی جہاں غزل اور مرثیے کا جادو سر چڑھ کر بول رہا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ چکبستؔ کے مزاج میں غزل اور مرثیے کا مذاق رَچ بس گیا تھا۔ اُنہوں نے متعدد اُستاد شعرا کے کلام کا بہ غائرِ نظر مطالعہ کیا تھا۔ وہ آتشؔ، غالبؔ اور انیسؔ سے بے حد متاثر تھے اور سلاستِ زبان، حُسنِ تراکیب اور بندشِ الفاظ میں وہ اِنہی اساتذہ کی پیروی کرنے کی بھرپور کوشش بھی کرتے تھے۔ کلامِ چکبستؔ کی نمایاں خوبیاں تاثیر، درد، صفائی، سادگی، خیالات کی بلند پروازی اور مضامین کی تازگی ہیں۔

اُن کے یہاں لکھنؤ کے بیش تر شعرا کی طرح زلف ورُخسار کے قصّے، معاملہ بندی، گُل وبُلبُل کے افسانے، رنگینی، تصنع اور صنعت کی بھرمار تو نظر نہیں آتی مگر اُن کی غزلیں لکھنوی مذاق ومزاج اور حُسن وعشق کی چاشنی سے بالکل مبرّا بھی نہیں ہیں، ہاں ''بازنانِ حرف گفتن'' سے آگے کی چیز ضرور ہیں۔ اُن کے یہاں عشق ومحبت کی داستانیں خال خال ہی نظر آتی ہیں۔ وہ صرف شاعر اور وکیل ہی نہیں تھے بلکہ سیاسی حالات اور سماجی اصلاحات پر بھی غور وفکر کرتے تھے۔ اُن کا دل حبِّ قومی اور وطن کی محبت سے لبریز تھا۔ اُن کے یہاں عشقیہ مضامین بھی نئے احساسات اور قومی زندگی کے بدلتے ہوئے رجحانات کے عکّاس ہیں۔ دراصل وہ اُردو کے پہلے ایسے شاعر ہیں جن کی غزلوں میں باقاعدہ طور پر سیاسی رنگ نظر آتا ہے۔ وہ اپنی نظموں ہی کی طرح غزلوں کے ذریعے اہلِ وطن کو بیداری کا پیغام دیتے ہیں۔ بطورِ مثال پیش ہیں چند اشعار:

فنا نہیں ہے محبت کی رنگ و بو کے لئے
بہارِ عالمِ فانی رہے رہے نہ رہے

جنونِ حُبِّ وطن کا مزا شباب میں ہے
لہو میں پھر یہ روانی رہے رہے نہ رہے

مٹنے والوں کی وفا کا یہ سبق یاد رہے
بیڑیاں پاؤں میں ہوں اور دل آزاد رہے

مجھ کو مل جائے چہکنے کے لئے شاخ مِری
کون کہتا ہے کہ گلشن میں نہ صیّاد رہے

زباں کو بند کریں یا مجھے اسیر کریں
مِرے خیال کو بیڑی پنہا نہیں سکتے

اُبھرنے ہی نہیں دیتی یہاں بے مائیگی دل کی
نہیں تو کون قطرہ ہے جو دریا ہو نہیں سکتا

اُنہیں یہ فکر ہے ہر دم نئی طرزِ جفا کیا ہے
ہمیں یہ شوق ہے دیکھیں ستم کی انتہا کیا ہے

لکھا یہ داورِ محشر نے میری فردِ عصیاں میں
یہ وہ بندہ ہے جس پر ناز کرتا ہے کرم میرا

مختلف زبانوں کے شاعروں نے حیات ومَوت کے فلسفے کو اپنے اپنے خیال کے مطابق اپنے اپنے انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔چکبستؔ نے بھی حیات ومَوت کے فلسفے کا نہایت گہرائی اور گیرائی سے مطالعہ کیا تھا۔حیات ومَوت کے موضوعات سے متعلّق چکبستؔ نے بھی متعدد اشعار کہے ہیں جنہیں پڑھ کر نہ صرف اُن کے خیالات کو سمجھا جا سکتا ہے بلکہ یہ بھی احساس ہوتا ہے کہ جس قدر صاف اور واضح طور پر چکبستؔ نے اس موضوع کو اشعار کے سانچے میں ڈھالا ہے اُس کی مثال شاید اُردو کے دوسرے شعرا کے یہاں ملنی آسان نہیں۔

چند اشعار ملاحظہ ہوں:

زندگی کیا ہے عناصر میں ظہورِ ترتیب ۔۔۔ مَوت کیا ہے اِنہی اجزا کا پریشاں ہونا
عروسِ جاں نیا پیراہنِ ہستی بدلتی ہے ۔۔۔ فقط تمہید آنے کی ہے دنیا سے گزر جانا
جس پہ احباب بہت روئے فقط اتنا تھا ۔۔۔ گھر کو ویران کیا قبر کو آباد کیا
اگر کون ومکاں اک شعبدہ ہے تیری قدرت کا ۔۔۔ تو اس دنیا میں آخر کس لئے آیا قدم میرا

چکبستؔ کے یہاں فلسفیانہ خیالات کی بھر مار نہیں۔سماجی اصلاحات اور روزمرّہ کی زندگی میں رونما ہونے والے واقعات ومسائل چکبستؔ کی غزلیہ شاعری کے اہم موضوعات ہیں۔اُنہوں نے بہ اعتبارِ مضامین غزل میں وسعت پیدا کی اور اُسے جدت وترقّی عطا کر کے قدیم روش سے علاحدہ کرنے کی کوشش بھی کی ہے۔اُنہوں نے فرسودہ تشبیہات،استعارات اور لوازماتِ غزل گوئی کے بجائے شیرینی،صفائی، سلاست،روانی،بندشِ الفاظ اور حُسنِ تراکیب کے ذریعے غزل کو نئی آب وتاب عطا کی۔اُنہوں نے طویل غزلیں بھی کہی ہیں اور مختصر غزلیں بھی کہی ہیں۔اُن کی غزلوں میں کہیں اُلجھاؤ اور پیچیدگی نہیں،خیالات رکیک اور گنجلک نہیں۔وہ ثقیل،دقیق اور غیر مانوس الفاظ کے استعمال کو پسند نہیں کرتے۔اُنہوں نے قدیم تشبیہات واستعارات کو بھی نئے طور سے پیش کرنے کا قابلِ قدر کارنامہ انجام دیا۔تشبیہات واستعارات کو اپنے خاص انداز سے استعمال کرنے اور محاورات وروزمرّہ کو موقع ومحل کی مناسبت سے نظم کرنے کے سبب اُن کے کلام کا حُسن نہ صرف دوبالا ہوا ہے بلکہ تاثیر اور دل آویزی میں حد درجہ اضافہ بھی ہوا ہے۔بطورِ مثال پیش ہیں چند اشعار:

تیرے دل میں اور میرے دل میں ہے واعظ یہ فرق ۔۔۔ وہ چراغِ صبح ہے اور یہ چراغِ شام ہے
مردِ قانع کو نہیں رہتی گدائی کی ہوس ۔۔۔ پاؤں پھیلا کر جو بیٹھا، ہاتھ پھیلاتا نہیں
اک ہستیِ بیدار کے دونوں ہیں کرشمے ۔۔۔ موجوں میں روانی ہے، جوانی ہے بشر میں
نہیں ہوتا ہے محتاجِ نمائش فیض شبنم کا ۔۔۔ اندھیری رات میں موتی لُٹا جاتی ہے گلشن میں
اُبھرنے ہی نہیں دیتی یہاں بے مائیگی دل کی ۔۔۔ نہیں تو کون قطرہ ہے جو دریا ہو نہیں سکتا
دردِ دل پاسِ وفا جذبۂ ایماں ہونا ۔۔۔ آدمیّت ہے یہی اور یہی انساں ہونا

چکبستؔ نے متعدد رباعیات بھی کہی ہیں۔نظموں کی طرح اُن کی رباعیوں میں بھی انفرادیت ہے،جن میں مقصد اور پیغام کے ساتھ فکر کی گہرائی بھی ہے اور فلسفے کا رنگ بھی کسی حد تک نظر آتا ہے۔

بطورِ نمونہ پیش ہیں دو رباعیاں:

یہ قوم ذرا عاقبت اندیش نہیں ۔۔۔ سودا تو ہے نوش کا سر نیش نہیں
پہلے کی ترقّی سے ہیں کتنے پیچھے ۔۔۔ افسوس ہمیں کچھ بھی پس و پیش نہیں

آبادی ہے اصل میں نہ ویرانہ ہے شادی کا یہ گھر ہے نہ عزاخانہ ہے
واللہ مبتدا ہے اس کی نہ خبر دنیا اک نا تمام افسانہ ہے

چکبستؔ نے اپنے پسندیدہ افراد کی وفات سے متاثر ہوکر مراثی بھی کہے ہیں جو مسدّس کی ہیئت میں ہیں۔ یہ مراثی مرنے والے کی خوبیوں، سیرت اور انفرادی حیثیت کے آئینہ دار تو ہیں ہی، چکبستؔ کے درد و کرب اور تاثرات کا بہترین نمونہ بھی ہیں۔ چکبستؔ کا اندازِ بیان اس قدر پُر اثر ہے کہ مراثی پڑھنے والا بھی رنج و غم میں مبتلا ہوئے بغیر نہیں رہتا۔

چکبست نے کل ۹ رمرثیے نظم کیے ہیں جنہیں دو حصّوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلی قسم ایسے مرثیوں کی ہے جو اُنہوں نے اپنے عزیز دوست، احباب اور اپنے محبوب افراد کی وفات پر کہے ہیں۔ دوسری قسم ایسے مرثیوں کی ہے جو انہوں نے اپنے پسندیدہ قومی رہ نماؤں اور سیاسی قائدوں کے انتقال پر نظم کیے ہیں۔ پہلی قسم کے مرثیوں میں چکبستؔ نے اپنے جذبات اور رنج و غم کے ساتھ مرنے والے سے ذاتی تعلّقات کا بیان نہایت پُر اثر انداز میں کیا ہے۔ پنڈت پرتاپ کشن گرٹو، چکبستؔ کے بے تکلّف دوستوں میں سے ایک تھے جن کا جواں عمری ہی میں انتقال ہوگیا تھا۔ اُن کے انتقالِ پُر ملال پر انہوں نے ''ایک جواں مرگ دوست'' کے عنوان سے ایک مرثیہ لکھا جس میں اُنہوں نے اپنے ذاتی تعلّقات کے ساتھ مرنے والے کی خوبیوں کو بھی نظم کیا ہے۔ مرثیے کا پہلا بند ملاحظہ ہو:

پھر رہی ہے دیدۂ مشتاق میں صورت تیری کھیلتی رہتی تھی ہر دَم تیرے ہونٹوں پر ہنسی
ہے ہمارے پردہ ہائے گوش میں اب تک بسی گفتگو تیری جوانی کی اُمنگوں سے بھری
اب وہ لطفِ زندگی حاصل نہ ہوگا خواب میں
جاں نشیں تیرا کہاں ہے صحبتِ احباب میں

چکبست اپنے رنج و غم کے ساتھ مرنے والے کے عزیز و اقارب کے حالات اور رنج و غم کی کیفیات کی بھی عکّاسی کرنے میں مہارت رکھتے ہیں۔ اُنہوں نے اسی مرثیے میں گرٹو صاحب کی جواں سال بیوہ کے رنج و غم کا اظہار اپنے خاص انداز میں اس طرح کیا ہے:

دیکھ تیری بیوۂ غمگیں پہ کیا اُفتاد ہے محوِ حیرت یاس سے وہ کشتۂ بے داد ہے
مہرِ خاموشی لبوں پر دل میں تیری یاد ہے خانۂ ویراں کی صورت خاطرِ نا شاد ہے
خاک آلودہ مسرّت ہائے پنہاں ہوگئیں
آرزوئیں دل کی سب خوابِ پریشاں ہوگئیں

''ماتمِ یاس'' کے عنوان سے کہے گئے پنڈت اجودھیا ناتھ آغا کے نوحے میں اُن کے دوست شری نرائن مشرا کے حالات و جذبات کی عکّاسی اُنہوں نے ان الفاظ میں کی ہے:

تیری بالیں پر کھڑا ہے اور بھی اک سوگوار وہ عزیزوں سے سوا تیرا انیس و غم گسار
چھوڑ کر گھر بار تجھ پر جان کی اپنی نثار یہ محبت کا فسانہ بھی رہے گا یادگار
گو کہ باقی اب دلوں میں جذبۂ عالی نہیں
پاک روحوں سے مگر دنیا ابھی خالی نہیں

پنڈت بشن نرائن درابؔر کانگریس کے صدر رہ چکے تھے۔ وہ سیاسی رہ نما اور مفکر ہی نہیں تھے بلکہ چکبستؔ کے لئے ایک مثالی انسان بھی تھے۔ چکبستؔ نے اُن کی وفات پر نہایت پُر اثر مرثیہ لکھا جس میں انہوں نے اُن کے خلوص، انسانیت، حُسنِ اخلاق اور جذبۂ خیر جیسے اوصافِ حمیدہ کا ذکر بھی کیا ہے اور اُن کی وفات کو اپنے ذاتی نقصان کے ساتھ قومی نقصان سے بھی تعبیر کیا ہے۔

وہ کہتے ہیں:

صدمۂ عام یہ ہے قوم کا پیارا نہ رہا بے زبانوں کی زباں دل کا سہارا نہ رہا
گلشنِ علم و ادب کا چمن آرا نہ رہا مطلعِ دانش و بینش کا ستارا نہ رہا
سب یہ غم ایک طرف ایک طرف غم اپنا
جس سے دنیا نہیں واقف وہ ہے ماتم اپنا

گوپال کرشن گوکھلے کی شخصیت ہر دل عزیز تھی۔ وہ نہایت شریف اور نیک دل انسان تھے۔ وہ تعلیم کے ساتھ ساتھ مُلکی نظام میں بھی دخل رکھتے تھے۔ ان سب کے علاوہ وہ قوم ومُلک کے ایسے رہبر وقائد بھی تھے جو مذہب وملّت کی تفریق سے بالاتر ہو کر ہر طبقے کے افراد کا خیال رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ لوگ اُن پر بھرپور اعتماد بھی کرتے تھے۔ اُن کی وفات پر لکھے گئے مرثیے میں چکبستؔ نے اُن کی خدمات کے ذکر کے ساتھ قومِ ہند کے غم کی بھی منظر کشی کی ہے۔ وہ اس مرثیے کا آغاز اس طرح کرتے ہیں:

لرز رہا تھا وطن جس خیال کے ڈر سے وہ آج خون رُلاتا ہے دیدۂ تر سے
صدا یہ آتی ہے پھل پھول اور پتھر سے زمیں پہ تاج گرا قومِ ہند کے سر سے
حبیب قوم کا دنیا سے یوں روانہ ہوا
''زمیں اُلٹ گئی کیا منقلب زمانہ ہوا''

چکبستؔ کو بال گنگا دھر تِلک کے نظریات اور سیاسی خیالات سے سخت اختلاف تھا۔ تلک انتہا پسند اور کانگریس کے بائیں بازو کے رہ نما تھے۔ کانگریس کے جلسوں میں انگلستان کا قومی ترانہ گایا جاتا تھا۔ اُنہوں نے ہی سب سے پہلے اس کے خلاف احتجاج کیا تھا۔ وہ انگریز اور اُن کی حکومت سے سخت متنفّر تھے۔ وہ انگریزوں کو بزورِ بازو مُلک سے نکال کر آزادی حاصل کرنے کے حامی تھے جب کہ چکبستؔ اعتدال پسند طبقے سے تعلّق رکھتے تھے۔ اس کے باوجود اُنہیں تِلک کے انتقال سے گہرا صدمہ پہنچا۔ اُنہوں نے نظریاتی اور سیاسی اختلافات کو بھُلا کر نہایت پُر اثر مرثیہ لکھا اور اس مرثیے میں اُن کی قومی خدمات کا کھُلے دل سے اعتراف کیا۔

پیش ہے اس مرثیے کا پہلا بند:

مَوت نے رات کے پردے میں کیا کیسا وار روشنی صبحِ وطن کی ہے کہ ماتم کا غبار
معرکہ سرد ہے سویا ہے وطن کا سردار طنطنہ شیر کا باقی نہیں سونی ہے کچھار
بے کسی چھائی ہے تقدیر پھری جاتی ہے
قوم کے ہاتھ سے تلوار گری جاتی ہے

چکبستؔ چوں کہ میر انیسؔ سے متاثر تھے اس لئے اُن کے مرثیوں میں میر انیسؔ کے مرثیوں ہی کی طرح سادگی، سلاست، تصویر کشی اور جذبات کی صحیح مصوّری نظر آتی ہے مگر مرثیے کے عام انداز یا معیّنہ عناصر یعنی چہرہ، رخصت، سراپا، آمد، رجز، مناظرِ جنگ، مناظرِ قدرت اور گھوڑے کی تعریف وغیرہ نظر نہیں آئے گی۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ انیسؔ نے محبتِ اہلِ بیت سے سرشار ہو کر مرثیے کہے ہیں جب کہ چکبستؔ نے عام انسانوں اور اپنے عزیزوں کے مرثیے لکھے ہیں۔

چکبستؔ کے شعری کارناموں کی طرح نثری کارنامے بھی نہایت اہم ہیں۔ اُن کے سماجی، سیاسی، تاثراتی، ادبی اور تنقیدی مضامین اپنے دَور کے مؤقر رسائل زمانہ، ادیب، اودھ پنچ، تہذیب، کشمیر دَرپن اور صبحِ اُمید وغیرہ میں شائع ہوتے تھے۔ اُن کے بیس مضامین کا مجموعہ ''مضامینِ چکبستؔ'' کے نام سے منظرِ عام پر آچکا ہے جس میں زیادہ تر ادبی مقالات ہیں۔ دیباچۂ گلزارِ نسیم، اودھ پنچ، داغ، اُردو شاعری، ذات کی تفریق، تاریخِ بھارت دَرپن اور رتن ناتھ سرشارؔ کا شمار اُن کے نہایت اہم مضامین و مقالات میں کیا جا سکتا ہے۔ بعض کتابوں کے دیباچے اور صبحِ اُمّید کے اداریے بھی اُن کی اہم نثری کاوشیں ہیں۔

چکبستؔ کے مضامین و مقالات کے مطالعے سے اُن کی علمی صلاحیت اور قوّتِ تنقید کے علاوہ اُن کے سیاسی رجحان اور تاریخی و سماجی نقطۂ نظر کا بھی پتہ چلتا ہے۔ اُن کے بیش تر تاثراتی مضامین اُنہی حضرات سے متعلّق ہیں جن سے اُنہیں محبت و اُنسیت یا عقیدت تھی۔ منشی سجّاد حُسین، تربھون ناتھ ہجر اور پنڈت بشن نرائن دُرآبرؔ کے سانحۂ ارتحال سے متاثر ہو کر جب وہ اپنے جذبات صفحۂ قرطاس پر رقم کرتے ہیں تو وہ اپنے ذاتی ملال کے ساتھ قومی اور ادبی نقصان ہونے کی بھی ایسی عکّاسی کرتے ہیں جس خلا کو کبھی پُر نہیں کیا جا سکتا۔ وہ ان حضرات کی خوبیوں اور محاسن کے ذکر کے ساتھ کمزوریوں اور لغزشوں کا اظہار کرنے میں بھی نہیں ہچکچاتے۔ تاثراتی ہونے کے باوجود ان مضامین میں کہیں جانب داری نظر نہیں آتی بلکہ صاف گوئی، متانت اور منصف مزاجی ہر جگہ نمایاں ہے۔

جب گلزارِ نسیم کی اشاعت پر خواجہ الطاف حُسین حالیؔ اور دیگر نقّادانِ فن نے اعتراضات کیے تو اُس وقت بھی چکبستؔ نے نہایت متانت و سنجیدگی سے تمام اعتراضات کے جوابات دیے اور اس ادبی معرکے کو دلائل و براہین سے سر کیا۔ اگرچہ معرکۂ چکبستؔ و شرؔر میں وہ کبھی کبھی دائرۂ اعتدال سے باہر بھی چلے جاتے ہیں مگر دلائل و براہین کے ساتھ اثبات فراہم کرنے کا انداز اُن کی تنقید میں ضرور پایا جاتا ہے۔ وہ ہر اعتراض کی تہ تک پہنچ کر اُس کی بیخ کنی کرنے میں مہارت رکھتے تھے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اُن کا یہ انداز اُن کے وکالت کے پیشے کا عطا کردہ ہے۔ اصولِ تنقید یا تنقیدِ شعر کے اعتبار سے ''اُردو شاعری'' اُن کا ایک نہایت اہم تنقیدی مضمون ہے۔ اس مضمون کے مطالعے سے شاعری سے متعلّق چکبستؔ کے خیالات کا اندازہ بہ آسانی لگایا جا سکتا ہے۔

چکبستؔ کے مقالات و مضامین اس حیثیت سے بھی اہمیت کے حامل ہیں کہ وہ موضوع کے اعتبار سے طرزِ تحریر بھی اختیار کرتے ہیں۔ اُن کے تنقیدی مقالات میں سنجیدگی، متانت، استدلال اور تحقیق کی جلوہ گری ہے۔ سماجی اور تاریخی مضامین میں عالمانہ اندازِ نظر، تفکّر اور صحتِ بیان کو نمایاں طور پر محسوس کیا جا سکتا ہے۔ سیاسی مضامین اور حالات و واقعات پر مبنی صاف اور واضح خیالات کا بہترین نمونہ ہیں۔ اسی طرح ''صبحِ اُمّید'' کے بیش تر اداریے اُنہیں ایک بے باک اور غیر جانب دار صحافی ثابت کرنے کے لئے کافی ہیں۔

﴿۲﴾ ادبی مقام: چکبستؔ اپنے عہد کے ایک ایسے شاعر و ادیب تھے جو سیاسی طور پر بہت بڑے مفکّر نہ سہی مگر اُن کا دل حُبِّ قومی اور حُبّ الوطنی کے جذبے سے معمور تھا۔ اُن کے عہد میں مُلک کی مکمّل آزادی کا جذبہ بیدار نہیں ہوا تھا۔ ہوم رول کی تحریک زور پکڑ رہی تھی۔ انگریزوں کی حکومت کے زیرِ سایہ ہوم رول یعنی مُلک کے اندرونی انتظامات ہندوستانیوں کے ہاتھوں میں سونپ دینے پر زور دیا جا رہا تھا۔ چکبستؔ کے فن پارے انہی خیالات کے آئینہ دار ہیں۔ اُن کی شاعری میں قومی اتّحاد، آزادیِ رائے اور حُبِّ وطن کے ساتھ ایک محدود قسم کے جذبۂ آزادی یعنی ہوم رول کے نعرے کی آمیزش ہے۔ اُن کا کلام اصلاحی اور تبلیغی ہونے کے ساتھ خلوص و محبت کے جذبات کے سبب بُلند پائے کا ہے۔ چکبستؔ کے کلام کے سرسری مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ اُن کا کلام ایک طرف اُن کے دَور کے سیاسی تصورات و خیالات کا عکّاس ہے تو دوسری طرف اودھ کی تہذیب و معاشرت اور لطافت و نفاست کا بہترین نمونہ بھی ہے۔

چکبستؔ کو زبان و بیان پر مکمّل قدرت حاصل تھی۔ وہ ثقیل، دقیق اور نامانوس الفاظ کے استعمال کو مستحسن نہیں سمجھتے تھے بلکہ خشک اور سنجیدہ مسائل و موضوعات کو بھی شگفتہ اور لطیف پیرائے میں ادا کرنے میں مہارت رکھتے تھے۔ اُن کی چند نظموں اور غزلوں کے کچھ اشعار بھی منظر نگاری کا بہترین نمونہ ہیں۔ اگر چکبستؔ نے منظر نگاری کی طرف خاص توجّہ دی ہوتی تو اُن کا کلام بھی دیگر شعرائے فطرت کے کلام کے حسین مرقعوں کی طرح آراستہ ہوتا۔ چکبستؔ نے لفظیات اور ڈکشن کے اعتبار سے بھی غزل اور نظم دونوں میں وسعت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ اُنہوں نے اپنے کلام میں سوراج، ہوم رول، سوربیر، دھرم، گیان، راگ، راگ مالا اور تاریخِ ہند کے اہم کردار گوتم، خواجہ معین الدین چشتی، بھیشم، اَرجن، اکبر، رانا وغیرہ کی سیرت اور کارناموں کو بھی اُجاگر کر کے غیرت دلانے کی کوشش کی ہے۔

وہ فارسی اور عربی زبان کے مروّجہ الفاظ کا استعمال بھی نہایت چابک دستی، خوب صورتی، لطافت اور فن کاری کے ساتھ کرنے میں مہارت رکھتے ہیں۔ درد و اثر، سادگی و رنگینی، برجستگی و صاف گوئی، جوش و خروش اور خلوص و محبت کلامِ چکبست کی نمایاں خوبیاں ہیں۔ انہی خوبیوں کے سبب اُن کا شمار اپنے دَور کے صفِ اوّل کے ممتاز و منفرد شعرا میں کیا جاتا ہے۔

06.05 پنڈت برج نرائن چکبستؔ کی نظم نگاری

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کی ناکامی کے بعد ہندوستانیوں کے حوصلے پست تو ضرور ہوئے مگر اُن کے دلوں میں حُبّ الوطنی اور حُبِّ قومی کے جذبات بھی بیدار ہونے لگے۔ سیاسی اور سماجی زندگی کے ساتھ اُردو شاعری کے موضوعات و آہنگ میں بھی تبدیلیاں دستک دینے لگیں مگر غزل اپنے روایتی انداز کے ساتھ حُسن و عشق کے موضوع کے اردگرد ہی گھوم رہی تھی۔ چکبستؔ کی ولادت اس جنگِ آزادی کے تقریباً ۲۵ سال کے بعد ہوئی تھی۔ شروع میں چکبستؔ بھی غزل کی طرف متوجہ ہوئے مگر حبِّ قومی اور حُبّ الوطنی کے جذبے سے سرشار ہونے کے سبب نظم گوئی کی طرف مائل ہو گئے۔ عہد چکبستؔ میں انگریزوں کی حکومت ہندوستان میں نہایت مضبوط و مستحکم ہو چکی تھی۔ ذلّت و رسوائی کے عالم میں زندگی بسر کرنا اور انگریز حکمرانوں کے ظلم و ستم کو برداشت کرنا ہندوستانیوں کا مقدّر بن چکا تھا۔ غریبی، مجبوری اور دریوزہ گری سے نجات حاصل کرنے کی کوئی راہ نظر نہیں آ رہی تھی۔ دانش وَروں، سیاست دانوں، حوصلہ مند نوجوانوں اور خوددار و غیور فرزندانِ ہند کے دلوں میں شمع آزادی روشن ہونے لگی تھی۔

چکبستؔ ان سب حالات سے بخوبی واقف بھی تھے اور اُنہیں موجودہ واقعات و مسائل کا شدید احساس بھی تھا۔ اُنہوں نے ایسے نازک وقت میں ہندوستانیوں کو احساسِ کمتری سے نجات دلانے اور اُن کے عزم و حوصلے کو بڑھانے کے لئے ہندوستان کی عظمت کے گیت گائے۔ اپنے وطن کے شان دار ماضی اور اُن جیالوں کا ذکر نہایت عزّت و احترام کے ساتھ کیا جن کے بے مثال کارناموں نے سرزمینِ ہند کو عظمت و بلندی عطا کی۔ وہ اپنی مشہور نظم ''خاکِ ہند'' میں اس طرح گویا ہوتے ہیں:

اے خاکِ ہند تیری عظمت میں کیا گماں ہے دریائے فیضِ قدرت تیرے لئے رواں ہے
تیری جبیں سے نورِ حُسنِ ازل عیاں ہے اللہ رے زیب و زینت کیا اوجِ عزّ و شاں ہے
ہر صبح ہے یہ خدمت خورشیدِ پُر ضیا کی
کرنوں سے گوندھتا ہے چوٹی ہمالیہ کی
گوتمؔ نے آبرو دی اِس معبدِ کہن کو سرمدؔ نے اِس زمیں پر صدقے کیا وطن کو
اکبرؔ نے جامِ اُلفت بخشا اِس انجمن کو سینچا لہو سے اپنے رانؔا نے اِس چمن کو
سب سور بیر اپنے اِس خاک میں نہاں ہیں
ٹوٹے ہوئے کھنڈر ہیں یا اُن کی ہڈّیاں ہیں

چکبست نے مذکورہ نظم ''خاکِ ہند'' ۱۹۰۵ء میں اُس وقت کہی تھی جب ایک طرف انتہا پسند رہ نما انگریزوں کو طاقت کے ذریعے مُلک سے باہر کرنے کے درپئے تھے تو دوسری طرف اعتدال پسند قائد انگریزی سرکار کی ماتحتی میں اپنے حقوق کی بحالی چاہتے تھے۔ گوپال کرشن گوکھلے اور پنڈت بشن نرائن درابؔر کا تعلّق اِسی معتدل مزاج طبقے سے تھا۔ چکبستؔ بھی اِنہی حضرات کے خیالات سے متاثر تھے۔ وہ اگر چہ ہمیشہ عملی سیاست سے دور رہے مگر اُن کی بیش تر نظمیں اُن کے سیاسی اور قومی تصوّرات کی آئینہ دار ہیں۔ اُنہیں اپنے وطن ہندوستان کی کسی چیز میں کوئی کمی محسوس نہیں ہوتی۔ وہ ہر چیز پر فخر کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس مُلک میں اگر کسی چیز کی کمی ہے تو وہ حبِّ قومی اور حُبِّ وطن کا جذبہ ہے۔ اگر حُبِّ وطن کے جذبے کا فقدان نہ ہوتا تو انگریز ہندوستان پر مسلّط نہ ہوتے۔ ایک بند ملاحظہ فرمائیں:

اگلی سی تازگی ہے پھولوں میں اور پھلوں میں کرتے ہیں رقص اب تک طاؤس جنگلوں میں
اب تک وہی کڑک ہے بجلی کی بادلوں میں پستی سی آ گئی ہے پر دل کے حوصلوں میں
گُل شمعِ انجمن ہے گو انجمن وہی ہے
حُبِّ وطن نہیں ہے ، خاکِ وطن وہی ہے

چکبستؔ نے اپنے کلام کو ''صورِ حُبِّ قومی'' سے تعبیر کرتے ہوئے سوئی ہوئی قوم کو بیدار کرنے، غافلوں کو جھنجھوڑنے اور افسردہ دلوں میں جوش و ولولہ بھرنے کی آخری دم تک کوشش کی۔ وہ کہتے ہیں:

اے صورِ حُبِّ قومی اِس خواب سے جگا دے بھولا ہوا فسانہ کانوں کو پھر سُنا دے
مُردہ طبیعتوں کی افسردگی مٹا دے اُٹھتے ہوئے شرارے اِس راکھ سے دکھا دے

حُبِّ وطن سمائے آنکھوں میں نور ہو کر
سر میں خمار ہو کر دل میں سرور ہو کر

فرقہ بندی، مذہبی منافرت اور ہندو مسلم نفاق نے مُلک کی خوش گوار اور پُر امن فضا کو مکدّر اور پراگندہ کر دیا تھا۔ ایک طرف باہمی ربط ضبط، میل ملاپ اور بھائی چارے کے ذریعے قومی یک جہتی، فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور سیاسی بیداری کے لئے کوششیں کی جا رہی تھیں تو دوسری طرف فرقہ واریت کا عفریت ننگا ناچ کرنے پر اُتارو تھا۔ ہندوستانیوں اور ہندوستانی سیاست کے لئے یہ دَور بہت نازک اور سوچ سمجھ کر قدم اُٹھانے والا تھا۔ ایسے نازک دَور میں چکبستؔ نے اپنے کلام کے ذریعے اتّحاد و اتّفاق کی فضا کو ہم وَار کرنے اور مُلک کی سالمیت و آزادی کی راہ میں حائل ہونے والی طاقتوں سے ہوشیار اور باخبر رہنے کی بھرپور تلقین کی ہے۔ وہ کہتے ہیں:

نئے جھگڑے، نرالی کاوشیں ایجاد کرتے ہیں وطن کی آبرو اہلِ وطن برباد کرتے ہیں
بلائے جاں ہیں یہ تسبیح اور زنّار کے جھگڑے دلِ حق بیں کو ہم اِس قید سے آزاد کرتے ہیں

چکبستؔ کا پیغام مذہب و ملّت کی تفریق سے بالاتر تھا۔ وہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو شیر و شکر کی طرح گھُل مل کر ایک ہو جانے، تسبیح و زنّار کے جھگڑوں اور باہمی اختلافات کو جڑ سے اُکھاڑ پھینکنے کے خواہاں تھے۔ وہ دونوں مذاہب کے لوگوں سے مُلک کی تعمیر و ترقّی میں حصّہ لینے اور اپنے وطن میں اپنے نظامِ حکومت کو نافذ کروانے کی مسلسل تلقین کرتے رہے۔ وہ ہندوؤں سے اس طرح مخاطب ہوتے ہیں:

بھنور میں قوم کا بیڑا ہے ہندوؤ ! ہشیار اندھیری رات ہے کالی گھٹا ہے اور منجدھار
اگر پڑے رہے غفلت کی نیند میں سرشار تو زیرِ موجِ فنا ہوگا آبرو کا مزار
مٹے گی قوم، یہ بیڑا تمام ڈوبے گا
جہاں میں بھیشم و ارجن کا نام ڈوبے گا

اس کے بعد وہ مسلمانوں کو شعری پیرایے میں اس طرح غیرت دلاتے نظر آتے ہیں:

دکھا دو جوہرِ اسلام اے مسلمانو! وقارِ قوم گیا، قوم کے نگہبانو!
ستون مُلک کے ہو اِس کی قدر تو جانو! جفا وطن پہ ہے، فرضِ جفا تو پہچانو!
نبی کے خلق و مروّت کے ورثہ دار ہو تم
عرب کی شانِ حمیت کی یادگار ہو تم

چکبستؔ نے ہندوستانیوں کو اپنی نظموں کے ذریعے شری کرشن، گوتم بُدھ، خواجہ معین الدین چشتی، سرمد، اکبر اعظم اور مہارانا پرتاپ وغیرہ کی سیرت و کردار اور اُن کی اعلیٰ تعلیمات کا درس دیا۔ اُنہیں ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب، خوش گوار آب و ہَوا، ساون، بادل، برسات، جنگل، جھیل اور جھرنوں وغیرہ سے جذباتی لگاؤ اور والہانہ عشق تھا۔ اسی والہانہ پن اور فریفتگی نے اُن کی نظموں کو حُبُّ الوطنی کی روح سے معمور کر دیا تھا۔ وہ بچّوں کے لئے کہی گئی اپنی ایک نظم بعنوان ''ہمارا وطن دل سے پیارا وطن'' میں ہندوستان کے مناظر کا ذکر کرتے ہوئے اُس کی عظمت کا اعتراف اس طرح کرتے ہیں:

ہَوا میں درختوں کا وہ جھومنا وہ پتّوں کا پھولوں کا مُنہ چومنا
ہمارا وطن دل سے پیارا وطن
وہ باغوں میں کویل وہ جنگل کے مور وہ گنگا کی لہریں وہ جمنا کا زور
ہمارا وطن دل سے پیارا وطن

چکبستؔ نے اپنی ایک نظم ''وطن کو ہم وطن ہم کو مبارک'' میں بھی ایسے ہی خیالات کا اظہار کیا ہے۔ اُنہیں کویل، پپیہے، دریا، پہاڑ، پھل، پھول اور چشمے وغیرہ اس لئے عزیز ہیں کہ اُن کا تعلّق مُلکِ ہند سے ہے۔ اُن کے نزدیک ہندوستان کی خاک اکسیر، کیمیا اور سونے سے بھی بیش بہا ہے۔ وہ اپنی اس نظم کا اختتام اس طرح کرتے ہیں:

وطن کا جن بزرگوں سے ہوا نام اِسی مٹّی میں وہ کرتے ہیں آرام
وطن کو ہم، وطن ہم کو مبارک

جیسا کہ ذکر کیا جا چکا ہے کہ چکبستؔ اعتدال پسند تھے۔ وہ لڑکیوں کی تعلیم اور آزادی سے متعلّق حدِّ ادب کے قائل تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ لڑکیاں ہندوستان کی صحت مند روایت، اخلاقی اقدار اور مشرقی حیا کا خیال رکھتے ہوئے تعلیم حاصل کریں اور لڑکوں کے شانہ بہ شانہ ترقّی کی راہ پر گام زَن ہوں۔ ''لڑکیوں سے خطاب'' اُن کی ایک اہم نظم ہے جس میں انہوں نے لڑکیوں کو مخاطب کرتے ہوئے اپنے اِنہی خیالات کا اظہار کیا ہے۔ پیش ہیں چند اشعار:

روشِ خام پہ مردوں کی نہ جانا ہرگز داغ تعلیم میں اپنی نہ لگانا ہرگز
نقل یورپ کی مناسب ہے مگر یاد رہے خاک میں غیرتِ قومی نہ مٹانا ہرگز
رخ سے پردے کو اُٹھایا تو بہت خوب کیا پردۂ شرم کو دل سے نہ اُٹھانا ہرگز

ہندوؤں کو گائے سے جذباتی لگاؤ ہے وہ اُسے ماتا یا گئو ماتا کہہ کر مخاطب کرتے ہیں۔ چکبستؔ نے اپنی نظم ''گائے'' میں اسی عقیدے اور جذبے کی بہترین ترجمانی کی ہے۔ نظم کا ہر لفظ خلوص، محبت اور عقیدت سے معمور ہے۔ پیش ہے اس نظم کا ایک بند:

صاحبِ دل تجھے تصویرِ وفا کہتے ہیں چشمۂ فیضِ خدا مردِ خدا کہتے ہیں
درد مندوں کی مسیحا شعرا کہتے ہیں ماں تجھے کہتے ہیں ہندو تو بجا کہتے ہیں
کون ہے جس نے ترے دودھ سے مُنہ پھیرا ہے
آج اِس قوم کی رگ رگ میں لہو تیرا ہے

چکبستؔ کی نظمیں ''آصف الدولہ کا امام باڑہ'' اور ''سیرِ دہرادون'' جذبۂ قومیت کے ساتھ منظر نگاری کا بہترین نمونہ ہیں۔ نظم ''آصف الدولہ کا امام باڑہ'' کے دو اشعار پیشِ خدمت ہے:

آصف الدولۂ مرحوم کی تعمیرِ کہن جس کی صنعت کا نہیں صفحۂ ہستی پہ جواب
اک عجب منظرِ دل گیر نظر آتا ہے دور سے عالمِ تصویر نظر آتا ہے

''کرشن کنہیّا، رامائن کا ایک سین، نالۂ درد، قوم کے سورماؤں کو الوداع اور فریادِ قوم'' چکبستؔ کی بہترین نظمیں ہیں۔

06.06 نظم ''آوازۂ قوم'' متن (اقتباس)

یہ خاکِ ہند سے پیدا ہیں جوش کے آثار ہمالیہ سے اُٹھے جیسے ابرِ دریا بار
لہو رگوں میں دکھاتا ہے برق کی رفتار ہوئی ہیں خاک کے پردے میں ہڈّیاں بیدار
زمیں سے عرش تلک شور ہوم رول کا ہے
شباب قوم کا ہے زور ہوم رول کا ہے
نگاہِ شوق ہے اس رنگ کی تماشائی ہے جس سے شیخ و برہمن پہ بے خودی چھائی
ہر ایک گام پہ کرتے ہوئے جبیں سائی چلے ہیں بہرِ زیارت وفا کے سودائی
وطن کے عشق کا بُت بے نقاب نکلا ہے
نئے اُفُق پہ نیا آفتاب نکلا ہے
یہ آرزو ہے کہ مہر و وفا سے کام رہے وطن کے باغ میں اپنا ہی انتظام رہے
گلوں کی فکر میں گل چیں نہ صبح وشام رہے نہ کوئی مُرغِ خوش الحاں اسیرِ دام رہے
سریرِ شاہ کا اقبال ہو بہارِ چمن
رہے چمن کا محافظ یہ تاج دارِ چمن
ہے آج کل کی ہَوا میں وفا کی بربادی سُنے جو کوئی تو سارا چمن ہے فریادی
قفس میں بند ہیں جو آشیاں کے تھے عادی اُڑا ہے باغ سے بو ہو کے رنگِ آزادی
ہوائے شوق میں غنچے بکس نہیں سکتے
ہمارے پھول بھی چاہیں تو ہَنس نہیں سکتے
جو آج کل ہے محبت وطن کی عالم گیر یہی گنہ ہے یہی جرم ہے یہی تقصیر
زباں ہے بند قلم کو پنہائی ہے زنجیر بیانِ درد کی باقی نہیں کوئی تدبیر
ہے دِل میں درد مگر طاقتِ کلام نہیں
لگے ہیں زخم تڑپنے کا انتظام نہیں
جو اپنے حال پہ یہ بے کسی برستی ہے یہ نائبانِ حکومت کی خود پرستی ہے
یہاں سے دور جو برطانیہ کی بستی ہے وہاں سُنا ہے محبت کی جنس سستی ہے
جو اُس پہ حالِ وطن آشکار ہو جائے
یہ دیکھتے رہیں ، بیڑا یہ پار ہو جائے

فدائیانِ حکومت نے ہم کو رنج دیے مگر جو فرضِ وفا تھے ادا وہ ہم نے کیے
نثار جاں سے ہوئے دابِ سلطنت کے لئے شرابِ عیش سمجھ کر لہو کے گھونٹ پیے
ڈِگے نہ پاؤں محبت کے نوکِ خنجر پر
لہو کی مُہر ہے اپنی وفا کے محضر پر

جو اپنے دِل سے ہے برطانیہ کا دِل راضی تو کیا کریں گے یہ ہندوستان کے قاضی
نہ کام آئے گی غیروں کی رخنہ اندازی تمہیں پکار رہی ہے سخی کی فیّاضی
بچی کھچی پہ قناعت ہے ، یوں نہیں پیتے
پلانے والا پلاتا ہے ، کیوں نہیں پیتے

رہا ہے رات کی صحبت میں کیا مزہ باقی نگاہِ شوق کو ہے دورِ نَو کی مشتاقی
نئی شراب ، نیا دور اور نیا ساقی مٹے سرور میں دَیر و حرم کی ناچاقی
یہی کسی کا حرم ہو کسی کا دَیر رہے
یہ مَے کدہ رہے آباد ، خُم کی خیر رہے

شرابِ شوق دوا ہے اِس انجمن کے لئے سُرور اِس کا ہے اکسیر روح وتن کے لئے
کھنچی ہے خُلد میں اِس محفلِ کُہن کے لئے فلک سے اُتری ہے یہ شیخ و برہمن کے لئے
رہے گا دور زمانے میں یادگار اِس کا
یہ ہوم رول کا سودا بھی ہے خمار اِس کا

اسی کے مست کہیں ہیں حرم پہ چھائے ہوئے اذاں کے نعرۂ دِل کش سے حظ اُٹھائے ہوئے
کہیں ہے نغمۂ ناقوس دِل لُبھائے ہوئے اسی فضا میں یہ سب راگ ہیں سمائے ہوئے
یہ حکم پیرِ مغاں کا ہے نشّۂ مَے میں
یہ راگ آکے ملیں ہوم رول کی لَے میں

رقیب کہتے ہیں رنگِ وطن نہیں یکساں بنا ہے قوسِ قزح خاکِ ہند کا داماں
جدھر نگاہ اُٹھے اُس طرف نیا ہے سماں نہ ایک رنگِ طبیعت نہ ایک رنگِ زباں
جو ہوم رول پہ یہ چشمِ شوق شیدا ہو
تمام رنگ ملیں ایک نور پیدا ہو

جو دِل سے قوم کے نکلی ہے وہ دعا ہے یہی تھا جس پہ ناز مسیحا کو وہ صدا ہے یہی
دلوں کو مست جو کرتی ہے وہ ہوا ہے یہی غریب ہند کے آزار کی دوا ہے یہی

نہ چین آئے گا بے ہوم رول پائے ہوئے
فقیر قوم کے بیٹھے ہیں لَو لگائے ہوئے
یہ جوشِ پاک زمانہ دبا نہیں سکتا رگوں میں خوں کی حرارت مٹا نہیں سکتا
یہ آگ وہ ہے جو پانی بُجھا نہیں سکتا دِلوں میں آکے یہ ارمان جا نہیں سکتا
طلب فضول ہے کانٹے کی پھول کے بدلے
نہ لیں بہشت بھی ہم ہوم رول کے بدلے

06.07 نظم ''آوازۂ قوم'' تجزیہ (اقتباس)

سیاسی اعتبار سے ۱۹۱۴ء ہندوستان کی تاریخ میں ایک اہم سال ہے کیوں کہ اسی سال مسز اینی بیسنٹ نے ہندوستان میں ہوم رول تحریک کا آغاز کیا تھا۔ اگر چہ عالمی سیاست کی تاریخ میں یہ تحریک کوئی نئی نہیں تھی۔ اس سے پہلے برطانیہ حکومت کی ماتحتی میں آئرلینڈ کو اپنے اندرونی معاملات میں آزادی حاصل ہو چکی تھی۔

مسز اینی بیسنٹ اور اعتدال پسند رہ نما ہندوستان میں بھی ہوم رول کی حمایت کر رہے تھے۔ چکبستؔ بھی مسز اینی بیسنٹ اور اعتدال پسند رہ نماؤں کے خیالات سے متفق تھے اور برطانیہ حکومت کے زیرِ سایہ مُلک کے اندرونی معاملات میں آزادی حاصل کرنے کے خواہاں تھے۔ اُنہوں نے اسی جذبے کے تحت اپنی شہرۂ آفاق نظم ''آوازۂ قوم'' لکھی۔ اس نظم کے علاوہ ہوم رول کی حمایت میں اُن کی دو نظمیں ''وطن کا راگ'' اور ''ہم ہوں گے عیش ہوگا اور ہوم رول ہوگا'' بھی نہایت اہم ہیں۔

۱۹۱۴ء سے ۱۹۱۷ء تک ہوم رول تحریک کا بہت زور رہا۔ اگر یہ کہا جائے کہ یہ تحریک اس دَور میں اپنے شباب پر تھی تو بے جا نہ ہوگا۔ چکبستؔ نے اپنی اس نظم کے ابتدائی حصّے میں اسی جوش و خروش کی عکّاسی کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جس طرح ہمالیہ سے بادلوں کا دَل خاکِ ہند کو سیراب کرنے کے لئے اُٹھتا ہے اُسی طرح ہوم رول کے نفاذ کے لئے ہر ہندوستانی کا دل جوش و جذبے سے بھرا ہوا ہے۔

مذہب و ملّت کی تفریق سے بالاتر ہو کر ہر شخص ہوم رول کے لئے بے چین و بے تاب ہے۔ ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ نئے افق پر نیا آفتاب جلوہ گر ہونے والا ہے۔ نئے سورج کی سنہری شعاعوں سے ماند پڑی ہوئی ہر شے جگمگانے والی ہے۔ عوام و خواص کے جوش و جذبے کو دیکھ کر ہندوستان کی آزادی کی آس بندھ گئی ہے۔

ہوم رول کی آرزو کی تکمیل بہت جلد ہو جانے کے خیال سے چکبستؔ اسی نظم کے ایک بند میں ہوم رول کی وضاحت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ سریرِ شاہ کا اقبال بُلند ہو اور وہ چمن کی بہار بنے۔ تاج دارِ چمن یعنی شہنشاہِ برطانیہ چمنِ ہندوستان کا محافظ ہو اور وطن کے باغ یعنی اپنے مُلک ہندوستان میں اپنا نظام یا اپنی حکومت کا قیام عمل میں آئے۔ کوئی مُرغِ خوش الحان یعنی ہندوستان کے شہری اسیری کی زندگی سے نجات پا کر آزادی کی خوش گوار فضا میں سانس لے سکیں۔ دراصل یہی ہوم رول تحریک کی صحیح عکّاسی اور نظم ''آوازۂ قوم'' کی روح ہے۔ انگریز حکمرانوں نے ہندوستانیوں پر طرح طرح کی پابندیاں عائد کر رکھی تھیں۔ پریس کی آزادی کو ختم کر دیا گیا تھا۔ تحریر و تقریر پر بھی پابندیاں تھیں۔ کسی مجبور، بے کس اور مصیبت زدہ کی فریاد سُننے والا کوئی نہیں تھا۔

چکبستؔ کی اس نظم کے متعدّد بند اِنہی حالات کے عکّاس ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم انگریزوں کے ظلم و جبر کو کب تک برداشت کرتے رہیں گے۔ بہت سے افراد قید خانوں میں کسمپُرسی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہیں۔ ہندوستانیوں کی وفاداری کی قدر کرنے والا کوئی نہیں ہے۔ یہاں تک کہ چمنِ ہند کے غنچے بھی چٹک نہیں سکتے اور پھول بھی کِھل نہیں سکتے۔ حُبِّ قومی اور حُبُّ الوطنی کو گناہ، جُرم اور قصور تصوّر کیا جاتا ہے۔ زبان و قلم کو زنجیریں پہنا دی گئی ہیں یعنی تحریر و تقریر پر پابندیاں عائد ہیں۔ درد، زخم، سختیوں اور صعوبتوں میں مبتلا ہونے کے باوجود فریاد و فغاں کرنے کی بھی جسارت نہیں۔

اعتدال پسند افراد اور ہوم رول تحریک کے علَم برداروں کا خیال تھا کہ ہندوستان سے دورِ برطانیہ میں رہنے والے اعلیٰ افسروں کو ہندوستانیوں کے حالات و جذبات کا صحیح اندازہ نہیں ہے۔ اس لئے اگر یہاں کے باشندے انگریزوں کے ساتھ حُسنِ سلوک سے پیش آئیں اور اُنہیں اپنی وفاداری کا ثبوت دیں تو وہ خوش ہو کر ہوم رول کا نفاذ کر دیں گے۔ اس طرح بڑی حد تک ہمیں آزادی حاصل ہو جائے گی پھر ہم مکمّل آزادی کے لئے جدّ و جہد کرنے کے لائق بھی ہو جائیں گے۔ اسی خیال کو چکبستؔ نے اپنی اس نظم میں کئی جگہ بیان کیا ہے۔ اُنہوں نے اپنی اسی نظم میں واضح طور پر یہ کہنے میں بھی گریز نہیں کیا کہ مصیبتیں اور تکلیفیں برداشت کرنے کے باوجود بھی ہمیں انگریزوں کو اپنی وفاداری کا ثبوت دیتے رہنا چاہئے کیوں کہ کوئی بھی صعوبت ہوم رول کے سامنے کچھ نہیں۔

چکبستؔ ایک طرف برطانیہ کو اپنی وفاداری کا یقین دلانا چاہتے تھے تو دوسری طرف انگریزوں کے ظلم و جبر کے خلاف آواز بھی بُلند کرنے کو ترجیح دیتے تھے۔ وہ ہندو مُسلم اتّحاد اور قومی یک جہتی کو مُلک کی آزادی یا ہوم رول کے لئے سب سے کارگر نسخہ تصور کرتے تھے جس کا اظہار اُنہوں نے اس نظم میں کئی جگہ واضح طور پر کیا ہے۔ عہدِ چکبستؔ میں اگر چہ ہر شخص حُبِّ وطن کے جذبے سے سرشار نظر آ رہا تھا مگر مُلک کی مکمّل آزادی کا جذبہ ابھی بیدار نہیں ہوا تھا۔ چکبستؔ ہندوستان اور ہندوستانیوں کی بھلائی کے خواہاں تھے۔ چوں کہ وہ کوئی سیاسی مفکر نہ تھے۔ اس لئے وہ چاہتے تھے کہ ہندوستان کی قومی حیثیت ہو اور مُلک کا اندرونی انتظام ہندوستانیوں ہی کے ہاتھوں میں ہو۔ ہوم رول کا نعرہ اور اُس کے نفاذ کے لئے جدّ و جہد کرنا ہی اس نظم کا بنیادی مقصد ہے۔

06.08 خلاصہ

پنڈت برج نرائن چکبستؔ سرزمینِ ہند کے اُن فرزندوں اور شعرا میں سے ایک تھے جن کے رگ و پَے میں قوم و وطن کی محبت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ اُن کے عہد میں غزل اپنے عروج پر تھی اور اُس کا خاص موضوع حُسن و عشق تھا۔ چکبستؔ بھی شروع میں غزل کی طرف مائل ہوئے لیکن حُبِّ قومی اور حُبّ الوطنی کے سبب جلد ہی نظم کی طرف متوجّہ ہو گئے۔

وہ قوم و مُلک کے درد و جذبات کو نظم کے پیرایے میں اچھّی طرح بیان کرنا چاہتے تھے۔ اس لئے اُنہوں نے اپنی ساری توجّہ نظم گوئی پر مرکوز کر دی۔ اُن کی بیش تر نظمیں وطن کی عظمت، قومی اتّحاد، یک جہتی اور اپنے دَور کے سیاسی خیالات و حالات کی آئینہ دار ہیں۔ اُنہوں نے بزرگوں کے شاندار ماضی اور کارناموں کی یاد دلا کر اس مُلک کے باشندوں کو مُلک کی آزادی اور ہوم رول کے نفاذ کے لئے آمادہ کرنے کا بے مثل کارنامہ انجام دیا۔ اُن کے نزدیک ہوم رول ہی میں مُلک و قوم کی فلاح و بہبود اور بہتری مضمر ہے۔ وہ ہوم رول کے عوض بہشت بھی لینے کو تیار نہیں۔

چکبستؔ لکھنؤ کی تہذیب ومعاشرت کے پروردہ ہونے کے ساتھ روشن خیال اور تعلیم یافتہ بھی تھے۔ انہوں نے اپنے اصلاحی اور بیدار کُن کلام کے ذریعے ہندوستانیوں کو خوابِ غفلت سے بیدار کرنے، احساسِ کمتری سے نکالنے اور اُن کے دلوں میں جوش وولولہ بھرنے کا قابلِ قدر کارنامہ کر دکھایا۔ وہ مُلک وقوم کی بدحالی، ہندو مُسلم نفاق، جہالت اور غریبی کو دور کر کے وطن کو آزاد کرانے کے خواہاں تھے اسی لئے مشرقی اقدار واخلاق کے دائرے میں رہ کر تعلیمِ نسواں کی کھُل کر حمایت کرتے تھے۔

چکبستؔ نے اپنے احباب واقارب اور سیاسی رہ نماؤں کی وفات پر پُر اثر مراثی بھی کہے ہیں جن میں اُن کی سیرت، انفرادیت اور اوصاف کو بڑی خوبی سے بیان کیا گیا ہے۔ ساتھ ہی ان بزرگوں کی وفات کو ذاتی غم کے علاوہ قومی اور مُلکی نقصان سے بھی تعبیر کیا گیا ہے۔ اُن کی بعض نظمیں مذہبی اور اخلاقی اصلاح سے تعلّق رکھتی ہیں۔ اُن کی زبان لکھنؤ کی صاف شستہ اور شگفتہ زبان تھی۔ اُن کا مجموعۂ کلام ''صبحِ وطن'' کے نام سے کئی بار شائع ہو چکا ہے۔ چکبستؔ بہت اچھّے نثر نگار بھی تھے۔ انہوں نے متعدّد مضامین بھی قلم بند کیے ہیں اور بعض کتب کے دیباچے بھی رقم کیے ہیں۔ رسالہ 'صبحِ اُمّید' کے لئے تحریر کیے گئے اداریوں کا شمار بھی اُن کے نثری کارناموں میں کیا جاتا ہے۔ اُن کے مضامین کا مجموعہ 'مضامینِ چکبستؔ' کے نام سے طبع ہو چکا ہے۔

دیباچۂ گلزارِ نسیم، اودھ پنچ، داغؔ، اُردو شاعری، ذات کی تفریق، تاریخِ بھارت در پن اور رتن ناتھ سرشار کا شمار اُن کے نہایت اہم مضامین ومقالات میں کیا جاتا ہے۔ چکبستؔ نے ''کملا'' نامی ایک ڈرامہ بھی تخلیق کیا جسے ادب میں کوئی خاص مقام نہیں دیا جا سکتا۔ دراصل چکبستؔ ایک قومی شاعر تھے۔ اُنہیں ''پیام بَرِ دورِ جدید'' کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ وہ اگرچہ ہمیشہ عملی سیاست سے دور رہے مگر اُن کا بیش تر کلام اپنے دَور کے سیاسی خیالات، نظریات وحالات کا عکّاس اور قومی اتّحاد و یک جہتی اور حُبّ الوطنی کے جذبات کا آئینہ دار ہے۔

06.09 فرہنگ

آزار : بیماری، مرض

آشکار ہونا : واضح ہونا، نمایاں ہونا، ظاہر ہونا

آوازۂ قوم : غلغلۂ قوم، شہرۂ قوم، قوم کی پکار

ابر اُٹھنا : بادل آنا، آسمان پر بادلوں کا چھانا

ابرِ دریابار : بہت برسنے والا بادل

اسیرِ دام : جال میں پھنسا ہوا، قید

اُفق : وہ جگہ جہاں زمین وآسمان ایک دوسرے سے ملتے ہوئے نظر آتے ہیں

بے خودی چھانا : سرشار ہونا، مست ہونا

بیڑا پار ہونا : ناؤ یا کشتی کا سلامتی کے ساتھ کنارے پر پہنچنا، منزلِ مقصود پر پہنچنا، مشکل آسان ہونا

طاقتِ کلام : قوّتِ گویائی، بات کرنے کی قوّت

عالم گیر : پوری دنیا میں پھیلی ہوئی

قوسِ قزح : دھنک، کمان سے مشابہ سات رنگ کی وہ شکل جو برسات کے موسم میں کبھی کبھی آسمان پر دکھائی دیتی ہے

گام : قدم، ایک قدم کا فاصلہ، وہ فاصلہ جو چلنے کی حالت میں ایک قدم سے دوسرے قدم تک ہو

لَو لگانا : تصور باندھنا، رجوع کرنا، دھیان لگانا

لَے : آہنگ، سُر، دُھن

محفلِ کہن : قدیم انجمن، بزمِ قدیم

بےنقاب	: علانیہ، کھُلّم کھُلّا، بے پردہ	مشتاق	: آرزومندی، خواہش، طلب
پاؤں ڈِگنا	: قدم لڑکھڑانا، ثابت قدم نہ رہنا	ناچاقی	: نااتّفاقی، دشمنی، عداوت، بگاڑ
پیرِ مغاں	: شراب فروش، پیشوا، مخدوم	نعرۂ دلکش	: دل پسند آواز، فرحت بخش بلند آواز
تقصیر	: خطا، قصور، کوتاہی	نغمۂ ناقوس	: سَنکھ کی آواز (پوجا اور نیک کام کے وقت ہندو ناقوس یعنی سنکھ کو مُنہ سے پھونک کر بجاتے ہیں اور اس کی آواز کو نیک و مبارک خیال کرتے ہیں)
جبیں سائی کرنا	: سر جھکانا، سجدہ کرنا		
چشمِ شوق	: خواہش بھری آنکھ		
حظ اُٹھانا	: لذّت پانا، لطف اندوز ہونا		
خوش الحان	: خوش آواز، خوش گلو، اچھی آواز والا، سُریلا	محضر	: وہ کاغذ جس پر حاکم یا منصف کے دستخط اور مہر ہوں
دابِ سلطنت	: آدابِ حکومت، طریقِ سلطنت		
دل لُبھانا	: دل کو مائل کرنا، دل کو فریفتہ کرنا	ہمالیہ	: ہندوستان کے مشہور شمالی پہاڑوں کا سلسلہ جو دنیا کے تمام پہاڑوں سے اونچا ہے
راگ	: نغمہ، لَے، سُر		
رخنہ اندازی	: مزاحمت، خلل، روک، روڑا اٹکانے کا عمل	ہوم رول	: حکومتِ خود اختیاری، اپنے قوانین، اپنا نظام، اندرونی انتظامات، سوراج
سریرِ شاہ	: مسند نشیں، تختِ سلطنت پر بیٹھنے والا		

06.10 سوالات

مختصر سوالات

سوال نمبر۱ : نظم ''آوازۂ قوم'' کا خلاصہ تحریر کیجیے۔

سوال نمبر۲ : چکبستؔ کی نظم کے کسی بند کا خلاصہ تحریر کیجیے۔

سوال نمبر۳ : لڑکیوں کی تعلیم سے متعلّق چکبستؔ کے نظریے کی وضاحت کیجیے۔

سوال نمبر۴ : ہوم رول کے موضوع سے متعلّق چکبست کی کسی ایک نظم کا مختصر تعارف پیش کیجیے۔

تفصیلی سوالات

سوال نمبر۱ : نظم ''آوازۂ قوم'' کا تنقیدی تجزیہ پیش کیجیے۔

سوال نمبر۲ : آزادی سے متعلّق چکبستؔ کا نظریہ کیا تھا؟ بیان کیجیے۔

سوال نمبر۳ : چکبستؔ کی نظم نگاری کی بنیادی خصوصیات کا جائزہ لیجیے۔

سوال نمبر۴ : اُردو نظم گو شعرا میں چکبستؔ کے مقام و مرتبے کا تعیّن کیجیے۔

سوال نمبر۵ : چکبستؔ کی حیات و شخصیت کے اہم گوشوں پر روشنی ڈالیے۔

معروضی سوالات

سوال نمبر۱ : چکبستؔ کی پیدائش کہاں ہوئی تھی؟

(الف) کان پور (ب) جہان آباد (ج) فیض آباد (د) رام پور

سوال نمبر۲ : چکبستؔ کی وفات کس شہر میں ہوئی تھی؟

(الف) لکھنؤ (ب) فیض آباد (ج) کان پور (د) بارہ بنکی

سوال نمبر۳ : ''ہوم رول'' سے متعلّق چکبستؔ کی نظم کا عنوان ہے۔

(الف) گائے (ب) آوازۂ قوم (ج) دردِ دل (د) فریادِ قوم

سوال نمبر۴ : چکبستؔ نے اپنے کلام کو کیا کہا ہے؟

(الف) صورِ حُبِّ قومی (ب) بانگِ درا (ج) صدائے بازگشت (د) صورِ اسرافیل

سوال نمبر۵ : ''صبحِ وطن'' کیا ہے؟

(الف) مضامین کا مجموعہ (ب) شعری مجموعہ (ج) ڈرامہ (د) اداریوں کا مجموعہ

سوال نمبر۶ : درج ذیل میں سے کس صنفِ سخن میں چکبستؔ نے طبع آزمائی نہیں کی ہے؟

(الف) داستان (ب) نظم (ج) غزل (د) مرثیہ

سوال نمبر۷ : چکبستؔ کا تعلّق کس پیشے سے تھا؟

(الف) درس وتدریس (ب) سرکاری ملازمت (ج) طبابت (د) وکالت

سوال نمبر۸ : ''صبحِ اُمّید'' کیا ہے؟

(الف) رسالہ (ب) خطوط کا مجموعہ (ج) ناول (د) خودنوشت

سوال نمبر۹ : مضامینِ چکبستؔ کیا ہے؟

(الف) مضامین کا مجموعہ (ب) ڈرامہ (ج) مراثی کا مجموعہ (د) رباعیات کا مجموعہ

سوال نمبر۱۰ : چکبستؔ کی کس سنہ میں وفات ہوئی تھی؟

(الف) ۱۹۲۴ء (ب) ۱۹۲۵ء (ج) ۱۹۲۶ء (د) ۱۹۲۷ء

معروضی سوالات کے جوابات

جواب نمبر۱ : (ج) فیض آباد

جواب نمبر۲ : (د) بارہ بنکی

جواب نمبر۳ : (ب) آوازۂ قوم

جواب نمبر۴ : (الف) صورِ حُبِّ قومی

جواب نمبر۵ : (ب) شعری مجموعہ

جواب نمبر۶ : (الف) داستان

جواب نمبر۷ : (د) وکالت

جواب نمبر۸ : (الف) رسالہ

جواب نمبر۹ : (الف) مضامین کا مجموعہ

جواب نمبر۱۰ : (ج) ۱۹۲۶ء

06.11 حوالہ جاتی کتب

۱۔ چکبستؔ (حیات اور ادبی خدمات) از ڈاکٹر افضال احمد

۲۔ یادگارِ چکبستؔ از آنند نرائن ملاّ

۳۔ مضامینِ چکبستؔ از برج نرائن چکبستؔ

۴۔ رسالہ صبحِ اُمّید (مختلف ایڈیشن) از برج نرائن چکبستؔ

۵۔ تنقیدی اشارے از آل احمد سرور

اکائی 07 : علامہ اقبالؔ ''ساقی نامہ، جبریل وابلیس''

ساخت :

07.01 : اغراض ومقاصد

07.02 : تمہید

07.03 : علامہ اقبالؔ کی حیات وکارنامے

07.04 : علامہ اقبالؔ کی وطنی وقومی شاعری

07.05 : علامہ اقبالؔ کی نظم نگاری

07.06 : علامہ اقبال کی نظم نگاری کا فنّی جائزہ

07.07 : نظم ''ساقی نامہ'' متن

07.08 : نظم ''ساقی نامہ'' تجزیہ

07.09 : نظم ''جبریل وابلیس'' متن

07.10 : نظم ''جبریل وابلیس'' تجزیہ

07.11 : خلاصہ

07.12 : فرہنگ

07.13 : سوالات

07.14 : حوالہ جاتی کتب

07.01 اغراض ومقاصد

آپ اس اکائی کے مطالعے سے علامہ اقبالؔ کی حیات، تعلیم وتربیت، شخصیت، ملازمت، کارنامے اوران کی تصنیفات کے بارے میں جان سکیں گے اور اس کے ساتھ ہی ان کی قومی ووطنی شاعری، شخصی شاعری، نظم نگاری، ادبی خدمات وادبی مقام اور نظم ''ساقی نامہ، جبریل وابلیس'' کا مطالعہ کریں گے۔ علامہ اقبالؔ کی شاعری کے پس منظر کا بھی علم، قوم کی اصلاح اور ذہنی بیداری میں انہوں نے یا ان کے کلام نے کیا کردار ادا کیا ہے اور خصوصاً اردو نظم گوئی میں ان کی اہم اور نمایاں شاعرانہ خدمات، حیثیت، مقام ومرتبے اور فنّی خصوصیات سے متعلق مزید معلومات حاصل کرسکیں گے۔ ان نظموں کے موضوعات، فنّی خصوصیات اور زبان وبیان کی خوبیوں سے واقفیت حاصل کرسکیں گے۔

07.02 تمہید

نظم کی اصطلاح پہلے شاعری کے لئے استعمال ہوتی تھی اور اس کے مقابلے نثر کو رکھا جاتا تھا پھر یہ غزل کے علاوہ شاعری کی دوسری اقسام کے لئے استعمال ہونے لگی مگر جدید تناظر میں نظم وہ صنفِ سخن ہے جو نہ قصیدہ ہے نہ مثنوی، نہ مرثیہ نہ شہر آشوب، نہ واسوخت نہ رباعی۔ ایک صنفِ سخن کی حیثیت سے یہ نظیر اکبر آبادی کے یہاں نمایاں ہے اور آزاد و حالی کے زمانے سے اس کی روایت کا استحکام ملتا ہے۔

نظم کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں غزل کے مقابلے ایک موضوع اور ایک مسلسل بیان ہوتا ہے۔ مسلسل بیان کی وجہ سے اشعار میں ربط و تسلسل آجاتا ہے۔ خلاصۂ کلام یہ ہے کہ ہمارے یہاں نظم میں خاصی آزادی اور خاصا تنوّع ہے اور اس کو ملحوظ رکھے بغیر ہم اس صنف کے سرمائے سے انصاف نہیں کر سکتے۔

07.03 علامہ اقبال کی حیات و کارنامے

﴿۱﴾ **حیات:** علامہ اقبال کے اجداد کشمیری برہمن تھے۔ ان کے خاندان کا تعلق کشمیر سے تھا جو سترہویں صدی عیسوی میں مشرف بہ اسلام ہوا اور یہ اپنی نیک نامی اور شرافت کی وجہ سے معزز لوگوں میں شمار ہوتا تھا۔ ڈاکٹر اقبال کے جدِ اعلیٰ بابا صالح تھے جنھوں نے اسلام قبول کیا تھا۔ ان کی اولاد نے ۱۸۵۷ء کے ہنگاموں کے بعد سیال کوٹ میں قیام کیا۔ پہلے پہل علامہ اقبال کے دادا نے یہاں سکونت اختیار کی ان کا نام شیخ رفیق تھا۔ ان کے دو صاحب زادے تھے ایک شیخ نور محمد، دوسرے شیخ غلام قادر، شیخ نور محمد کی شادی امام بی سے ہوئی تھی۔ شیخ نور محمد کے یہاں دو لڑکے ہوئے ایک کا شیخ عطا محمد اور دوسرے کا شیخ محمد اقبال نام تھا۔ ان کے علاوہ تین لڑکیاں تھیں۔ اقبال ۹ نومبر ۱۸۷۷ء بروز جمعہ، سیال کوٹ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم مکتبہ عمر شاہ، محلّہ شوالہ سیال کوٹ کی مسجد میں ابو عبداللہ مولانا غلام حسن کے مکتب میں حاصل کی۔ بعد میں مولانا میر حسن کی خواہش پر ان کے مکتب واقع کوچہ میر حسام الدین میں اردو، عربی کی تعلیم حاصل کی اور قرآن مجید کا درس لیا۔ اقبال کی شعری شخصیت کی تشکیل میں سید میر حسن کا فیضان شامل ہے۔ ۱۸۸۳ء میں اسکاچ مشن اسکول میں داخلہ لے لیا۔ ۱۸۸۸ء میں پرائمری کا امتحان اور ۱۸۹۱ء میں مڈل کا امتحان پاس کیا، شعر بھی کہنے لگے۔ ۱۸۹۳ء میں میٹرک درجہ اول میں پاس کیا اسی تاریخ کو یعنی تین مئی کو ان کی شادی گجرات (پنجاب) کے سول سرجن خان بہادر عطا محمد کی بیٹی کریم بی بی سے ہوئی۔ اقبال نے اسکاچ مشن کالج میں داخلہ لے لیا اور استاد داغ سے شرفِ تلمّذ حاصل کیا۔ اس طرح تعلیمی سلسلہ بھی جاری رہا اور شاعری بھی۔ ادبی رسائل میں آپ کا کلام شائع ہونے لگا۔

۱۸۹۵ء میں انٹرمیڈیٹ کا امتحان درجہ دوم میں پاس کیا۔ مزید تعلیم کے لئے گورنمنٹ کالج لاہور میں بی.اے میں داخلہ لیا۔ ۱۸۹۷ء میں بی.اے سیکنڈ ڈویژن سے پاس کیا۔ عربی اور انگریزی میں اوّل آنے کی وجہ سے دو طلائی تمغے دیے گئے۔ اس زمانے میں پروفیسر ٹامس آرنلڈ علی گڑھ کالج سے قطعِ تعلق کر کے گورنمنٹ کالج لاہور میں فلسفہ کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ اقبال کو پروفیسر آرنلڈ کی شاگردی کا موقع ملا۔ اقبال نے ایم.اے 'فلسفہ' میں داخلہ لیا اور ۱۸۹۹ء میں ایم.اے تیسرے درجے میں پاس کیا۔ اورینٹل کالج کے میکوڈ عربک ریڈر مقرر ہوئے۔ اس زمانے میں ریسرچ اسکالر کو ریڈر کہا جاتا تھا۔ چھ ماہ بعد انگریزی کے اسسٹنٹ پروفیسر کی حیثیت سے گورنمنٹ کالج میں کام کیا۔ ۱۹۰۴ء میں اسسٹنٹ پروفیسر کی ملازمت ختم ہوگئی لیکن اس مدت میں مزید توسیع کی گئی اور فلسفہ پڑھانے پر مامور ہوئے۔ یورپ جانے تک اسی

منصب پر فائز رہے۔ ۱۹۰۵ء میں اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لئے یورپ روانہ ہوئے۔ ٹرنٹی کالج کیمبرج میں داخلہ لیا۔ ۱۹۰۷ء میں میونخ یونی ورسٹی جرمنی میں پی ایچ.ڈی کی ڈگری کے لئے انگریزی میں مقالہ ''Development of Meta Physics in Parsia'' (ایران میں مابعدالطبعیات کا ارتقا) کے موضوع پر داخل کیا جس پر انہیں پی ایچ.ڈی کی ڈگری دی گئی۔

۱۹۰۸ء میں لنکران سے بیرسٹری کی ڈگری حاصل کی۔ اسی سال ان کا مقالہ انگریزی میں شائع ہوا۔ ۱۹۱۰ء میں ان کا نکاح سردار بیگم سے ہوا۔ ۱۹۱۳ء میں مختار بیگم سے ان کا نکاح ہوا۔ ۱۹۲۳ء میں انہیں ''سر'' کے خطاب سے نوازا گیا۔ ۱۹۳۱ء میں انہوں نے گول میز کانفرنس میں شرکت کی۔ لندن سے اٹلی، روم، وینس، مصر، اسکندریہ، قاہرہ اور فلسطین ہوتے ہوئے واپس ممبئی آئے۔ انہوں نے قصرِ وینس میں مسولینی سے ملاقات کی۔ ۱۹۲۳ء میں تیسری گول میز کانفرنس میں شرکت کے لئے لندن گئے۔ لندن سے پیرس، اسپین، میڈرڈ گئے اور وینس کے راستے ہندوستان واپس ہوئے۔ ۱۹۳۳ء میں افغانستان گئے۔ اقبالؔ کو صغرسنی سے ہی شعر گوئی کا شوق تھا۔ انہوں نے داغؔ سے اصلاح لی تھی لیکن ان کی شاعری کا رنگ داغؔ سے یکسر مختلف تھا۔ انہوں نے اردو شاعری کو ایک خاص فلسفہ دیا اور فلسفیانہ گہرائیوں سے روشناس کروایا۔

اردو میں ان کی شاعری کے چار مجموعے ہیں۔ اول بانگِ درا، دوم بالِ جبریل، سوم ضربِ کلیم، چہارم ارمغانِ حجاز۔ یہ تمام مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ فارسی میں ان کے کئی شعری مجموعے شائع ہوئے ہیں۔ ''اسرارِ خودی، رموزِ بے خودی، پیامِ مشرق، زبورِ عجم اور جاوید نامہ'' قابلِ ذکر ہیں۔ اقبال کا انتقال ۲۱/اپریل ۱۹۳۸ء کو لاہور میں ہوا۔ مزارِ اقبالؔ حضوری باغ کے قریب، شاہی مسجد کے جنوب مشرقی مینار کے سایہ میں واقع ہے۔ اقبالؔ کی پہلی بیوی کریم بی بی سے آفتاب اقبال اور معراج بیگم پیدا ہوئے۔ سردار بیگم سے جاوید اقبال اور منیرہ بانو پیدا ہوئے۔

﴿۲﴾ **کارنامے: اقبال** جن دنوں بی۔اے میں پڑھتے تھے انہوں نے انجمن کشمیری مسلمان کے مشاعرے میں نظم ''فلاحِ قوم'' سنائی۔ عبدالکریم الجیلی کی کتاب ''نظریۂ توحیدِ مطلق'' پر انگریزی میں ایک مضمون ''انڈین انٹی کیوری'' کے انتیسویں شمارے (ستمبر ۱۹۰۰ء) میں شائع ہوا۔ ۱۹۰۱ء میں وہ انجمن کشمیری مسلمان کے سکریٹری بنائے گئے۔ ۲۳/فروری کو انجمن حمایتِ اسلام کے سترہویں جلسے میں صدر جلسہ میاں نظام الدین نے انہیں ''ملک الشعرا'' کا خطاب دیا۔ اکتوبر ۱۹۰۴ء میں پہلی اردو تصنیف ''علم الاقتصاد'' لاہور سے شائع ہوئی۔ معاشیات کے موضوع پر یہ کتاب لکھی گئی تھی۔ ۱۹۱۰ء میں انجمن حمایتِ اسلام کی جنرل کونسل کے رکن منتخب ہوئے۔ ۱۹۱۱ء میں آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس منعقدہ دہلی کے تیسرے اجلاس کی صدارت کی۔ ۱۹۱۸ء میں اورینٹل فیکلٹی کے ڈین مقرر ہوئے۔

۱۹۲۰ء میں مثنوی اسرارِ خودی کا انگریزی ترجمہ پروفیسر آر۔اے۔ نکلسن نے کیا۔ جنوری ۱۹۲۳ء میں سر کا خطاب ملا۔ پنجاب یونی ورسٹی کے اکیڈمک کونسل کے رکن مقرر ہوئے۔ جون ۱۹۲۷ء میں پنجاب لجسلیٹو کونسل کے رکن منتخب ہوئے اور ۱۹۳۰ء تک اس سے وابستہ رہے۔ ۱۹۲۹ء میں ۵/جنوری سے ۸/جنوری تک ''خطباتِ مدراس'' دیے۔ ۱۹/جنوری کو میر عثمان علی خاں سے ملاقات کی۔ مئی ۱۹۳۰ء میں ''خطباتِ مدراس'' (انگریزی) میں شائع ہوئے۔ نومبر ۱۹۳۱ء میں لندن گول میز کانفرنس میں شرکت کی۔ فلسطین میں اسلامی کانفرنس میں شرکت کی۔ وہاں عہدے داروں کا انتخاب ہوا۔ چار نائب صدور میں سے ایک اقبالؔ منتخب ہوئے، بیت المقدّس بھی گئے۔ ۱۹۳۲ء میں تیسری گول میز کانفرنس میں شرکت کی۔ دارالعلوم کیمٹی روم میں ایک تاریخی اجلاس منعقد ہوا جس میں اقبالؔ نے تقریر کی۔ واپسی پر لاہور میں شان دار استقبال کیا گیا۔

۱۹۳۴ء میں انجمن حمایتِ اسلام کے صدر منتخب ہوئے۔ ۱۹۳۶ء میں محمد علی جناح سے ملاقات کی۔ پنجاب مسلم لیگ کے صدر منتخب ہوئے۔ انجمنِ اسلام کے سالانہ جلسے میں نظم ''نغمۂ سرمدی'' پڑھی یہ آخری شرکت تھی۔ ڈاکٹر اقبال کو ۱۹۲۳ء میں علی مسلم یونی ورسٹی کی طرف سے ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری ملی، ۱۹۳۳ء میں پنجاب یونی ورسٹی نے، ۱۹۳۶ء میں ڈھاکہ یونی ورسٹی نے، ۱۹۳۷ء میں الٰہ آباد یونی ورسٹی نے اور ۱۹۳۸ء میں عثمانیہ یونی ورسٹی نے ڈی۔لٹ کی اعزازی ڈگری عطا کی۔

07.04 علامہ اقبال کی وطنی وقومی شاعری

علامہ اقبال نے وطنی اور قومی شاعری کے تعلق سے کافی کچھ لکھا ہے۔ علامہ اقبال کی شاعری کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک سفرِ انگلستان سے پہلے یعنی ۱۹۰۵ء تک اور دوسرا سفرِ انگلستان سے واپسی کے بعد سے آخر عمر تک۔ مولانا عبدالسلام ندوی نے ان کی شاعری کو چار ادوار میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا دَور ۱۹۰۰ء پر ہی ختم ہو جاتا ہے۔ دوسرا دَور ۱۹۰۰ء سے ۱۹۰۵ء تک یعنی ''ہمالہ'' سے ''نیا شوالہ'' پر ختم ہو جاتا ہے۔ اسی دَور میں ہندوستانی بچوں کا گیت، ترانۂ ہندی، ایک پہاڑ اور ایک گلہری اور گائے وغیرہ نظمیں کہی گئیں، جنہیں پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہندوستانی تہذیب وثقافت سے بہت متاثر ہیں۔ اس زمانے میں نیچرل شاعری اور منظر کشی پر زور تھا۔ نظم ہمالہ کی منظر نگاری ملاحظہ کیجیے:

لیلیِ شب کھولتی ہے آ کے جب زلفِ رسا دامنِ دل کھینچتی ہے آب شاروں کی صدا
وہ خموشی شام کی جس پر تکلّم ہو فدا وہ درختوں پر تفکّر کا سماں چھایا ہوا
کانپتا پھرتا ہے کیا رنگِ شفق کہسار پر خوش نما لگتا ہے یہ غازہ ترے رخسار پر

الفاظ وتراکیب کے دروبست پر قدرت کے سبب منظر کشی میں اقبال دوسرے شعرا سے آگے ہیں۔ علامہ اقبال کی حب الوطنی کے لئے ان کا یہ دل چھونے لینے والا شعر ہی کافی ہے:

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا ہم بلبلیں ہیں اِس کی یہ گلستاں ہمارا

اس شعر سے ہی ان کی حب الوطنی کے جذبات سمجھ میں آ جاتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ ہندوستان کا کوئی قومی ترانہ نہیں تھا۔ اقبال نے خوب صورت ترانۂ ہندی پیش کیا۔ یہاں کے باغوں اور ندیوں کی تعریف کی پھر اس کی نشان دہی بھی کی کہ یونان، مصر اور روم کی تہذیبی شناخت مٹ جانے کے بعد بھی ہماری شناخت اور نام ونشان باقی ہے۔ اس ترانے میں جذبے کی سچائی اور سرشاری موجود ہے۔ افسوس کا مقام ہے کہ ''قومی ترانے'' کے طور پر اقبال کے ''ترانۂ ہندی'' کی جگہ بنکم چند چٹرجی کے ''وندے ماترم'' کو ترجیحی طور پر عزت بخشی گئی۔ اقبال اس وقت تک دَیر وحرم کے قائل بھی نہیں تھے۔ جب سورج کی کرن یا ضیاے الٰہی مسجد ومندر کا امتیاز نہیں کرتیں تو ہمیں یہ حق کہاں پہنچتا ہے۔ مثلاً:

کعبے میں، بت کدے میں ہے یکساں تری ضیا میں امتیازِ دیر و حرم میں پھنسا ہوا

اقبال وطن کے بھی خواہاں ہیں ؎

دیا رونا مجھے ایسا کہ سب کچھ دے دیا گویا لکھا کلکِ ازل نے مجھ کو تیرے نوحہ خوانوں میں

حالاں کہ اس کے علاوہ ان کی بہت سی نظمیں بھی ہیں جو ان کی وطنی شاعری پر دلالت کرتی ہیں جیسے شری رام، شری کرشن، گوتم بدھ اور گرو نانک وغیرہ پر لکھی ہوئی نظمیں غیر معمولی عقیدت اہمیت کی حامل ہیں۔ ہمالیہ، گنگا اور گیتا کا ذکر بھی انہوں نے جس محبت اور عقیدت سے کیا ہے اور پھر جن الفاظ میں وشوامترا اور بھرتری ہری کو یاد کیا ہے وہ سب کے سب اس حقیقت کا جیتا جاگتا ثبوت ہے کہ علامہ مرحوم ہندوؤں کے مذہبی اور ثقافتی ورثے کی بڑی قدر کرتے تھے اور اس پر انہوں نے ''نیا شوالہ'' جیسی متعدد نظمیں لکھی ہیں جن کا مقصد ہندو مسلم اتحاد کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ اقبالؔ ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کے قائل تھے اور وہ مذہب کی بنیاد پر ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی کی تفریق کو مٹا دینا چاہتے تھے۔ اسی کی عکاسی کرتے ہوئے ''نیا شوالہ'' سے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

اپنوں سے بَیر رکھنا تو نے بتوں سے سیکھا جنگ و جدل سکھایا واعظ کو بھی خدا نے
تنگ آ کے میں نے آخر دیر و حرم کو چھوڑا واعظ کا وعظ چھوڑا ، چھوڑے ترے فسانے
پتھر کی مورتوں میں سمجھا ہے تو خدا ہے خاکِ وطن کا مجھ کو ہر ذرہ دیوتا ہے
آ غیریت کے پردے اک بار پھر اُٹھا دیں بچھڑوں کو پھر ملا دیں نقشِ دوئی مٹا دیں
سونی پڑی ہوئی ہے مدت سے دل کی بستی آ اک نیا شوالہ اس دیش میں بنا دیں
دنیا کے تیرتھوں سے اونچا ہو اپنا تیرتھ دامانِ آسماں سے اس کا کلس ملا دیں
ہر صبح اُٹھ کے گائیں منتر وہ میٹھے میٹھے سارے پجاریوں کو مَے پیت کی پلا دیں
شکتی بھی شانتی بھی بھکتوں کے گیت میں ہے دھرتی کے باسیوں کی مُکتی پریت میں ہے

یہاں ایک طرح سے دیکھا جائے تو ہندو مسلمان دونوں فرقوں کے مذہبی ٹھیکے داروں کو ہدفِ تنقید بنایا گیا ہے مگر یہاں اقبالؔ جذباتیت سے مغلوب ہو گئے ہیں۔ البتہ جس محبت اور پریت کی بات کہی گئی ہے وہ تمام فرقے والوں کو تہذیب و تمدّن کے اعتبار سے ایک جگہ لا کھڑا کرنے کا پیغام دیتی ہے۔ اسی طرح علامہ اقبالؔ نے ملک کی تعریف تاریخی پس منظر میں پیش کی ہے۔

نظم ''ہندوستانی بچوں کا قومی گیت'' کا ایک بند دیکھیے:

چشتی نے جس زمیں میں پیغامِ حق سنایا نانک نے جس چمن میں وحدت کا گیت گایا
تاتاریوں نے جس کو اپنا وطن بنایا جس نے حجازیوں سے دشتِ عرب چھڑایا
میرا وطن وہی ہے میرا وطن وہی ہے

اور اگر تاریخی و تہذیبی پس منظر تلمیحات کی روشنی میں دیکھنا چاہیں تو اسی نظم کا دوسرا بند ملاحظہ کریں:

یونانیوں کو جس نے حیران کر دیا تھا سارے جہاں کو جس نے علم و ہنر دیا تھا
مٹّی کو جس کی حق نے زَر کا اثر دیا تھا ترکوں کا جس نے دامن ہیروں سے بھر دیا تھا
میرا وطن وہی ہے میرا وطن وہی ہے

ڈاکٹر رفیق زکریا نے اپنی انگریزی کتاب ''اقبالؔ شاعر اور سیاست داں'' (مطبوعہ پنگوئن) میں تفصیل کے ساتھ لکھا ہے کہ کس طرح انہوں نے اپنے انتقال سے محض چند ماہ قبل آل انڈیا ریڈیو پر تقریر وسیع تر انسانیت میں اپنے راسخ عقیدے کو دہرایا تھا۔ اقبالؔ نے کہا تھا کہ:

''میرے نزدیک محض ایک اتحاد قابلِ اعتماد ہے اور وہ انسانی اتحاد یعنی آپسی بھائی چارگی۔ یہ انسانی وحدت نسل، عقلیت، رنگ اور زبان سے بالاتر ہے۔''

انہوں نے اپنی ایک فارسی نظم میں اس نکتے کو پیش کیا ہے۔ ملاحظہ ہو:

حرفِ بد را بر لب آوردن خطا است کافر و مومن ہمہ خلقِ خدا است
آدمیت ، احترامِ آدمی با خبر شو از مقامِ آدمی
بندۂ عشق از خدا گیر و طریق می شود بر کافر و مومن شفیق

جب علامہ اقبالؔ کا انتقال ہوا تو مہاتما گاندھی، سروجنی نائیڈو اور ٹیگور سے لے کر سبھاش چندر بوس نے انہیں جن الفاظ میں گلہائے عقیدت پیش کیے وہ محض ایک عظیم شاعر کے لئے نہیں تھے بلکہ ایک عظیم محبِ وطن اور قوم پرست کے لئے بھی تھے۔ بلاشبہہ یہ ایک افسوس ناک حقیقت ہے کہ موجودہ دَور کی تنگ نظر سیاست اقبالؔ کی بے مثال اور بیش بہا انسانی اقدار و خدمات کو نظر انداز کر کے نوجوان نسل کے سامنے ان کی شخصیت اور شاعری کو مسخ کر کے پیش کر رہی ہے۔

07.05 علامہ اقبالؔ کی نظم نگاری

اقبالؔ کو جو نظم کی روایت ملی تھی اس کے سرمائے میں نظیرؔ کی نظموں کی، حالیؔ و آزادؔ، اسمٰعیل میرٹھی اور اکبرؔ کے فن کی روایت تھی۔ پھر یہ پیامی، مقصدی، اصلاحی اور اخلاقی شاعری کا دَور تھا اور براہِ راست بات کہنی ضروری سمجھی جاتی تھی۔ اقبالؔ نے اگرچہ شاعری کی شروعات رواج کے مطابق غزل ہی سے کی مگر بہت جلد نظموں کی طرف متوجہ ہوئے۔ کیوں کہ پیامی نقطۂ نظر سے یہ صنف اظہارِ خیال کے لئے بہت زیادہ کارآمد تھی۔ انہوں نے فارسی کی طرح اردو میں طویل نظمیں نہیں لکھیں مگر اردو میں ان کی مختصر اور نسبتاً طویل نظموں کی تعداد کیفیت اور کمیت دونوں کے لحاظ سے اتنی ہے کہ وہ اب تک نظم کے سب سے بڑے شاعر کہے جاتے ہیں۔ انہوں نے اردو نظم کو جو وسعت، گہرائی، بُعد اور فکری رفعت عطا کی ہے اس سے انکار کفر ہوگا۔ انہوں نے اگرچہ غزل کو بھی صحیفۂ کائنات بنایا مگر دراصل وہ نظم کے شاعر ہیں اور ان کے یہاں غزلوں کے مقابلے میں نظموں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ اگر مطبوعہ اردو کلیات کا جائزہ لیا جائے تو ''بانگِ درا'' میں پہلے دَور میں ۴۹/ نظمیں اور ۱۳/ غزلیں ہیں۔ دوسرے حصے میں ۲۴/ نظمیں اور ۷/ غزلیں اور تیسرے حصے میں ۱۷/ نظمیں اور ۸/ غزلیں ہیں۔ گویا ''بانگِ درا'' کی نظموں کی تعداد (۱۴۴) اور غزلوں کی تعداد (۲۸) ہے یعنی پانچ گنی سے کچھ زیادہ۔

''بالِ جبریل'' میں (۷۶) غزلیں دو حصوں میں اور (۶۲) چھوٹی بڑی نظمیں ہیں۔ ''ضربِ کلیم'' بیش تر چھوٹی نظموں پر مشتمل ہے اور یہاں غزلوں کی تعداد بھی بہت کم ہے۔ صرف (۵) غزلیں اور (۱۳۹) نظمیں ہیں۔ محرابِ گل افغاں کے افکار میں غزلوں کی تعداد اس کے علاوہ ہے مگر اس میں ایک گیت کا تجربہ بھی ملتا ہے۔ اس میں غزلیں زیادہ ہیں مگر قطعات بھی ملتے ہیں۔ ''ارمغانِ حجاز'' میں اردو حصہ مختصر ہے۔

اس میں (۹)نظمیں ہیں اور ملازادہ ضیغم لولابی کی بیاض کے عنوان سے (۱۸)غزلیں اور ایک ترجیعی مستزاد۔غرض اردو کلیات میں کُل (۳۵۴) چھوٹی بڑی نظمیں اور (۱۲۷)غزلیں ہیں۔یعنی تین گنی سے کچھ کم۔شروع میں اقبالؔ نے مسدّس کو بہت زیادہ برتا۔''بانگِ درا'' کی پہلی پانچ نظموں کے علاوہ آفتابِ صبح،موجِ دریا،نالۂ فراق،وطنیت،شکوہ اور جوابِ شکوہ مسدّس کی ہیئت میں ہیں۔

اقبالؔ یوں تو غزل،مثنوی،مسدس،قطعہ،سب ہیئتوں کو برتتے ہیں لیکن شروع سے ان کی مرغوب ہیئت ترکیب بند رہی ہیں۔صاحبِ بحرالفصاحت تو مسدّس کو بھی ترکیب بند کا ایک روپ مانتے ہیں۔غزل کی ہیئت ان کے ترانۂ ہندی میں ملتی ہے جس میں مطلع کے علاوہ مقطع بھی موجود ہے جس میں تخلص لایا گیا ہے۔ترکیب بند میں اقبالؔ نے ہر بند میں مساوی تعداد کی پابندی نہیں کی ہے۔ان کی سب سے دل چسپ نظم''فاطمہ بنتِ عبداللہ'' ہے جو جنگِ طرابلس کی یادگار ہے۔اس کے پہلے بند میں تین اور دوسرے تیسرے میں چار چار اشعار ہیں۔''شمع وشاعر''میں جو ترکیب بند ہے ہر ایک بند قطعہ کی ہیئت میں ہے۔

''والدہ مرحومہ کی یاد میں''مثنوی کی ہیئت میں ہے یعنی قید کے اندر خاصی آزادی برتی گئی ہے اور یہ آزادی اقبالؔ کے فنّی شعور کا مزید ثبوت ہے۔نظم کی اصل خصوصیت تسلسلِ بیان کو اقبالؔ نے ایک عظیم مقصد کے لئے استعمال کیا،انہوں نے اپنی سوئی قوم کو اپنی نظموں سے بیدار کیا،اس کے تنِ مردہ میں جان ڈال دی اور اس میں جہد وعمل کا جذبہ پیدا کر دیا۔اقبالؔ نے یہ کام غزل سے بھی لیا لیکن وہاں اشارے کنایے سے بڑھنے کی گنجائش نہیں تھی اور ان کا پیغام ربط وتسلسل کا تقاضا کرتا تھا اور اس کے لئے نظم بہترین پیرایۂ اظہار تھی۔اقبالؔ نے نظم کے امکانات سے بھرپور فائدہ اُٹھایا اور اپنے فکر وفن سے اردو نظم کو وقار عطا کیا۔

اگر چہ اقبالؔ کی زیادہ تر نظمیں مختصر ہیں مگر نسبتاً طویل نظموں کی تعداد خاصی ہے۔ان کی طویل نظمیں بانگِ درا میں''تصویرِ درد،شکوہ، جوابِ شکوہ،شمع وشاعر،والدہ مرحومہ کی یاد میں،خضرِ راہ،طلوعِ اسلام''،بالِ جبریل میں''مسجدِ قرطبہ،ساقی نامہ،ذوق وشوق،مکالمۂ پیرِ رومی و مریدِ ہندی''اور ارمغانِ حجاز میں''ابلیس کی مجلسِ شوریٰ'' جیسی طویل نظموں کی قابلِ لحاظ تعداد ہے اور ایک دل چسپ نکتہ یہ ہے کہ جس طرح فارسی میں تسخیرِ فطرت کے زمرے میں پانچ نظمیں آتی ہیں جن میں ہر نظم اپنی جگہ مکمل ہے مگر موضوع کو آگے بڑھاتی ہے۔اسی طرح بالِ جبریل میں''لینن،فرشتوں کا گیت اور فرمانِ خدا فرشتوں کے نام'' اگر چہ الگ الگ نظمیں ہیں مگر ان میں ایک ربط مل جائے گا۔''دعا اور مسجدِ قرطبہ، قید خانے میں معتمد کی فریاد،عبدالرحمٰن اول کا بویا ہوا کھجور کا پہلا درخت،ہسپانیہ اور طارق کی دعا'' میں بھی ایک رشتہ ہے۔گویا نظموں میں ایک آزاد رشتے،ہستیوں کے تنوّع اور موضوعات کی رنگا نگی تینوں اقبالؔ کی امتیازی خصوصیات ہیں۔اقبالؔ سے اردو نظم بلوغت کی منزل میں داخل ہوتی ہے۔یہ ہماری شاعری میں پابند شاعری کی معراج ہے۔آزاد نظم کی کہانی اس کی وجہ سے ہی ممکن ہوسکی۔

اقبالؔ کے پہلے شعری مجموعے بانگِ درا میں حُسنِ فطرت سے دل چسپی اور حُبُّ الوطنی کے جذبات نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔بالِ جبریل کی شاعری میں علامہ اقبالؔ کے مفکرّانہ پہلو نمایاں ہیں اور ضربِ کلیم اور ارمغانِ حجاز کی نظموں پر ڈرامائی انداز اور خطابت کا اثر حاوی نظر آتا ہے۔''ہمالہ'' اقبالؔ کی پہلی مطبوعہ نظم ہے جو مخزن لاہور کے پہلے شمارے میں''کوہستانِ ہمالہ'' کے عنوان سے شائع ہوئی اور بانگِ درا میں ''ہمالہ'' کے عنوان سے شامل کی گئی۔''ہمالہ'' نے صاحبِ ذوق حلقے کو چونکا دیا۔اس نظم میں حُسنِ فطرت اور حُبُّ الوطنی کے ساتھ ساتھ ماضی کی

بازیافت کا جذبہ بھی صاف نظر آتا ہے۔ مناظرِ فطرت سے دل چسپی بعد کی نظموں میں نظر آتی ہے۔ ابتدائی دَور میں اقبالؔ نے نیچرل نظمیں لکھیں اور مناظرِ قدرت کے مختلف مرقعوں کو پیش کرنے کے ساتھ ساتھ انسانیت کو پیغام بھی دیا۔ ایسی نظموں میں ''گلِ رنگیں، ابرِ کوہسار، آفتابِ صبح، چاند، جگنو، شمع، ماہِ نو، انسان اور بزمِ قدرت، ایک آرزو، موجِ دریا، ابر، کنارہ، اور راوی'' قابلِ ذکر ہیں۔

''ایک آرزو'' میں علامہ اقبالؔ نے شاعری کی عمدہ مصوّرانہ مثال پیش کی ہے۔ شاعر دنیا کے ہنگاموں سے دور ایک پُرسکون زندگی کی خواہش کرتا ہے۔ اس کی خواہش یہ ہے کہ پہاڑ کے دامن میں اس کا ایک چھوٹا سا جھونپڑا ہو جہاں وہ دنیا و مافیہا سے بے نیاز ہو کر اپنے تخیّلات وتصوّرات کی دنیا میں مستانہ زندگی بسر کرے۔ اس منظر کی عکاسی ان اشعار میں ملاحظہ کیجیے:

صف باندھے دونوں جانب بوٹے ہرے ہرے ہوں ندّی کا صاف پانی تصویر لے رہا ہو
ہو دل فریب ایسا کہسار کا نظارہ پانی بھی موج بن کر اُٹھ اُٹھ کے دیکھتا ہو
مہندی لگائے سورج جب شام کی دلہن کو سرخی لیے سنہری ہر پھول کی قبا ہو
راتوں کو چلنے والے رہ جائیں تھک کے جس دَم اُمید اُن کی میرا ٹوٹا ہوا دِیا ہو
بجلی چمک کے اُن کو کٹیا مری دِکھا دے جب آسماں پہ ہر سو بادل گھرا ہوا ہو
پچھلے پہر کی کوئل ، وہ صبح کی مؤذن میں اس کا ہم نوا ہوں ، وہ میری ہم نوا ہو

اس پوری نظم میں ہی خیالات کا ایک سمندر آباد ہے۔ منفرد خیالات اور بہت ہی خوب صورت تجسیم ہیں۔ بانگِ درا کے حصہ دوم میں حقیقتِ حُسن، کلی، چاند اور تارے، انسان، ایک شام اور تنہائی جیسی نظمیں فطرت کے جمال و پیام کے خوب صورت آئینے ہیں۔ حصہ سوم میں ستارہ، نمودِ صبح، بزمِ انجم، شبنم اور ستارے، آفتاب اور پھول جیسی نظمیں ہیں جن میں شاعری اور فلسفے کا بہترین امتزاج ہے۔ اقبالؔ حُسنِ قدرت کے مظاہر میں معنویت تلاش کرتے ہیں اور فطرت کے ساتھ انسانی وابستگی کا اظہار کرتے ہیں کیوں کہ وہ عروسِ فطرت کے بہت بڑے پرستار ہیں۔ وہ بے جان اشیا کو ذی روح محسوس کرتے ہیں اور ان کی زبان سے اپنی بات کہلواتے ہیں۔ اقبالؔ فلسفیانہ نظموں کے آغاز میں کچھ اس طرح منظر نگاری کرتے ہیں جس سے فضا سازی میں مدد ملتی ہے۔ گورستانِ شاہی میں وہ فضا کو سوگ وار بناتے ہیں۔ ''خضرِ راہ'' کی ابتدا میں جو منظر کشی کی ہے وہ ایک خاص فضا کی تشکیل کرتی ہے۔

''مسجدِ قرطبہ'' کے آخر میں یہ منظر نگاری اس کی معنویت بڑھا دیتی ہے:

وادیِ کہسار میں غرقِ شفق ہے سحاب لعلِ بدخشاں کے ڈھیر چھوڑ گیا آفتاب
سادہ و پُر سوز ہے دُخترِ دہقاں کا گیت کشتیِ دل کے لئے سَیل ہے عہدِ شباب

وطنی اور قومی شاعری میں انہوں نے حُبّ الوطنی کے جذبات اُبھارنے کی کوشش کی ہے اور قوم کو دعوتِ عمل کی طرف راغب کیا ہے۔ ہندوستانی بچوں کا قومی گیت، ترانۂ ملّی، نیا شوالہ، وطنیت، خطاب بہ جوانانِ اسلام، ہلالِ عید، صدائے درد، تصویرِ درد، آفتاب اور ترانۂ ہندی اس کی عمدہ مثالیں ہیں۔ ان نظموں کے وسیلے سے علامہ اقبالؔ نے قوم کو اتفاق و اتحاد کا پیغام دیا اور خبردار کیا کہ اگر متحد نہ ہوئے اور منتشر ہو گئے

تو پوری قوم کا شیرازہ بکھر جائے گا۔اسی زمانے میں اقبالؔ نے بچوں کے لئے بھی کثرت سے نظمیں لکھیں جن میں ایک مکڑا اور مکھی، ایک پہاڑ اور گلہری، ایک گائے اور بکری، بچے کی دعا، ماں کا خواب، پرندے کی فریاد، ہندوستانی بچوں کا قومی گیت اور ہمدردی اہم ہیں۔اقبالؔ نے بعض نظمیں مشہور شعرا ایمرسن، ولیم کوپر، لانگ فیلو اور ٹینی سن کے خیالات سے متاثر ہوکر لکھیں۔''گلِ پژمردہ، زہد اور رندی، طفلِ شیر خوار، گورستانِ شاہی اور شبنم اور ستارے'' یہ اخلاقی نظمیں ہیں۔ان نظموں میں اخلاقِ حسنہ پیدا کرنے کی تلقین کی ہے یا سبق آموز واقعات کو نظم کی شکل میں پیش کیا ہے۔تاریخی نظموں میں ہلال، صقلیہ، غلام قادر روہیلہ، حضورِ رسالت مآب میں، فاطمہ بنتِ عبداللہ، محاصرۂ ادرنہ، صدیق اکبر اور بلادِ اسلامیہ شامل ہیں۔

۱۹۰۵ء میں اقبالؔ یورپ گئے اور ۱۹۰۸ء تک وہاں قیام پذیر رہے۔یورپ کے قیام کے دَوران ان کے خیالات میں ایک عظیم انقلاب آیا۔وہاں کی سیاست کو بہت قریب سے دیکھا انہیں وہاں کی تہذیب کی حقیقت کا پتہ چلا۔انہیں احساس ہوا کہ قومیت اور وطنیت کا نظریہ انسانوں کے حق میں مفید ثابت نہیں ہوسکتا۔اس سے تعصّب اور تنگ نظری کو تقویت ملتی ہے۔اقبالؔ نے دیکھا کہ مغربی تہذیب کی بنیاد مادیت پر ہے اور وہ منکرِ خدا ہیں۔آخر میں اقبالؔ اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ دنیا کی نجات اسلامی اصولوں کی تبلیغ واشاعت میں مضمر و پوشیدہ ہیں۔

۱۹۰۸ء سے ۱۹۳۸ء تک اقبالؔ کی نظموں میں ایک منفرد انقلابی رنگ نظر آتا ہے۔اس تبدیلی کا مظہر ان کی نظم ''طلبۂ علی گڑھ کے نام'' میں صاف نظر آتا ہے، جو انہوں نے یورپ میں قیام کے دَوران ۱۹۰۷ء میں لکھی۔اقبالؔ نے پہلی مرتبہ قوم کے نوجوانوں کو مخاطب کیا اور اسی نظم سے ان کے فلسفے کی بنیاد پڑی۔ ۱۸۵۷ء کی ناکام جدوجہد کے بعد انگریزوں نے مسلمانوں کے ساتھ معاندانہ رویہ اختیار کیا۔مسلمانانِ ہند کا کوئی نصب العین نہیں تھا۔اقبالؔ نے انہیں عشق وعمل کا پیغام دیا۔وہ کہتے ہیں:

عشق کے درد مند کا طرزِ کلام اور ہے　　اَوروں کا ہے پیام اور ، میرا پیام اور ہے

اس نظم میں اقبالؔ کے ان تصوّرات کے ہلکے نقوش نظر آتے ہیں جو آگے چل کر ایک منضبط فلسفے کی شکل میں اُبھرے۔اس نظم میں اقبالؔ نے عقل اور عشق کا تقابل پیش کیا۔اقبالؔ نے عشق اختیار کرنے کی تلقین کی۔انہوں نے قوم میں ولولہ اور جوش پیدا کرنے والی نظمیں لکھیں۔ ۱۹۰۶ء میں انہوں نے نظم ''محبت''، لکھی جس میں انہوں نے حُسن، نیکی اور صداقت جیسے (ستیم، شیوم، سندرم) کے فلسفے کو پیش کیا۔ انہوں نے مسلمانوں کو ان کا شاندار ماضی یاد دلایا۔یورپ کے قیام کے دَوران ان کے خیالات میں جو تبدیلی آئی اس کا احساس نظم ''عبدالقادر'' میں ملتا ہے۔یہ نظم انہوں نے ۱۹۰۸ء میں اپنے دوست عبدالقادر کے نام لکھی تھی۔یورپ سے واپسی پر اقبالؔ نے نظم ''صقلیہ'' لکھی۔عربوں نے اس جزیرے کو تہذیب وتمدّن، علم وفضل اور صنعت وحرفت سے مالا مال کیا تھا۔اقبالؔ نے صقلیہ کو تہذیبِ حجازی کا مزار کہا ہے۔

اس دَور میں اقبالؔ کی نظموں کا موضوع فلسفۂ خودی، فلسفۂ بےخودی اور عشق ہوگیا۔انہوں نے اپنی شاعرانہ قوّت کو مسلمانوں کو جگانے اور ان کے دل میں سوز پیدا کرنے کے لئے وقف کردیا۔انہوں نے قوم کو اُمید کا پیغام دیا، اطاعتِ اسلام کے جذبے کو اُبھارا، مغرب کی مادہ پرست تہذیب کے اثرات سے آگاہ وخبردار کیا۔خطاب بہ نوجوانانِ اسلام، مسلم، شعاعِ آفتاب، نویدِ صبح، شکوہ، جوابِ شکوہ، شمع اور

شاعر، خضرِ راہ اورطلوعِ اسلام جیسی نظمیں ان خیالات کی ترجمانی کرتی ہیں۔''شکوہ'' اقبالؔ کی پہلی طویل نظم ہے جوانہوں نے ۱۹۱۱ء میں لکھی۔اس نظم میں اقبالؔ نے مسلمانوں کی عظمتِ رفتہ اورشوکتِ گزشتہ اورموجودہ زبوں حالی کونہایت فن کارانہ انداز میں پیش کیا۔ اُردو کا شعری سرمایہ اس انداز سے بالکل نا آشنا تھا۔ یہ اس دَور کے مسلمانوں کی آوازِ دل گداز تھی۔شکوہ بے حد مقبول ہوئی۔شکوہ کے ڈیڑھ سال بعد اقبالؔ نے''جوابِ شکوہ''لکھی۔انہوں نے اللہ تعالیٰ کی جانب سے قومِ مسلم کومخاطب کیا۔ یہ نظم بیانیہ انداز کی ہے۔اس میں تاسف کا اظہار بھی ہے،اُمید بھی بندھائی ہے اوردعوتِ عمل بھی ہے۔ان سب نے مل کراس نظم کومنفرد وممتاز بنادیا ہے۔ڈرامائی رنگ اورکہیں کہیں طنزیہ انداز سیدھا دل میں اُتر جاتا ہے۔جیسے:

یوں تو سید بھی ہو مرزا بھی ہو افغان بھی ہو تم سبھی کچھ ہو بتاؤ تو مسلمان بھی ہو
وہ زمانے میں معزز تھے مسلماں ہوکر اور تم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہوکر
حرمِ پاک بھی ، اللہ بھی ، قرآن بھی ایک کچھ بڑی بات تھی ہوتے جو مسلمان بھی ایک

''جوابِ شکوہ''افکاروخیالات کی ندرت وجدّت کے ساتھ فنی اعتبار سے ایک بہت ہی خوب صورت نظم ہے۔تاثر کی شدت اور جذبے کی اتھاہ گہرائی نظم کے ہر حصے میں موجود ہے۔اس نظم کا اختتام اس لازوال شعر پر ہے جس کی مثال پوری شاعری میں نہیں ملتی۔مثلاً:

کی محمد ﷺ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح وقلم تیرے ہیں

''بالِ جبریل''۱۹۳۵ء میں شائع ہوئی۔''بالِ جبریل''اقبالؔ کی اردو شاعری کا نقطۂ عروج ہے۔''بالِ جبریل'' کا آغاز سرزمینِ قرطبہ سے متعلق نظموں سے شروع ہوتا ہے''ہسپانیہ،قید خانے میں معتمد کی فریاد،عبدالرحمٰن اوّل کا بویا ہوا کھجور کا درخت (سرزمینِ اندلس میں)، طارق کی دعا (اندلس کے میدانِ جنگ میں)۔ان چھوٹی چھوٹی نظموں کے احساسات وسیع اور واضح ہوکر ایک بڑی نظم''مسجدِ قرطبہ'' کی تخلیق کا باعث بنتے ہیں۔پوری نظم شاعری کا شاہ کار کارنامہ ہے۔وقت مسلسل متحرک ہے،عشق لافانی ہے،مسجد دین اورفن کی علامت ہے،مردِمومن ایک کائناتی قوت ہے۔عصرِ حاضر ایک انقلابی موڑ پر ہے۔خونِ جگر کے بغیر سارے نقش ناتمام ہیں۔اقبالؔ کے تصوّرِ عشق،فلسفۂ عمل اورمردِمومن پوری وضاحت کے ساتھ اس نظم میں موجود ہیں۔اقبالؔ کے مردِمومن میں علم ومحبت،عقل وعشق میں ایک ہم آہنگی ہے جو اسے ایک عالم گیر علامت بناتی ہے۔

بالِ جبریل کی دوسری اہم نظمیں'ذوق وشوق اورساقی نامہ وغیرہ'ہیں۔اقبالؔ نے جو بات'شکوہ'میں اجتماعی طور پر کھُلے انداز میں کہی وہی بات'ذوق وشوق'میں انفرادی طور پر اختصار کے طور پر اشاروں میں کی ہے۔یہ علامتی انداز شاعر کے تجربات کا نچوڑ ہے۔فنی اعتبار سے ایک شاہ کار نظم ہے۔اس نظم کی سب سے بڑی خوبی اس کا سوز وگداز ہے۔یہ نظم ایجاز وبلاغت کی عمدہ مثال ہے۔''ساقی نامہ''اقبالؔ کی ایک مشہور ومعروف نظم ہے اور یہ ایک پُر جوش نظم سمجھی جاتی ہے۔اس نظم میں اقبالؔ کا فلسفہ ایک نغمے میں ڈھل گیا ہے اور پوری نظم مترنّم اور رَواں ہے۔

بالِ جبریل میں خوب صورت تمثیلی اور علامتی نظمیں ہیں۔علامتی نظموں میں ''لالۂ صحرااور شاہین'' اہم ہیں۔لالۂ صحرا کائنات کی وسعتوں میں انسان کی تنہائی اور کارفرمائی کی علامت ہے۔لالہ اورشاہین اقبال کی مرغوب علامتیں ہیں۔شاہین ایک طاقت وَر پرندہ ہی نہیں بلکہ اس میں فقروغنا، غیرت وحمیت، سخت کوشی اور وسیع النظری، مردار چیزوں سے پرہیز، تازہ شکار کرنا ایسی خصوصیات ہیں جن کی بنا پر اقبال نے شاہین کو استعارہ بنایا۔ افراد کی سیرت پر لالۂ صحرا کی خاموشی ودل سوزی اور شاہین کی طرح لہو گرم رکھنا چاہیے تاکہ جلال وجمال، وقار اور عمل کے امتزاج سے ایک متوازن کردار کائنات کی ہستی کی داد دے۔تمثیلی نظموں میں ''روحِ ارضی آدم کا استقبال کرتی ہے''، لینن خدا کے حضور میں، فرشتوں کا گیت، فرمانِ خدااور جبریل و ابلیس کا مکالمہ' قابلِ ذکر ہیں۔'لینن خدا کے حضور میں' اقبال کے فلسفۂ حیات، مطالعۂ تاریخ اور تجزیۂ سیاست کی ترجمان ہے۔ وہ سرمایہ داری اور مادہ پرستی کے ساتھ کلیسائیت پر بھی شدید تنقید کرتے ہیں کیوں کہ مغرب کی مسخ شدہ مسیحیت اور غلط مذہبیت کے ردِ عمل کے طور پر کمیونزم کی بنیاد دہریت اور الحاد پر رکھی گئی ہے۔

''ضربِ کلیم'' میں چھوٹی اور متوسّط نظمیں ہیں۔''شعاعِ امید'' سب سے مشہور اور فکروفن کے اعتبار سے ایک اہم نظم ہے۔ یہ نظم تین حصوں میں منقسم ہے۔ پہلے حصے میں کرنوں سے سورج کا خطاب ہے۔ دوسرے حصے میں کرنوں پر خطاب کا اثر دکھایا گیا ہے۔تیسرے حصے میں شعاعِ آفتاب کہتی ہے کہ وہ اس وقت تک چمکتی رہے گی جب تک پورا مشرق اور سارا عالَم روشن نہ ہو جائے۔''شعاعِ امید'' اقبال کی شاعری کے اُمید افزا پیام کی علامت ہے۔''ارمغانِ حجاز'' کی سب سے اہم نظم ''ابلیس کی مجلسِ شوریٰ'' ہے۔اس میں پانچواں مشیر دنیا کی صورتِ حال سے ابلیس کو آگاہ کرتا ہے۔ پانچواں مشیر اشتراکیت کے نئے فتنے کی نشان دہی کرتا ہے۔ابلیس اپنے خطاب میں واضح کردیتا ہے کہ ابلیسی نظام کو اشتراکیت سے کوئی خطرہ نہیں اسے سب سے زیادہ خطرہ اُمّتِ مسلمہ سے ہے۔

مکالمہ ملاحظہ فرمائیں:

کب ڈرا سکتے ہیں مجھ کو اشتراکی کوچہ گرد — یہ پریشاں روزگار ، آشفتہ مغز ، آشفتہ مُو
ہے اگر مجھ کو خطر کوئی تو اِس اُمّت سے ہے — جس کی خاکستر میں ہے اب تک شرارِ آرزو
خال خال اِس قوم میں اب تک نظر آتے ہیں وہ — کرتے ہیں اشکِ سحر گاہی سے جو ظالم وضو
جانتا ہے، جس پہ روشن باطنِ ایام ہے — مزدکیّت فتنۂ فردا نہیں ، اسلام ہے

07.06 علامہ اقبال کی نظم نگاری کا فنّی جائزہ

اقبال ہماری زبان کے پیامی شاعر ہیں۔انہوں نے اپنا پیغام اشاروں اور کنایوں کے ساتھ غزل میں اور تفصیل ووضاحت کے ساتھ نظم کے پیرائے میں پیش کیا۔انہیں اپنی شاعری پر نہیں، اپنے فلسفے پر ناز تھا۔انہوں نے بار بار کہا کہ میں شاعر نہیں فلسفی ہوں اور قوم کے لئے ایک خاص پیغام رکھتا ہوں لیکن اس حقیقت سے وہ اچھی طرح واقف تھے کہ شعر میں دل کشی نہ ہو تو اس کی طرف کوئی توجہ نہیں کرتا اور شاعر کا پیغام رائیگاں جاتا ہے۔اس لئے اقبال نے کوشش ومحنت کرکے اپنے کلام میں زیادہ سے زیادہ دل کشی ورعنائی پیدا کی۔انہوں نے زیادہ سے زیادہ شعری وسائل کا سہارا لیا اور اپنے کلام کو سراپا حُسن وجمال بنا دیا۔

اس کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

﴿۱﴾ **حُسنِ الفاظ**: شاعر جب کسی خیال، کسی جمالیاتی تجربے یا کسی قلبی واردات کو شعر کے پیکر میں ڈھالنا چاہتا ہے تو اسے موزوں الفاظ کی تلاش ہوتی ہے، اگلا مرحلہ ان لفظوں کی ترتیب کا ہے۔ لفظوں کے اسی انتخاب و ترتیب پر شعر کی کامیابی اور ناکامی کا دارومدار ہے۔ اس کام میں شاعر کو محنت بہت زیادہ کرنی پڑتی ہے۔ اسی کو اقبالؔ نے خونِ جگر صرف کرنے کا نام دیا ہے۔

﴿۲﴾ **تراش خراش**: لفظوں کی ترتیب و انتخاب آسان کام نہیں۔ اس میں بار بار تبدیلی کرنی پڑتی ہے۔ بقولِ حالیؔ شاعر کو ایک ایک لفظ کے لئے ستر کنویں جھانکنے پڑتے ہیں۔ قدیم شاعر صبح کو شعر کہتا تھا اور دن بھر اس کی نوک پلک سنوارنے میں مصروف رہتا تھا۔ شعر میں حُسن اسی محنت اور تراش خراش سے پیدا ہوتا ہے۔ اقبالؔ اس راز سے بخوبی واقف تھے اور اپنے شعروں کو سنوارنے اور نکھارنے میں بہت وقت صرف کرتے تھے۔ ان کی بہت سی نظمیں ایسی ہیں جن کی ابتدائی شکل کچھ اور تھی، رسالوں میں چھپیں تو ان کی شکل بدل چکی تھی اور جب مجموعے میں شامل ہوئیں تو بالکل ہی مختلف ہو چکی تھیں۔ محمد دین نے اقبالؔ کو خط لکھا اور ایک شعر کی بہت تعریف کی۔ اقبالؔ نے جواب میں لکھا کہ شعر دل کش کیسے نہ ہو میں نے اسے چالیس بار تبدیل کیا ہے۔ کلامِ اقبالؔ کی دل کشی کا ایک اہم سبب وہ صیقل ہے جو وہ اپنے کلام پر مسلسل کرتے رہتے تھے۔

﴿۳﴾ **نغمگی**: کلامِ اقبالؔ کی ایک نہایت نمایاں خوبی یہ ہے کہ اس میں غنائیت یعنی نغمگی بہت زیادہ ہے۔ غزل میں وزن اور قافیہ و ردیف کے سبب زیادہ ترنّم ہوتا ہی ہے لیکن اقبالؔ کی نظموں میں بھی ایسی موسیقیت ہے کہ انہیں بہت کامیابی کے ساتھ گایا جا سکتا ہے اور ان کی نظمیں بڑے دل کش انداز میں گائی جا چکی ہیں۔ اقبالؔ کی نظموں میں عموماً بلند آہنگ یعنی اونچے سروں کی موسیقی ملتی ہے۔ وہ اس راز سے واقف تھے کہ دھیمے سُروں کی موسیقی خواب آور ہوتی ہے، اُداسی پیدا کرتی ہے اور بے عملی کا راستہ دکھاتی ہے۔ لوری اس کی مثال ہے جب کہ اونچے سروں کی موسیقی نیند سے بیدار کرتی ہے۔ جوش دلاتی ہے اور حوصلہ بڑھاتی ہے جیسے میدانِ جنگ میں فوجی بینڈ کی دھن جو کہ سپاہیوں میں سرفروشی کا جذبہ پیدا کرتی ہے۔

﴿۴﴾ **امیجری**: موسیقی کے بعد شاعری کے لئے جو چیز سب سے زیادہ ضروری ہے وہ مصوّری ہے۔ شاعر الفاظ سے ایسی تصویر بناتا ہے کہ رنگوں سے بنی ہوئی تصویر بھی مات کھا جاتی ہے۔ رنگوں سے انسان کی تصویر تو بنائی جا سکتی ہے لیکن اس کے دل کی کیفیت کو چہرے سے ظاہر کرنا آسان نہیں۔ دوسری بات یہ کہ مصوّر ٹھہری ہوئی تصویر بنا سکتا ہے لیکن حرکت کو پیش کرنا اس کے لئے ممکن نہیں۔ اس کے برعکس شاعر لفظوں کے ذریعے انسان کے دل کی اندرونی کیفیت کو بھی ظاہر کر سکتا ہے اور چلتی پھرتی تصویر بنا سکتا ہے۔

اقبالؔ اردو شاعری کے سب سے بڑے مصور ہیں۔ ان کی کلیات کو ایک شاندار گیلری کہنا بجا ہے جس میں رنگ برنگی صدہا تصویریں آویزاں ہیں اور ہر تصویر ایسی دل کش کہ ناظر کی توجہ کو جذب کیے لیتی ہے۔ پیکر تراشی کی چار صورتیں ممکن ہیں۔ **ساکت**: یعنی ٹھہری ہوئی تصویر **متحرک**: یعنی چلتی پھرتی تصویر **تمثیل**: جس میں ایک سے زیادہ بے جان چیزوں کو جان دار مان لیا جاتا ہے اور ان کے مکالموں سے ایک ڈرامائی فضا تیار ہو جاتی ہے۔ پیکر تراشی کی آخری اور سب سے اعلیٰ شکل وہ ہے۔ **ڈرامہ**: جس میں حرکت و عمل کی ایسی فراوانی ہوتی ہے کہ بالکل ڈرامے کی شان پیدا ہو جاتی ہیں۔ اقبالؔ کی نظموں میں پیکر تراشی پائی جاتی ہے اور پیکر تراشی کی مندرجہ ذیل چار صورتیں ہیں:

﴿۱﴾ **ساکت تصویر**: خضرِ راہ کا پہلا بند اس کی بہترین مثال ہے۔

ساحلِ دریا پہ میں اک رات تھا محوِ نظر گوشۂ دل میں چھپائے اک جہانِ اضطراب
شب سکوت افزا ، ہوا آسودہ ، دریا نرم سیر تھی نظر حیراں کہ یہ دریا ہے یا تصویرِ آب
جیسے گہوارے میں سوجاتا ہے طفلِ شیر خوار موجِ مضطر تھی کہیں گہرائیوں میں مستِ خواب
رات کے افسوں سے طائرآشیانوں میں اسیر انجمِ کم ضو گرفتارِ طلسمِ ماہتاب

﴿۲﴾متحرک تصویر:

سورج نے جاتے جاتے شامِ سیہ قبا کو طشتِ اُفق سے لے کر لالے کے پھول مارے
پہنا دیا شفق نے سونے کا سارا زیور قدرت نے اپنے گہنے چاندی کے سب اُتارے
محمل میں خامشی کے لیلائے ظلمت آئی چمکے عروسِ شب کے موتی وہ پیارے پیارے

﴿۳﴾تمثیل: اقبالؔ کی نظموں میں تمثیل کی بھی بہت سی مثالیں موجود ہیں ۔چاند اور تارے ،شعاعِ اُمید اور حقیقتِ حُسن اردو شاعری کی بہترین تمثیلیں ہیں۔شعاعِ اُمید میں دراصل ایک کرن ہے جو آرام سے بے زار ہے اور مشرقی ممالک میں اُجالا کرنا چاہتی ہے مگر سورج کی تمام کرنیں مشرق ومغرب سے مایوس ہیں۔وہ ناکام ہوکر سورج کی طرف لوٹ جاتی ہیں اور اس سے درخواست کرتی ہیں کہ ہمیں پھر سے اپنے سینے میں چھپالے۔اس نظم میں سورج کی کرنیں جان دار ہوکر ہمارے سامنے آتی ہیں،گفتگو کرتی ہیں۔ان میں ایک ''اک شوخ کرن،شوخ مثالِ نگہِ حور'' جسے اقبالؔ نے شعاعِ اُمید کا نام دیا ہے مرکزی کردار ادا کرتی ہے۔یہ نظم شاعری کی سب سے حسین تمثیل ہے۔

﴿۴﴾ڈرامہ: اعلیٰ درجے کی شاعری لامحالہ ڈرامے کے نزدیک آجاتی ہے۔اقبالؔ کی تمام عظیم نظمیں مکمل ڈرامہ کہلانے کی حق دار ہیں۔کیوں کہ ان نظموں میں ہم سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ایک اسٹیج ہمارے سامنے ہے جس پر مختلف کردار اپنا اپنا رول ادا کرتے نظر آرہے ہیں۔مثلاً محسوس ہوتا ہے کہ جبریل وابلیس کو گفتگو کرتے ہوئے ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں،خضر کی شخصیت ہماری نظروں کے سامنے اُبھرتی ہے۔'ابلیس کی مجلسِ شوریٰ'' پڑھتے ہوئے ہمیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس مجلس کا ہنگامی اجلاس ہمارے سامنے ہورہا ہے اور اس کی کارروائی ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔''لینن خدا کے حضور میں،جبریل وابلیس،خضر راہ،سید کی لوحِ تربت،ابلیس کی مجلسِ شوریٰ اور شکوہ جوابِ شکوہ اسی قبیل کی نظمیں ہیں۔

﴿استعارہ وتشبیہ﴾ پیکر تراشی میں استعارہ وتشبیہ بہت معاون ہوتے ہیں۔جو چیزیں غیر مرئی ہیں یعنی جن چیزوں کو ہم دیکھ نہیں سکتے اور چھو نہیں سکتے ،تشبیہ واستعارے کے ذریعے وہ ٹھوس ہوکر ہمارے سامنے آجاتی ہیں۔مثلاً ''ساقی نامہ'' میں اقبالؔ زندگی کی تصویر کھینچنا چاہتے ہیں اور زندگی ایک غیر مرئی شے ہے۔شاعر اسے ایک ذہنی تصویر کے ذریعے مجسّم کردینے کا فیصلہ کرتا ہے۔وہ زندگی کو ایک شاخ ٹھہراتا ہے اور اس دنیا میں قدم رکھنے والوں اور یہاں سے رخصت ہوجانے والوں کو پھولوں کا کھلنا اور مرجھانا کہہ کر ایک مکمل تصویر پیش کردیتا ہے۔مثلاً:

گل اِس شاخ سے ٹوٹتے بھی رہے اِسی شاخ سے پھوٹتے بھی رہے

انقلابِ روس کو اقبالؔ نیا سورج نکلنا اور چھوٹی چھوٹی سلطنتوں کے مٹ جانے کو ستاروں کا غروب ہونا کہتے ہیں۔ مثلاً:

آفتابِ تازہ پیدا بطنِ گیتی سے ہوا آسماں ڈوبے ہوئے تاروں کا ماتم کب تلک

نظم 'والدہ مرحومہ کی یاد میں' اپنی ماں کی یاد کو اقبالؔ ان دعاؤں سے تشبیہ دیتے ہیں جن سے کعبے کی فضا معمور ہے۔ مثلاً:

یاد سے تیری دلِ درد آشنا معمور ہے جیسے کعبے میں دعاؤں سے فضا معمور ہے

﴿صنائع﴾ صنعتوں سے شعر میں حُسن پیدا ہوجاتا ہے۔ اقبالؔ نے مختلف صنعتوں کے استعمال سے اپنی شاعری کے حُسن کو دوبالا کیا ہے۔ سب سے زیادہ ان کی شاعری میں ''صنعتِ تلمیح'' ہے۔ ان کی شاعری کا موضوع اسی کا متقاضی تھا۔ یہاں چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں:

آگ ہے، اولادِ ابراہیم ہے، نمرود ہے کیا کسی کو پھر کسی کا امتحاں مقصود ہے

مٹایا قیصر و کسریٰ کے استبداد کو کس نے وہ کیا تھا؟ زورِ حیدر، فقرِ بوذر، صدقِ سلمانی

﴿علامت نگاری﴾ بڑا شاعر علامتوں کے استعمال کے لئے بھی مجبور ہوتا ہے کیوں کہ ان کے ذریعے شاعر کے خیالات و نظریات کی وضاحت ممکن ہوتی ہے۔ اقبالؔ نے اپنی شاعری میں مختلف علامتوں کا سہارا لیا ہے۔ مثلاً ابلیس، ان کی شاعری میں عشق اور جہد و عمل کی علامت ہے۔ شاہین خودداری اور تگ و دَو کی علامت ہے۔ مملا اور کبوتر کمزوری اور بزدلی کی علامت ہیں۔ علامہ اقبالؔ نے اپنی شاعری میں علامت نگاری کے ذریعے بڑا کام کیا ہے۔

﴿شاعری کی تیسری آواز﴾ لب و لہجے کے اعتبار سے ان کی شاعری ۳ رحصوں میں منقسم ہے اور انہیں شاعری کی تین آوازیں بھی کہا جاتا ہے۔ خود کلامی کا لہجہ شاعری کی پہلی آواز ہے۔ یہاں شاعر اپنے آپ سے گفتگو کرتا ہے۔ تخاطب دوسرے سے گفتگو شاعری کی دوسری آواز ہے۔ شاعری کی تیسری آواز وہ ہے جب شاعر کچھ کردار وضع کرتا ہے یا تاریخ سے مستعار لے لیتا ہے اور اپنی بات ان کی زبان سے ادا کراتا ہے جیسے اقبالؔ نے اپنے خیالات سرسید، لینن اور ابلیس کی زبان سے ادا کروائے۔ اقبالؔ نے شاعری کی اس تیسری آواز سے اپنی نظموں میں بہت کام لیا ہے۔ مختصر یہ کہ جتنے شعری وسائل کا استعمال ممکن تھا اقبالؔ نے ان سب کا استعمال کیا اور اپنی نظموں میں ایسی دل کشی اور رعنائی پیدا کردی کہ اقبالؔ کا نظمیہ سرمایہ قارئین کی توجہ کا مرکز بن گیا اور پیغامِ اقبالؔ لوگوں کے اذہان و قلوب میں اُترتا چلا گیا۔

07.07 نظم ''ساقی نامہ'' متن

ہوا خیمہ زن کاروانِ بہار اِرم بن گیا دامنِ کوہسار

گل و نرگس و سوسَن و نسترن شہیدِ ازل لالہ خونیں کفن

جہاں چھپ گیا پردۂ رنگ میں لہو کی ہے گردش رگِ سنگ میں

فضا نیلی نیلی، ہوا میں سُرور ٹھہرتے نہیں آشیاں میں طیور

وہ جوے کہستاں اُچکتی ہوئی اٹکتی، لچکتی، سرکتی ہوئی

اُچھلتی، پھسلتی، سنبھلتی ہوئی بڑے پیچ کھا کر نکلتی ہوئی

رُکے جب تو سِل چیر دیتی ہے یہ پہاڑوں کے دِل چیر دیتی ہے یہ

ذرا دیکھ اے ساقیِ لالہ فام! سناتی ہے یہ زندگی کا پیام
پلادے مجھے وہ مئے پردہ سوز کہ آتی نہیں فصلِ گُل روز روز
وہ مے، جس سے روشن ضمیرِ حیات وہ مَے ، جس سے ہے مستیِ کائنات
وہ مَے ، جس میں ہے سوز و سازِ اَزَل وہ مَے، جس سے کھُلتا ہے رازِ اَزَل

اُٹھا ساقیا ! پردہ اِس راز سے
لڑا دے ممولے کو شہباز سے

زمانے کے انداز بدلے گئے نیا راگ ہے ، ساز بدلے گئے
ہوا اِس طرح فاش رازِ فرنگ کہ حیرت میں ہے شیشہ بازِ فرنگ
پرانی سیاست گری خوار ہے زمیں میر و سلطاں سے بے زار ہے
گیا دَورِ سرمایہ داری گیا تماشہ دکھا کر مداری گیا
گراں خواب چینی سنبھلنے لگے ہمالہ کے چشمے اُبلنے لگے
دلِ طورِ سینا و فاراں دو نیم تجلّی کا پھر منتظر ہے کلیم
مسلماں ہے توحید میں گرم جوش مگر دل ابھی تک ہے زُنّار پوش
تمدّن ، تصوّف ، شریعت ، کلام بُتانِ عجم کے پجاری تمام
حقیقت خرافات میں کھو گئی یہ اُمّت روایات میں کھو گئی
لُبھاتا ہے دل کو کلامِ خطیب مگر لذّتِ شوق سے بے نصیب
بیاں اُس کا منطق سے سلجھا ہوا لغت کے بکھیڑوں میں اُلجھا ہوا
وہ صوفی کہ تھا خدمتِ حق میں مرد محبّت میں یکتا ، حمیّت میں فرد
عجم کے خیالات میں کھو گیا یہ سالک مقامات میں کھو گیا

بجھی عشق کی آگ ، اندھیر ہے
مسلماں نہیں ، راکھ کا ڈھیر ہے

شرابِ کُہن پھر پلا ساقیا وہی جام گردش میں لا ساقیا
مجھے عشق کے پَر لگاکر اُڑا مِری خاک جگنو بنا کر اُڑا
خرد کو غلامی سے آزاد کر جوانوں کو پیروں کا استاد کر
ہری شاخِ ملّت ترے نم سے ہے نفَس اِس بدن میں ترے دَم سے ہے

تڑپنے پھڑکنے کی توفیق دے دلِ مُرتضٰی ، سوزِ صدّیق دے
جگر سے وہی تیر پھر پار کر تمنّا کو سینوں میں بیدار کر
ترے آسمانوں کے تاروں کی خیر زمینوں کے شب زندہ داروں کی خیر
جوانوں کو سوزِ جگر بخش دے مِرا عشق ، میری نظر بخش دے
مری ناؤ گرداب سے پار کر یہ ثابت ہے تو اس کو سیّار کر
بتا مجھ کو اَسرارِ مَرگ و حیات کہ تیری نگاہوں میں ہے کائنات
مِرے دیدۂ تر کی بے خوابیاں مِرے دل کی پوشیدہ بے تابیاں
مِرے نالۂ نیم شب کا نیاز مِری خلوت و انجمن کا گداز
اُمنگیں مِری ، آرزوئیں مِری اُمیدیں مِری ، جستجوئیں مِری
مِری فطرت آئینۂ روزگار غزالانِ افکار کا مرغزار
مِرا دل ، مری رزم گاہِ حیات گمانوں کے لشکر ، یقیں کا ثبات
یہی کچھ ہے ساقی متاعِ فقیر اسی سے فقیری میں ہوں میں امیر
مِرے قافلے میں لٹا دے اسے
لٹادے، ٹھکانے لگا دے اسے

دَما دَم رَواں ہے یمِ زندگی ہر اک شے سے پیدا رمِ زندگی
اسی سے ہوئی ہے بدن کی نمود کہ شعلے میں پوشیدہ ہے موج دُود
گراں گرچہ ہے صحبتِ آب و گِل خوش آئی اسے محنت آب و گِل
یہ ثابت بھی ہے اور سیار بھی عناصر کے پھندوں سے بے زار بھی
یہ وحدت ہے کثرت میں ہر دَم اسیر مگر ہر کہیں بے چگوں ، بے نظیر
یہ عالَم ، یہ بت خانۂ شش جہات اِسی نے تراشا ہے یہ سومنات
پسند اس کو تکرار کی خو نہیں کہ تُو مَیں نہیں اور مَیں تُو نہیں
من و تو سے ہے انجمن آفریں مگر عین محفل میں خلوت نشیں
چمک اس کی بجلی میں ، تارے میں ہے یہ چاندی میں،سونے میں، پارے میں ہے
اسی کے بیاباں ، اسی کے ببول اسی کے ہیں کانٹے ، اسی کے ہیں پھول
کہیں اس کی طاقت سے کہسار چُور کہیں اس کے پھندے میں جبریل و حور
کہیں جُرّہ شاہینِ سیمابِ رنگ لہو کے چکوروں سے آلودہ چنگ

کبوتر کہیں آشیانے میں دور
پھڑکتا ہوا جال میں ناصبور

فریبِ نظر ہے سکون و ثبات تڑپتا ہے ہر ذرّۂ کائنات
ٹھہرتا نہیں کاروانِ وجود کہ ہر لحظہ ہے تازہ شانِ وجود
سمجھتا ہے تو راز ہے زندگی فقط ذوقِ پرواز ہے زندگی
بہت اِس نے دیکھے ہیں پست و بلند سفر اس کو منزل سے بڑھ کر پسند
سفر زندگی کے لئے برگ و ساز سفر ہے حقیقت ، حضر ہے مجاز
اُلجھ کر سلجھنے میں لذت اِسے تڑپنے پھڑکنے میں راحت اِسے
ہوا جب اِسے سامنا موت کا کٹھن تھا بڑا تھامنا موت کا
اُتر کر جہانِ مکافات میں رہی زندگی موت کی گھات میں
مذاقِ دوئی سے بنی زَوج زَوج اُٹھی دشت و کوہسار سے فوج فوج
گُل اِس شاخ سے ٹوٹتے بھی رہے اِسی شاخ سے پھوٹتے بھی رہے
سمجھتے ہیں ناداں اسے بے ثبات اُبھرتا ہے مٹ مٹ کے نقشِ حیات
بڑی تیز جولاں ، بڑی زود رس اَزل سے اَبد تک رَمِ یک نفس

زمانہ کہ زنجیرِ ایّام ہے
دَموں کے اُلٹ پھیر کا نام ہے

یہ موجِ نَفَس کیا ہے ؟ تلوار ہے! خودی کیا ہے ؟ تلوار کی دھار ہے!
خودی کیا ہے ؟ رازِ درونِ حیات! خودی کیا ہے ؟ بیداریِ کائنات!
خودی جلوہ بدمست و خلوت پسند! سمندر ہے ایک بوند پانی میں بند!
اندھیرے اُجالے میں ہے تاب ناک! من و تو میں پیدا ،من و تو سے پاک!
اَزل اس کے پیچھے ، اَبد سامنے! نہ حد ، اس کے پیچھے نہ حد سامنے!
زمانے کے دریا میں بہتی ہوئی ستم اس کی موجوں کے سہتی ہوئی
تجسُّس کی راہیں بدلتی ہوئی دَما دَم نگاہیں بدلتی ہوئی
سُبک اس کے ہاتھوں میں سنگِ گراں پہاڑ اس کی ضربوں سے ریگِ رواں
سفر اس کا انجام و آغاز ہے یہی اس کی تقویم کا راز ہے!

کرن چاند میں ہے ، شرر سنگ میں یہ بے رنگ ہے ، ڈوب کر رنگ میں
اسے واسطہ کیا کم و بیش سے نشیب و فراز و پس وپیش سے!
اَزل سے ہے یہ کش مکش میں اسیر ہوئی خاکِ آدم میں صورت پذیر
خودی کا نشیمن ترے دِل میں ہے
فلک جس طرح آنکھ کے تِل میں ہے

خُودی کے نگہباں کو ہے زہر ناب وہ ناں جس سے جاتی رہے اس کی آب
وہی ناں ہے اس کے لئے ارجمند رہے جس سے دنیا میں گردن بلند
خودی فالِ محمود سے در گزر خودی کو نگہ رکھ ، ایازی نہ کر
وہی سجدہ ہے لائقِ اہتمام کہ ہو جس سے ہر سجدہ تجھ پر حرام
یہ عالَم ، یہ ہنگامۂ رنگ و صَوت یہ عالم ، کہ ہے زیرِ فرمانِ موت
یہ عالَم ، یہ بت خانۂ چشم و گوش جہاں زندگی ہے فقط خورد و نوش
خُودی کی یہ ہے منزلِ اوّلیں مسافر ! یہ تیرا نشیمن نہیں
تری آگ اس خاک داں سے نہیں جہاں تجھ سے ہے ، تو جہاں سے نہیں
بڑھے جا یہ کوہِ گراں توڑ کر طلسمِ زمان و مکاں توڑ کر!
خودی شیرِ مولیٰ ، جہاں اُس کا صید! زمیں اس کی صید ، آسماں اُس کا صید
جہاں اور بھی ہیں ، ابھی بے نمود کہ خالی نہیں ہے ضمیرِ وجود
ہر اک منتظر تیری یلغار کا تری شوخیِ فکر و کردار کا
یہ ہے مقصدِ گردشِ روزگار کہ تیری خودی تجھ پہ ہو آشکار
تو ہے فاتحِ عالمِ خوب و زشت! تجھے کیا بتاؤں تری سرنوشت!
حقیقت پہ ہے جامۂ حرف تنگ! حقیقت ہے آئینہ ، گفتار زنگ!
فروزاں ہے سینے میں شمعِ نفس مگر تابِ گفتار کہتی ہے بس!
اگر یک سرِ مُوئے بر تر پرم
فروغِ تجلّی بہ سوزد پرم!

07.08 نظم ’’ساقی نامہ‘‘ تجزیہ

’’ساقی نامہ‘‘ اقبالؔ کی اہم نظم ہے۔ تمام نقاد اس بات پر متفق ہیں کہ صوری و معنوی اعتبار سے یہ ایک عمدہ نظم ہے۔ یہ نظم سات بند پر مشتمل ہے۔ پہلے بند میں موسمِ بہار کے دل کش ماحول، دل رُبا مناظر اور رومانی فضا کا نقشہ کھینچتے ہیں۔ دوسرے بند میں عصرِ حاضر اور مسلمانوں کے زوال و انحطاط کا مرثیہ، تیسرے بند میں حرکت اور احیائے ملت کے لئے ولولہ و عزم، چوتھے بند میں کائناتِ زندگی کی ماہیت کا بیان، پانچویں میں زندگی کی خصوصیات، چھٹے بند میں خودی کی طاقت، ساتویں بند میں خودی کی صفات، پرورشِ خودی کی تلقین کی ہے۔ نیز اسی بند میں انہوں نے انسانوں سے خطاب کیا ہے۔

﴿پہلا بند﴾ علامہ اقبالؔ نے اس ابتدائی بند میں موسمِ بہار کے حوالے سے خوب صورت منظر کشی کی ہے اور یہ اردو زبان کی پوری نیچرل شاعری میں انتہائی انفرادیت کی حامل نظر آتی ہے۔ کہتے ہیں کہ موسمِ بہار کی آمد ہے اور پہاڑوں کے دامن میں اس طرح رنگ برنگے پھول نشو و نما پا رہے ہیں کہ ان کو دیکھ کر باغِ اِرم کا گمان ہوتا ہے۔ اس باغِ ارم میں گلاب، نرگس، سوسن و نسرین کے علاوہ ’’لالہ‘‘ کے پھول اپنی بہار دکھا رہے ہیں اور ان کا وجود نگاہوں کو خیرہ کیے دیتا ہے۔ ساری کائنات اُنہی رنگا رنگ پھولوں میں چھپ کر رہ گئی ہے، ان کے حُسن نے اس کو مسرور و مسحور کر دیا ہے۔ فضا نیلی نیلی ہے اور ہوا میں ایک سُرور ہے۔ کوہستانی ندی اُچھلتی، کودتی، پہاڑوں کو چیرتی بہ رہی ہے۔ یہ ندی حرکت اور زندگی کی علامت ہے۔ ایسے خوب صورت منظر میں وہ دعا کرتے ہیں کہ اے اللہ مجھے ایسی شراب پلا دے جو حجاب کے پردوں کو جلا دے۔ وہ حجابات جو عقلِ انسانی اور حقیقتِ مطلق کے درمیان حائل ہیں، ایسی مَے جس کو پی کر میں کائنات کے حقائق سے آگہی حاصل کروں اور حیات کے اسرار و رموز مجھ پر عیاں ہوں۔ ان رازوں کے انکشاف سے عشقِ الٰہی سے سرشار انسان میں ایسی قوت و طاقت آجاتی ہے کہ وہ عناصرِ کائنات، مظاہرِ فطرت اور زمان و مکان پر قابو پالیتا ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے ممولا شہباز سے ٹکرائے۔ بظاہر معمولی سا انسان (ممولا) اتنی بڑی کائنات (شہباز) کو تسخیر کرنے کا عزم اپنے اندر پاتا ہے۔ یہ طاقت اسے عشقِ الٰہی سے ملتی ہے۔

﴿دوسرا بند﴾ دوسرے بند میں وہ حالاتِ حاضرہ اور مسلمانوں کے موقف کو پیش کرتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہر جگہ حرکت و انقلاب ہے، انسان کے طرزِ زندگی میں بڑی عظیم تبدیلیاں آئی ہیں، زمانے نے اپنے انداز کو بدل دیا ہے، شاہی دَور کا خاتمہ ہو گیا ہے۔ سرمایہ داری کی بنیادی ہل گئی ہیں۔ ملوکیت سے لوگ بے زار ہو گئے ہیں اس کی جگہ اشتراکیت نے لے لی ہے۔ چین جو صدیوں سے بادشاہت کی لعنت میں گرفتار تھا وہاں ایک انقلاب رونما ہو گیا ہے۔ فلسطین، شام، عراق اور حجاز مغرب کے خلاف لڑتے ہوئے تائیدِ غیبی اور معجزے کے منتظر ہیں۔ مسلماں اس میں شک نہیں کہ توحید پرست ہیں لیکن ان کے تہذیب و تمدن میں غیر اسلامی رسومات داخل ہو چکی ہیں۔ تصوّف پر ویدانت کے فلسفے کا اثر ہے جو بے عملی اور ترکِ دنیا کی شکل میں ظہور پذیر ہو رہا ہے۔ شریعت یعنی عقائد و عبادات پر غیر اسلامی باتیں اثر انداز ہو رہی ہیں جنہیں بعض جوازوں کے ساتھ قبول کیا جا رہا ہے۔ مسلمان فضول مسائل میں اُلجھ کر اپنا وقت اور طاقت برباد کر رہے ہیں۔ غیر اسلامی عقائد و افکار کی بنا پر مسلمان قوم اسلام کی روح سے بے گانہ ہوتی جا رہی ہے، عشق کی آگ سرد پڑ گئی ہے اور مسلمان راکھ کا ڈھیر بن کر رہ گئے ہیں۔

﴿تیسرا بند﴾ اس بند کے اشعار میں ایک بار پھر منظر نامہ تبدیل ہوجاتا ہے اور اقبال دعائیہ انداز میں خدائے ذوالجلال سے مکالمہ کرتے نظر آتے ہیں۔ کہ خداوندا! مجھے ایک بار پھر عشقِ محمد مصطفیٰ ﷺ کی دولت سے نواز دے۔ یہی میرا سرمایۂ حیات اور جزوِ ایمان ہے۔ پھر ملّت کے نوجوانوں کے لئے دعا کرتے ہیں کہ اے اللہ انہیں حرکت وعمل کی توفیق عطا فرما۔ پھر وہ کہتے ہیں ان کے اندر جو عشق کی آگ ہے اور جو بے خوابیاں، آرزوئیں، اُمنگیں، اُمیدیں، جستجوئیں، اور بے تابیاں ہیں یہی ان کا سب کچھ ہے۔ یہی ان کی دولت ہے اور اس دولت کو وہ اپنی قوم پر لُٹانا چاہتے ہیں تاکہ ان میں وہ ساری خوبیاں پیدا ہوجائیں اور وہ اپنی قوم کے لئے مٹ جانے کو تیار رہیں۔

﴿چوتھا بند﴾ چوتھے بند میں اقبالؔ کہتے ہیں کہ زندگی ہر دَم متحرک ہے اور ہر شے میں ارتقائی عمل جاری ہے۔ اللہ نے زندگی اور کائنات دونوں کو ترقّی پذیر بنایا ہے جس طرح شعلے میں دھوئیں کی موج چھپی ہوئی ہے اسی طرح زندگی کی وجہ سے جسم کا وجود بھی نشو ونما پا رہا ہے جسم کے بغیر زندگی بھی ترقی نہیں کرسکتی۔ اقبالؔ کہتے ہیں کہ زندگی ثابت بھی ہے اور سیار بھی ہے۔ یعنی اس میں دو متضاد خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ یعنی متحرک بھی اور غیر متحرک بھی۔ زندگی عناصر میں گرفتار ہے اس لئے اس سے بے زار ہے۔ آب و گل یعنی مٹّی اور پانی کی صحبت بھی اسے گراں گزرتی ہے لیکن پانی اور مٹّی سے محنت کرکے وہ بہت کچھ پاتا بھی ہے۔ وحدتِ حیات کثرتِ مظاہر میں جلوہ گر ہوتی ہے۔ یہ دنیا جسے بت خانۂ شش جہت بھی کہتے ہیں حیات کی وجہ سے وجود میں آئی ہے۔ زندگی نے ہی عالم کے اس بت (سومنات) کو تراشا ہے۔ یعنی عالم ایک ایسا بت ہے جسے زندگی نے تراشا ہے۔ زندگی تکرار کو پسند نہیں کرتی۔ کوئی فرد کسی سے ملتا جلتا نہیں ہے۔ سب ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ زندگی میں اتنا تنوع ہے۔ زندگی انجمن بھی ہے اور محفل میں خلوت نشیں بھی ہے۔ افراد کبھی انجمن بن جاتے ہیں کبھی بھیڑ میں تنہا ہوجاتے ہیں۔ زندگی کے کئی رنگ ہیں۔ زندگی ہر شے میں ہے، بجلی، تارے، چاندی، سونے، پارے، بیاباں، ببول، کانٹے، پھول، کہسار، جبریل، حور، شاہین، چکور اور کبوتر سب کے سب زندگی کے مختلف مظاہر ہیں۔

﴿پانچواں بند﴾ اس بند کے اشعار میں علامہ اقبالؔ مزید ایک قدم آگے دکھائی دیتے ہیں۔ ان کی فکر ونظر میں زندگی کی کچھ ایسی حقیقتیں بھی ہیں جو عمومی سطح پر انسانوں کی نظروں سے پوشیدہ رہتی ہیں۔ وہ انسانوں کے لئے حرکت وعمل کا فلسفہ پیش کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہر شے میں حرکت ہے اور یہ وجود نئی نئی شکلیں اور صورتیں اختیار کرتا ہے۔ یہ تغیر بھی حرکت کی دین ہے۔ جو لوگ زندگی کی حقیقت سے بے خبر ہیں وہ اسے ایک راز سمجھتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ ذوقِ پرواز ہی زندگی ہے۔ زندگی ہر وقت سفر میں رہتی ہے اور مختلف منزلیں طے کرتی جاتی ہے وہ کبھی حضر (قیام کرنا) نہیں کرتی۔ بظاہر ایسا لگتا ہے کہ زندگی حضر میں ہے لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔ زندگی تصادم، ہنگامے اور ٹکراؤ میں لذّت محسوس کرتی ہے۔ زندگی اپنے ماحول سے جنگ کرتی ہے۔ مشکلات سے مقابلہ کرتی ہے۔

زندگی کی سب سے بڑی مخالف موت ہے لیکن زندگی نے موت پر بھی بڑی حد تک قابو پالیا۔ یعنی ایسے خطرات جو موت کا باعث بن سکتے ہیں جیسے درندے، زہریلے کیڑے، موسم کی سختیاں اور امراض وغیرہ۔ انسان کے پاس مذاقِ دوئی یعنی نر اور مادہ کا امتیاز بھی ہے، اسی طرح اس نے زوج سے فوج تیار کرلی۔ زندگی بے ثبات نہیں ہے ایک نقش مٹتا ہے تو دوسرا اُبھرتا ہے۔ یعنی کوئی مرتا ہے تو کوئی پیدا ہوتا ہے۔ اس طرح زندگی جاری وساری رہتی ہے۔ زمانہ جسے کہتے ہیں وہ دراصل شب وروز کی ایک زنجیر ہے اسی طرح زندگی بھی دَموں کے اُلٹ پھیر کا نام ہے۔

﴿چھٹا بند﴾ یہ بند پورا خودی کی ماہیت ووضاحت پیش کرتا ہے۔علامہ اقبالؔ کہتے ہیں کہ زندگی کی سب سے خوب صورت اور اعلیٰ شکل خودی ہے۔زندگی اگر تلوار ہے تو خودی تلوار کی دھار ہے۔جس طرح دھار کے بغیر تلوار بے مصرف ہے۔اسی طرح خودی کے بغیر زندگی بے معنی ہے۔خودی کے بغیر کائنات بیدار نہیں ہوسکتی۔کائنات کی خودی انسان اشرف المخلوقات ہے۔انسان کو اپنی خودی پہچاننے کے لئے مراقبے یا دھیان گیان کی ضرورت ہوتی ہے جو صرف خلوت یعنی تنہائی میں ممکن ہے۔اس کے لئے مظاہرِ کائنات سے اپنا تعلق توڑ کر پوری توجہ اپنی ذات پر مرکوز کرنے کی ضرورت ہے۔انسان ایک بوند کی طرح ہے اور خالقِ کائنات سمندر ہے۔پانی کی ایک بوند میں سمندر نظر آنے لگتا ہے پھر اندھیرے اور اُجالے میں، میں اور تُو کا فرق مٹ جاتا ہے اور سارے پردے جو درمیان میں حائل ہوتے ہیں وہ ہٹ جاتے ہیں۔

خودی زمان ومکان کی قید میں رہ کر ترقّی کرتی ہے اور جب نقطۂ کمال کو پہنچ جاتی ہے تو پھر ساری حدیں مٹ جاتی ہیں اور زمان و مکان سے ماورا ہوجاتی ہے لیکن اس نقطۂ کمال کو پہنچنے کے لئے اسے کئی معرکے سَر کرنے پڑتے ہیں۔مسلسل سفر اسے قوّت اور استحکام بخشتا ہے اور وہ جب قوّت حاصل کرلیتی ہے تو پہاڑوں کو ریزہ ریزہ کرسکتی ہے۔خودی کئی صورتوں میں موجود ہے لیکن اس میں کوئی صورت نہیں ہے وہ غیر مادی ہے۔کبھی وہ چاند میں کرن بن کر، کبھی پتھر میں چنگاری بن کر ظاہر ہوتی ہے۔خودی اَزل سے ارتقائی منازل طے کرتی آرہی ہے۔ آخر کار وہ خاکِ آدم میں صورت پذیر ہوئی۔یہ سوال ذہن میں آسکتا ہے کہ خودی اگر لامحدود ہے تو پھر وہ انسان کے دِل میں کیسے سما سکتی ہے؟ علامہ اقبالؔ اس کی بڑی خوب صورت سی مثال دیتے ہیں کہ جس طرح آنکھ کے تِل میں فلک سما سکتا ہے۔اسی طرح انسان کے دل میں خودی سما سکتی ہے اور یہی اس کا مسکن ونشیمن ہے۔

﴿ساتواں بند﴾ شاعرِ مشرق نے اس بند کے اشعار میں فلسفۂ خودی کے اوصاف ومحاسن کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔عملاً یہ موضوع ان کا پسندیدہ ہے جس کے حوالے سے بے شمار اشعار اور اردو نظمیں انہوں نے تخلیق کی ہیں۔چنانچہ فرماتے ہیں جذبۂ خودی کو اَوجِ کمال پر پہنچانے کے لئے لازم ہے کہ خودی کے تحفظ کا دعویٰ کرنے والا شخص رزقِ حلال سے خود کو آسودہ کرے، کیوں کہ رزقِ حرام اور ناجائز کمائی سے تو خودی کی موت واقع ہوجاتی ہے۔جس طرح زہر کھانے سے آدمی مرجاتا ہے اسی طرح لقمۂ حرام کھانے سے خودی کی موت واقع ہوتی ہے۔خودی کے استحکام کی دوسری شرط غیر اللہ کی غلامی سے پرہیز کرنا ہے۔مسلمان صرف اللہ کو سجدہ کرے پھر اسے دوسروں کے سامنے سجدہ کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہے گی۔اللہ کے سوا دوسروں کو سجدہ کرنا حرام ہے۔اقبالؔ کہتے ہیں کہ یہ دنیا کے ہنگامے عارضی ہیں۔یہ عالَم جہاں زندگی کا مقصد صرف خورد ونوش (کھانا پینا) ہے یہ کائنات خودی کی پہلی منزل ہے۔یہ مستقل ٹھکانہ نہیں ہے۔تو اس خاک دان سے آگ حاصل نہیں کرسکتا۔یہ دنیا تیرے لئے پیدا کی گئی ہے تو دنیا کے لئے پیدا نہیں کیا گیا۔یہ کائنات اس لئے بنائی گئی ہے کہ تو اس کو تسخیر کرے۔وہ کہتے ہیں کہ کائنات پر فتح حاصل کرکے آگے بڑھنا چاہیے۔اس کے علاوہ اور جہاں بھی ہیں جنہیں دریافت کرنا ہے ان پر یلغار کرنا ہے۔اس کائنات میں جتنی چیزیں ہیں جیسے دن اور رات، موسموں کی تبدیلی، نظامِ شمسی وغیرہ صرف اس لئے ہیں کہ تو اپنی خودی کی قوّتوں کو استعمال کرکے اپنی چھپی ہوئی صلاحیتوں سے باخبر ہوکر اپنا مقام حاصل کرے۔اقبالؔ انسان کو اس کی حقیقت بتاتے ہوئے کہتے ہیں کہ تو

فاتحِ عالَم ہے۔ تیری حقیقت کی وضاحت کے لئے میرے پاس مناسب الفاظ نہیں۔ حقیقت ایک آئینے کی طرح ہے اور الفاظ رنگ کی طرح ہیں۔ تیری حقیقت بیان کرنے کی طاقت لفظوں میں ہے اگر چہ میں اسے سمجھ سکتا ہوں۔

اقبالؔ کا مقصد انسان کو اپنی حقیقت سے آگاہ کرانا ہے۔ تو خود اپنے من میں ڈوب جا۔ یعنی تو اگر اپنی جستجو کرے گا تو وہ (خدا) تجھے مل جائے گا۔ اب اظہار و گفتار کی طاقت مجھ میں نہیں ہے کیوں کہ میرا سینہ جذبات کی شدت سے پھٹا پڑتا ہے لیکن یہ موضوع ایسا نہیں جس پر مزید گفتگو کی جائے۔ پھر خدشہ اس امر کا بھی ہے کہ اگر اپنی حدود سے بڑھتے ہوئے عشقِ حقیقی کے راز افشا کر دوں تو قادرِ مطلق کو یہ گوارا نہ ہوگا اور وہ مجھے جلا کر خاک کر دے گا۔

07.09 نظم ''جبریل و ابلیس'' متن

جبریل

ہمدمِ دیرینہ ! کیسا ہے جہانِ رنگ و بو

ابلیس

سوز و ساز و درد و داغ و جستجو و آرزو

جبریل

ہر گھڑی افلاک پر رہتی ہے تیری گفتگو کیا نہیں ممکن کہ تیرا چاک دامن ہو رفو؟

ابلیس

آہ اے جبریل تو واقف نہیں اس راز سے کر گیا سرمست مجھ کو ٹوٹ کر میرا سبُو!
اب یہاں میری گذر ممکن نہیں ممکن نہیں کس قدر خاموش ہے یہ عالَمِ بے کاخ و کُو!
جس کی نومیدی سے ہو سوزِ درونِ کائنات اس کے حق میں **قَنَطُوا** اچھا ہے یا **لَاتَقنَطُوا**!

جبریل

کھو دیے انکار سے تو نے مقاماتِ بلند چشمِ یزداں میں فرشتوں کی رہی کیا آبرو!

ابلیس

ہے مری جرأت سے مشتِ خاک میں ذوقِ نمو میرے فتنے جامۂ عقل و خرد کا تار و پو!
دیکھتا ہے تو فقط ساحل سے رَزمِ خیر و شر کون طوفاں کے طمانچے کھا رہا ہے؟ میں کہ تو!
خضر بھی بے دست و پا، الیاس بھی بے دست و پا میرے طوفاں یم بہ یم، دریا بہ دریا، جُو بہ جُو!
گر کبھی خلوت میسر ہو تو پوچھ اللہ سے قصۂ آدم کو رنگیں کر گیا کِس کا لہو!
میں کھٹکتا ہوں دلِ یزداں میں کانٹے کی طرح تو فقط ! اللہ ھُو ، اللہ ھُو اللہ ھُو

07.10 نظم ''جبریل وابلیس'' تجزیہ

حضرت جبریل علیہ السلام فرماتے ہیں کہ اے ہمدمِ دیرینہ! یعنی میرے قدیم دوست! تو نے اس رنگ برنگی اور خوشبوؤں سے بھری دنیا کو کیسا پایا تو ابلیسِ لعین، حضرت جبریل علیہ السلام کو جواب دیتا ہے کہ یہ دنیا جو ہے اس میں سوز، ساز، درد، داغ، جستجو اور آرزوؤں کا خزانہ ہے۔ پھر حضرت جبریل علیہ السلام فرماتے ہیں کہ آسمانوں پر ہمہ وقت تو ہی موضوعِ سخن رہتا ہے کیا اب ایسا نہیں ہوسکتا کہ جو تو نے گناہ کیا ہے اس گناہ کی معافی کی درخواست کرے تو اللہ تعالیٰ تیری خطا کو دَرگزر کردے۔ افسوس صد افسوس! جبرئیل! آپ اس راز سے واقف نہیں کہ میرا سبو ہی ٹوٹ کر مجھ کو سرمست کر گیا ہے اور اب یہاں پر میری گزر ممکن نہیں، ہرگز ممکن نہیں کیوں کہ یہ محلات و کوچے کے بغیر یہ دنیا کس قدر خاموش ہے۔ جس کی ناامیدی سے کائنات کے اندر سوز پیدا ہوا اس کے حق میں اُمید ہی اچھی ہے یا نا اُمیدی؟ پھر حضرت جبریل کہتے ہیں کہ اے ابلیس! تو حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے سے انکار کر کے ملعون و مردود ہو گیا اور تو نے مقاماتِ بلند کھو دیے اور اب تو ہی بتا کہ چشم یزداں میں فرشتوں کی کیا آبرو رہی ہے۔ پھر ابلیس کہتا ہے کہ میری جرأت سے خاک کی مٹھی (انسان) میں بلندیوں پر جانے کا ذوق و شوق پیدا ہوا ہے اور میرے فتنے عقل و خرد کے جاموں کا تانا بانا ہیں اور کہتا ہے کہ تو فقط ساحل سے خیر و شر کی لڑائی دیکھ رہا ہے اب یہ بتا کہ طوفانوں کے طمانچے (لعنتیں) کون کھا رہا ہے، میں یا تو؟ یہاں تو خضر بھی بے دست و پا ہیں اور حضرت الیاس بھی اور میرے طوفان تمام سمندر، تمام دریاؤں کے کنارے تک رواں دواں ہیں اور ابلیس کہتا ہے کہ جبریل! کبھی آپ کو تنہائی میسر ہو تو اللہ رب العزت سے پوچھنا کہ آخر حضرت آدم علیہ السلام کے قصے کو کس کے لہو (قربانی) سے رنگین کیا گیا یعنی حضرت آدم علیہ السلام کو جو رتبہ ملا وہ کس کی بنا پر ملا۔ اور میں تو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں ایک کانٹے کی طرح کھٹکتا ہوں اور تو فقط اللہ اللہ کرتا رہتا ہے!

07.11 خلاصہ

اس اکائی میں آپ نے علامہ اقبالؔ کی حیات اور کارنامے سے متعلق اپنی معلومات میں مزید اضافہ کیا اور ان کی قومی و وطنی شاعری پر ان کے افکار کو جانا اور شخصی شاعری کے ذریعے ان مختلف شخصیات کے بارے میں بھی جانا جو کہ اپنے زمانے میں یکتائے روزگار تھے اور ان کی نظم نگاری پر بھی تفصیل سے جانا اور اس کے ساتھ ساتھ نظمِ اقبالؔ کا فنی جائزہ بھی پیش کیا گیا اور ان کی دو مشہور و معروف نظمیں ''ساقی نامہ'' اور ''جبریل و ابلیس'' کا متن و تجزیہ تحریر کیا گیا ہے۔ علامہ اقبالؔ کے اردو شاعری میں چار مجموعے ''بانگِ درا، بالِ جبریل، ضربِ کلیم اور ارمغانِ حجاز'' شائع ہوئے۔ فارسی شعری مجموعوں میں ''اسرارِ خودی، رموزِ بے خودی، پیامِ مشرق، زبورِ عجم اور جاوید نامہ'' قابلِ ذکر ہیں۔ اقبالؔ کے پہلے شعری مجموعے ''بانگِ درا'' میں حُسنِ فطرت سے دل چسپی اور حُبُّ الوطنی کے جذبات نمایاں ہیں۔ ''بالِ جبریل'' میں مفکرانہ، ''ضربِ کلیم'' اور ''ارمغانِ حجاز'' کی نظموں میں ڈرامائی اور خطیبانہ رنگ حاوی نظر آتا ہے۔ اقبالؔ کی شاعری میں جو فلسفہ ملتا ہے اس کے اہم نکات خودی، عشق، فقر اور عمل ہیں۔ اقبالؔ کا تصوّراتی انسان ''مردِ مومن'' ہے۔ اقبالؔ سوز و خلوص پر زور دیتے ہیں اور وہ اسے خونِ جگر سے تعبیر کرتے ہیں۔ اقبالؔ کی ایک اہم اور طویل نظم ساقی نامہ ہے کہ جس میں اقبالؔ کا پورا فلسفہ سمٹ آیا ہے۔ جب کہ ''جبریل و ابلیس'' ایک ڈرامائی مختصر نظم ہے جس میں علامہ اقبالؔ ''جبریل و ابلیس'' میں مکالمہ کراتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم ''جبریل و ابلیس'' کو اپنے دل کے پردۂ سیمیں پر منعکس ہوتے ہوئے دیکھ رہے ہیں۔ خلاصۂ کلام یہ ہے کہ یہ دونوں نظمیں اپنے آپ میں آفتاب و ماہتاب کی حیثیت رکھتی ہیں۔

07.12 فرہنگ

اِرم : خوب صورت باغ

بُتانِ عجم : غیر اسلامی طور طریقے

تابِ گفتار : بات کرنے کی طاقت وہمت

تصوّف : روحانیت

تفہیم : سمجھنا یا سمجھانا

تنوّع : قسم قسم کے

تیز جولاں : تیز دوڑنے والی

جوے کہستان : پہاڑی ندی

جہانِ مکافات : جزا اور سزا کی دنیا

چنگ : ایک قسم کا باجہ

حُبُّ الوطنی : وطن کی محبت

خصوصیات : خصوصیت کی جمع، وصف

خیمہ زن : خیمہ لگا کر رہنا

دامنِ کوہسار : پہاڑ کی وادی

دل کش : دل کو کھینچنے والا

دَمادَم : لگاتار، مسلسل

دُود : دھواں

دیر وحرم : مندر ومسجد

رَم : ڈر کر بھاگنے کی حالت

زہرناب : خالص زہر

زنگ : مَیل

زُنّار پوش : غیر اسلامی عادتیں

سبک : ہلکا

سرشار : خمار، سرمست

سرنوشت : تقدیر

سوز وساز : جوش وجذبۂ عشق

سوسن : ایک نیلے رنگ کا پھول

شارح : تشریح کرنے والا

شرابِ کہن : عشقِ حقیقی کا جذبہ

شیشہ باز : فریبی

صید : شکار

صقلیہ : ایک جزیرہ

عالَمِ خوب وزشت : اچھے اور برے کی دنیا مراد دنیا

عجم کے خیالات : غیر اسلامی خیالات

غائبانہ : باطنی طور پر

فروفال : شان وشوکت

فلاحِ قوم : قوم کی کامیابی

کوہِ گراں : بھاری پہاڑ

گداز : سوز، تپش، نرمی

گرم جوش : پُر جوش

مِرا قافلہ : مراد ملتِ اسلامیہ

مَرغزار : جانوروں کے چرنے کی جگہ، سبزہ زار

معاون : مددگار

منطق : فلسفیانہ باتیں

ناصبور : بے چین

نسترن : سیوتی کا پھول

لذّتِ شوق : عشقِ حقیقی کا جذبہ

یمِ زندگی : زندگی کا دریا

07.13 سوالات

مختصر سوالات

سوال نمبر۱ : جبریل وابلیس کا تجزیہ اپنے الفاظ میں پیش کیجیے۔

سوال نمبر۲ : علامہ اقبالؔ کی سوانح حیات اپنے الفاظ میں لکھیے ۔

سوال نمبر۳ : علامہ اقبالؔ کی قومی و وطنی شاعری پر اپنے خیالات کا اظہار کیجیے۔

سوال نمبر۴ : علامہ اقبالؔ کی پیکر تراشی کو پیش کرتے ہوئے اس کی مثالیں دیجیے۔

تفصیلی سوالات

سوال نمبر۱ : علامہ اقبالؔ کی شاعری کی خصوصیات بیان کیجیے۔

سوال نمبر۲ : علامہ اقبالؔ کی شخصی شاعری پر ایک مفصل مضمون لکھیے ۔

سوال نمبر۳ : علامہ اقبالؔ کی نظم نگاری پر ایک مفصل مضمون تحریر کیجیے۔

سوال نمبر۴ : علامہ اقبالؔ نے جو پیغام ساقی نامہ کے ذریعے دیا اس کو بیان کیجیے۔

معروضی سوالات

سوال نمبر۱ : علامہ اقبالؔ نے کس شاعر سے شرفِ تلمّذ حاصل کیا؟

(الف) میر حسن (ب) داغ (ج) امیر مینائی (د) شیخ نور محمد

سوال نمبر۲ : علامہ اقبالؔ نے کس یونی ورسٹی سے پی ایچ۔ڈی کی ڈگری حاصل کی؟

(الف) آکسفورڈ یونی ورسٹی (ب) پنجاب یونی ورسٹی (ج) میونخ یونی ورسٹی (د) ایران یونی ورسٹی

سوال نمبر۳ : علامہ اقبالؔ کی مثنوی اسرارِ خودی کا ترجمہ کس نے کیا؟

(الف) آر.اے.نکلسن (ب) آرنلڈ (ج) سر عبدالقادر (د) دیگر

سوال نمبر۴ : علامہ اقبالؔ کی پہلی مطبوعہ نظم کون سی ہے؟

(الف) فلاحِ قوم (ب) نالۂ یتیم (ج) ہمالہ (د) ایک آرزو

سوال نمبر۵ : علامہ اقبالؔ کا کون سا مجموعہ کلام فارسی میں ہے؟

(الف) پیامِ مشرق (ب) بانگِ درا (ج) بالِ جبریل (د) ارمغانِ حجاز

سوال نمبر۶ : علامہ اقبالؔ کی پہلی طویل نظم کون سی ہے؟

(الف) ہمالہ (ب) لالۂ صحرا (ج) شکوہ (د) فنونِ لطیفہ

سوال نمبر۷ : علامہ اقبالؔ کی نظم ''ساقی نامہ'' میں کتنے بند ہیں؟

(الف) ۶ (ب) ۷ (ج) ۸ (د) ۹

سوال نمبر۸ : علامہ اقبالؔ نے کس بند میں ''خودی'' کے بارے میں وضاحت کی؟

(الف) چوتھے (ب) پانچویں (ج) چھٹے (د) ساتویں

سوال نمبر۹ : علامہ اقبالؔ یورپ کس سنہ میں گئے

(الف) ۱۹۰۴ء (ب) ۱۹۰۵ء (ج) ۱۹۰۶ء (د) ۱۹۰۷ء

سوال نمبر۱۰ : نظم ''ساقی نامہ'' کس مجموعۂ کلام میں شامل ہے؟

(الف) بانگِ درا (ب) بالِ جبریل (ج) ضربِ کلیم (د) ارمغانِ حجاز

معروضی سوالات کے جوابات

جواب نمبر۱ : (ب) داغؔ
جواب نمبر۲ : (ج) میونخ یونی ورسٹی
جواب نمبر۳ : (الف) آر.اے.نکلسن
جواب نمبر۴ : (ج) ہمالہ
جواب نمبر۵ : (الف) پیامِ مشرق
جواب نمبر۶ : (ج) شکوہ
جواب نمبر۷ : (ب) ۷
جواب نمبر۸ : (ج) چھٹے
جواب نمبر۹ : (ب) ۱۹۰۵ء
جواب نمبر۱۰ : (ب) بالِ جبریل

07.14 حوالہ جاتی کتب

۱۔ اردو شاعری کا تنقیدی مطالعہ از سنبل نگار
۲۔ دانشورِ اقبالؔ از آل احمد سرور
۳۔ جدید نظم حالیؔ سے میراجیؔ تک از کوثر مظہری
۴۔ اقبالؔ کی عصری معنویت از ڈاکٹر مشتاق احمد
۵۔ کلیاتِ اقبالؔ از علامہ اقبالؔ

اکائی 08 : جوشؔ ملیح آبادی ''بدلی کا چاند، شکستِ زنداں کا خواب''

ساخت :

08.01 : اغراض ومقاصد

08.02 : تمہید

08.03 : شبیر حسن خاں جوشؔ ملیح آبادی کے حالاتِ زندگی

08.04 : شبیر حسن خاں جوشؔ ملیح آبادی کی نظم نگاری

08.05 : نظم ''بدلی کا چاند'' متن

08.06 : نظم ''بدلی کا چاند'' تجزیہ

08.07 : نظم ''شکستِ زنداں کا خواب'' متن

08.08 : نظم ''شکستِ زنداں کا خواب'' تجزیہ

08.09 : خلاصہ

08.10 : فرہنگ

08.11 : سوالات

08.12 : حوالہ جاتی کتب

08.01 اغراض ومقاصد

آپ اس اکائی کے مطالعے سے شبیر حسن خاں جوشؔ ملیح آبادی کی حیات، تعلیم وتربیت، شخصیت، ملازمت، کارنامے اور ان کی ہجرت کے بارے میں جان سکیں گے اور اس کے ساتھ ساتھ ان کی نظم نگاری، اس کی خصوصیات اور ان کی اہم نظموں ''بدلی کا چاند، شکستِ زنداں کا خواب'' کا مطالعہ کیا کریں گے اور اس اکائی کے مطالعے سے جوشؔ کی شاعری کے پس منظر کا بھی علم ہو سکے گا۔ اردو شاعری میں خصوصاً نظم نگاری میں ان کی نمایاں شاعرانہ خدمات، حیثیت، مقام ومرتبے اور فنّی خصوصیات سے متعلق معلومات حاصل کر سکیں گے۔

08.02 تمہید

اردو شاعری میں علامہ اقبالؔ کے بعد جو دو بڑے نام سامنے آتے ہیں ان میں زمانی ترتیب کے اعتبار سے شبیر حسن خاں جوشؔ ملیح آبادی کو دوسرا بڑا شاعر ہونے کا شرف حاصل ہے۔ اردو کے جدید شاعروں میں شبیر حسن خاں جوشؔ ملیح آبادی کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ انہوں نے جدید شاعری میں بعض بہت ہی اہم اضافے کیے ہیں۔ آپ نے اس کے میدان کو وسیع کیا ہے۔ اس کے کینوس میں وسعتیں پیدا کی ہیں۔ ان کی شاعری میں تنوّع اور رنگارنگی کا پہلو بہت صاف نظر آتا ہے۔ وہ بیک وقت شاعرِ شباب اور شاعرِ انقلاب بھی ہیں۔

انہوں نے جذباتی و رومانی شاعری بھی کی ہے اور حقیقت و واقعیت کو بھی اپنا موضوع بنایا ہے۔ وہ انسانی زندگی کے ہر گوشے پر بڑی گہری نظر رکھتے ہیں۔ بعض بہت ہی معمولی اور چھوٹی چھوٹی باتوں کو بھی انہوں نے شاعری کے قالب میں ڈھال دیا ہے۔ فکری اور فلسفیانہ پہلو بھی ان کی شاعری میں نمایاں ہیں۔ سماجی و عمرانی معاملات کی تصویر کشی بھی بڑے خوب صورت انداز میں پیش کی ہے۔ انسان دوستی کی لہر ان کی شاعری میں ہے۔ ان کے یہاں زندگی کا ایک بہت واضح نقطۂ نظر بھی ملتا ہے۔ وہ ایک مکمل نظریۂ حیات بھی رکھتے ہیں۔ فنّی و جمالیاتی پہلو بھی ان کی شاعری میں اپنے شباب پر نظر آتا ہے۔ وہ ایک بہت بڑے فن کار ہیں۔ ان کے تخیّل کی بلندی کا کوئی ٹھکانہ نہیں۔ اس تخیّل سے انہوں نے طرح طرح کی گُل کاریاں کی ہیں۔ ایک نئی امیجری پیدا کرنا ان کی شاعری کی نمایاں خصوصیت ہے۔ اپنی تشبیہات و استعارات سے انہوں نے ایک نگار خانہ بنایا ہے۔ انہوں نے الفاظ سے جادو جگائے ہیں۔ وہ الفاظ کے بہت بڑے ماہر اور زبان کے بہت اچھے مزاج داں ہیں۔

غرض جوشؔ کی شاعری بڑی پہلو دار شاعری ہے۔ اس میں تنوّع اور رنگا رنگی ہے، وسعت اور ہمہ گیری ہے، گہرائی اور گیرائی ہے۔ وہ بڑی ہی رنگین اور پر کار ہے۔ اس میں بڑا رَس اور بڑی ہی رعنائی ہے۔ اس کے حُسن کا کوئی جواب نہیں۔ وہ بلا کی دل آویز ہے اس کو ایک بتِ ہزار شیوہ کہا جائے تو بے جا نہیں۔ انہوں نے نظم اور مسلسل غزل دونوں میں ایسی رومانی شاعری کی ہے جسے اردو کی اعلیٰ ترین رومانی شاعر کہا جا سکتا ہے۔ جوشؔ شاعرِ انقلاب بھی ہیں۔ انہوں نے برطانوی حکومت کے خلاف بغاوت کی زبردست آواز بلند کی اور انقلاب کے ایسے نعرے لگائے کہ ان کا یہ شعر عوام و خواص سب کی زبان پر تھا:

کام ہے میرا تغیّر ، نام ہے میرا شباب
میرا نعرہ انقلاب و انقلاب و انقلاب

چنانچہ جنگِ آزادی کے زمانے کی ان کی وطنی اور انقلابی شاعری کے تناظر میں ہندوستانی عوام نے انہیں ''شاعرِ انقلاب'' کے خطاب سے نوازا۔ میر انیسؔ کے بعد جوشؔ وہ واحد شاعر ہیں جنہیں زبان و بیان پر غیر معمولی قدرت حاصل تھی۔ ان کے پاس الفاظ کا بیش بہا ذخیرہ تھا۔ عشق و محبت، رومانی شاعری اور فطرت نگاری کے لئے وہ جو نرم اور سبک الفاظ استعمال کرتے ہیں ان میں پھولوں کی سی خوشبو ہوتی ہے اور جب انقلابی شاعر کی حیثیت سے گرجتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ میدانِ جنگ میں گھمسان کی لڑائی ہو رہی ہے۔ الفاظ کی گھن گرج سے محسوس ہوتا ہے کہ زلزلہ آ گیا ہے۔ جوشؔ کی زبان دانی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ الفاظ ان کے سامنے قطار باندھے کھڑے رہتے تھے۔ انیسؔ کے بعد زبان پر سب سے زیادہ قدرت انہیں ہی حاصل تھی۔

08.03 شبیر حسن خاں جوشؔ ملیح آبادی کے حالاتِ زندگی

شبیر حسن خاں جوشؔ ملیح آبادی کے اجداد میں ایک بزرگ یار بیگ خاں درّۂ خیبر کے سرداروں میں سے تھے۔ یار بیگ خاں کے دو شہزادے تھے۔ ایک کا نام محمد نام دار خان اور دوسرے کا نام محمد بلند خان تھا۔ ان دونوں بھائیوں میں نام دار خان تو اپنے وطن ہی میں رہے لیکن محمد بلند خان اپنے دو بیٹوں (محمد عوض خان اور فقیر محمد خان) کے ساتھ ۱۸۱۹ء کے آس پاس ہندوستان آ کر قائم گنج اُتر پردیش میں آباد ہو گئے۔ پھر کچھ عرصے کے بعد وہ لکھنؤ منتقل ہو گئے جہاں نواب غازی الدین حیدر کی فوج میں تین سو روپے ماہ وار اُنہیں ملازمت مل گئی۔ نواب غازی الدین حیدر نے لکھنؤ کے پاس ملیح آباد میں انہیں کنول ہار نام کا ایک محلّہ دے دیا جہاں محمد بلند خاں نے اپنے اور ملازموں کے مکانات بنا دیے۔

محمد بلند خاں کے بڑے بیٹے محمد عوض خاں ریاستِ اندور چلے گئے۔ وہاں مہاراجا ہولکر کی فوج میں رسالہ دار کے عہدے پر فائز ہو گئے۔ تقریباً پانچ چھ سال بعد عوض خاں کے چھوٹے بیٹے فقیر محمد خاں بھی تعلیم سے فارغ ہو کر اندور آ گئے اور مہاراجا کی فوج میں رسالہ دار ہوئے۔ محمد عوض خاں تو اندور میں ہی رہے لیکن کچھ عرصے کے بعد فقیر محمد خاں، نواب میر خاں کے پاس ٹونک چلے گئے جہاں نواب نے اپنی فوج میں انہیں رسالہ دار مقرر کر دیا۔ کچھ عرصے کے بعد ٹونک کے نواب اور انگریزوں میں لڑائی ہوگئی اس لڑائی میں فقیر محمد خان بھی شریک تھے۔ انہوں نے ایسی بہادری اور دلیری سے کام لیا کہ دشمن کے چھکے چھوٹ گئے اور انگریزی فوج کے پاؤں اُکھڑ گئے۔ فقیر محمد خان اس لڑائی میں زخمی ہو گئے تھے۔ نواب میر خاں نے ان کی تیمارداری میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ دو تین مہینے میں فقیر محمد خان صحت یاب ہو گئے۔

کچھ دنوں کے بعد ٹونک کے نواب میر خاں نے فقیر محمد خاں کو حکم دیا کہ وہ جے پور اور بھوپال پر حملہ کریں۔ فقیر محمد خاں فوج لے کر وہاں پہونچے لیکن فوج کے سامنے جے پور کی رانی اور بیگم بھوپال دونوں نے صلح کے جھنڈے لہرا دیے۔ کچھ عرصے بعد فقیر محمد خاں، غازی الدین حیدر کے پاس لکھنؤ آ گئے جہاں انہیں پچیس ہزار سواروں کا رسالہ دار بنا دیا گیا۔ بعد میں ان کے سپرد وزراتِ مال بھی کر دی گئی۔ غازی الدین حیدر نے لکھنؤ کے گولہ گنج میں زمین کا ایک بہت بڑا ٹکڑا فقیر محمد خاں کو عنایت کیا جہاں فقیر محمد خاں نے اپنے اور اپنے سپاہیوں کے مکانات تعمیر کیے۔ فقیر محمد خاں فارسی اور اردو کے بہت مشہور شاعر تھے۔ گویاؔ ان کا تخلص تھا۔ پر دادا کے بعد ان کے دادا کے حال پر نظر کیجیے تو ان کے دادا کا نام محمد احمد خاں بہادر تھا۔ وراثت میں ان کو بے انتہا دولت ملی تھی۔ انہوں نے ملیح آباد میں رہائش کے لئے مکانات بنائے تھے۔ سخاوت و فیاضی کا بڑا چرچا تھا۔ غربا پر پیسہ بے دریغ خرچ کیا کرتے تھے۔ محمد احمد خاں بہت اچھے شاعر بھی تھے۔ آپ کے دیوان کا نام ''دیوانِ احمد'' تھا۔ یہ دیوان پانچ سو صفحات پر مشتمل تھا۔

﴿۱﴾ جوشؔ کی پیدائش: جوشؔ کے والد کا نام بشیر احمد خاں اور تخلص بشیرؔ تھا۔ بہت خوب صورت انسان تھے۔ فارسی زبان اور تاریخِ اسلام پر اُنہیں غیر معمولی قدرت حاصل تھی۔ سعدیؔ، حافظؔ اور فردوسیؔ کا پورا کلام اَزبر تھا۔ اردو ادب میں میر تقی میرؔ اور میر انیسؔ کے زبردست مدّاح تھے۔ شاعری میں پہلے مرزا داغؔ کے شاگرد ہوئے۔ اس کے بعد امیرؔ مینائی اور جلالؔ لکھنوی سے اصلاح لی۔ اپنے والد کی طرح یہ بھی بہت فیاض تھے۔ ان کی سرکار سے سیکڑوں بیواؤں، یتیموں اور بوڑھوں کو ماہانہ وظیفہ ملتا تھا۔

جوشؔ کی تاریخِ ولادت میں اختلاف ملتا ہے۔ کسی نے ۱۸۹۶ء اور کسی نے ۱۸۹۸ء لکھا ہے لیکن خود جوشؔ کا بیان ہے کہ وہ ۵/دسمبر ۱۸۹۸ء کو ملیح آباد میں پیدا ہوئے۔ جوشؔ کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ مولوی نیاز علی خاں نے انہیں فارسی، مولانا طاہر نے اردو، مولوی قدرت اللہ بیگ نے عربی اور ماسٹر گومتی پرساد نے انگریزی پڑھائی۔ جب گھر کی تعلیم مکمل ہوگئی تو انہیں سیتا پور بھیج دیا گیا جہاں فرنچ ایچ اسکول میں انہیں داخل کر دیا گیا۔ ڈیڑھ سال تک جوشؔ نے وہاں تعلیم حاصل کی اور پھر ان کے والد نے سیتا پور سے واپس بلا کر لکھنؤ کے حسین آباد اسکول میں داخل کر دیا جہاں جوشؔ نے چھٹی اور ساتویں کے امتحان ایک ساتھ دیے اور آٹھویں کلاس میں داخل ہو گئے۔ ۱۹۱۲ء میں انہیں علی گڑھ بھیج دیا گیا اور ایم۔اے۔او کالج میں داخل کرا دیا گیا۔ شرارتوں کی وجہ سے علی گڑھ کالج سے نکالے گئے اور پھر واپس آئے اور یہاں جوبلی ہائی اسکول میں داخل ہو گئے۔ اس کے بعد وہ اسی شہر میں چرچ مشن اسکول اور ریڈ کرسچین کالجیٹ اسکول میں داخل ہو گئے۔ لکھنؤ میں قیام کے دوران انہوں نے مرزا ہادی رسواؔ سے عربی و فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ لکھنؤ سے جوشؔ پیٹرز کالج آگرہ چلے گئے۔

جوشؔ آگرہ میں ہی زیرِ تعلیم تھے کہ ان کے والدِ محترم کا انتقال ہوگیا۔ یہ واقعہ ۱۹۱۶ء کا ہے۔ آگرہ میں جوشؔ نے سینئر کیمبرج میں تعلیم حاصل کی۔ جوشؔ ملیح آبادی نے اپنی خودنوشت سوانح ''یادوں کی بارات'' میں لکھا ہے کہ وہ چھ مہینے شانتی نکیتن میں بھی رہے۔ یہ دن انہوں نے رابندر ناتھ ٹیگور کے ساتھ گزارے۔ شانتی نکیتن سے جوشؔ ملیح آباد واپس آگئے۔ یہاں ان کے ذمے جائیداد کی دیکھ بھال ہوگئی۔ یہیں انہوں نے انگریزی ادب کا مطالعہ کیا اور فارسی کے بڑے شاعروں مثلاً سعدیؔ، حافظؔ، خیامؔ، عرفیؔ اور خاقانیؔ کے کلام کا مطالعہ کیا۔

﴿۲﴾ شعر گوئی کی ابتدا: جوشؔ کے والدِ محترم کو یہ گوارا نہیں تھا کہ ان کا بیٹا شاعری کرے۔ ان کے والدِ محترم نے اپنی زندگی میں پوری کوشش کی تھی کہ جوشؔ شعر گوئی سے دور رہیں۔ اس سلسلے میں جوشؔ نے اپنے پہلے مجموعۂ کلام کے دیباچے میں لکھا ہے کہ:

''میں نے نو برس کی عمر میں شعر کہنا شروع کر دیا تھا۔ یہ بات میں نے خلافِ واقعہ لکھی ہے۔ کیوں کہ حقیقت یہ ہے کہ میں شعر نہیں کہتا تھا بلکہ شعر خود کو مجھ سے کہلواتا تھا۔''

جوشؔ کے والدِ گرامی شاعری کے اتنے خلاف تھے کہ جوشؔ چوری چھپے شعر کہا کرتے تھے۔ اگر کبھی شعر کہتے پکڑے جاتے تو انہیں سخت سزا دی جاتی۔ سب سے کم سزا یہ تھی کہ ان کا جیب خرچ بند کر دیا جاتا یا والدِ محترم کے ساتھ دسترخوان پر کھانے کی اجازت نہیں ملتی۔ اس طرح کی سزاؤں سے جوشؔ کی صحت پر برا اثر پڑنے لگا۔ ایک بار کا واقعہ ہے کہ جوشؔ بے ہوش ہوگئے تو ان کے والدِ محترم نے انہیں شعر کہنے کی اجازت دے دی۔

جوشؔ نے شاعری کا آغاز غزل سے کیا اور بڑی اچھی غزلیں کہیں۔ غزل کو ایک نئے رنگ و آہنگ سے روشناس کرانے کی کوشش کی۔ منفرد انداز اپنایا۔ ان کی غزلیں قدیم غزلوں سے مختلف ضرور ہیں لیکن ان میں غزلیہ عناصر موجود ہیں۔ عشقیہ معاملات و واردات اور کیفیات کی ترجمانی اس میں موجود ہے۔ ان سب کو جوشؔ نے ایک نئے زاویے سے پیش کیا ہے۔ ابتدائی غزلیں بھی اسی نقطۂ نظر کے ثبوت میں رکھی جاسکتی ہیں، جن کے متعدد اشعار غزلیہ روایت کی توسیع و تعمیر میں اضافے کی حیثیت رکھتے ہیں۔

چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

اے نسیمِ صبح کے جھونکو! یہ تم نے کیا کیا — میرے مستِ خواب کی زُلفیں پریشاں ہوگئیں
خاطرِ جمع سے ہشیار کہ برہم ہوئی زلف — کشتیِ دل سے خبردار کہ طوفاں آیا
اے چمن ! عید منا ، ابر ہوا گرمِ خرام — اے صبا ! ناز سے چل ، موسمِ باراں آیا
ارض و سما کو ساغر و پیمانہ کر دیا — رندوں نے کائنات کو مے خانہ کر دیا
جبیں پر سادگی ، نیچی نگاہیں ، بات میں نرمی — مخاطب کون کرسکتا ہے تم کو لفظِ قاتل سے
کون آیا ہے لاش پر میری — منہ سے چادر ہٹائی جاتی ہے
کوئی صدمہ ضرور پہنچے گا — آج کچھ دل کو شادمانی ہے
یاد آتی ہیں جب تری باتیں — ہم کلیجہ پکڑ کے روتے ہیں
ہاں آسمان ! اپنی بلندی سے ہوشیار — اب سر اُٹھا رہے ہیں کسی آستاں سے ہم

یہ اشعار فنی اور فکری سطح پر انفرادی لب و لہجے کے غماز ہیں جس سے اس حقیقت کی نشان دہی ہوتی ہے کہ اگر جوش غزل گوئی کا سلسلہ جاری رکھتے تو یقیناً منفرد امتیازات کے مالک ہوتے لیکن جوشؔ نے غزل گوئی تقریباً یک لخت ترک کر دی جس کے سببِ خاص کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جوشؔ نے وحیدالدین سلیم پانی پتی کے حوالے سے ''روحِ ادب'' میں مندرجہ ذیل جملے لکھے ہیں:

''غزلیں آبائی اور ماحولی اثرات کا نتیجہ ہیں اور نظموں کے باب میں وحیدالدین سلیمؔ کا شکر گزار ہوں کہ اس صنفِ صحیح کی جانب سب سے پہلے اِنہی بزرگوار نے مجھے توجہ دلائی اور اس کے ساتھ ساتھ تغزّل پر مرحوم نے اس قدر قہقہے مارے کہ میرے دل کو اس غیر فطری صنف سے پھیر دیا تھا۔''

(روحِ ادب : جوشؔ، ص ۱۴)

یہ فیصلہ جلد بازی اور جذباتیت کا نتیجہ تھا جس کے پسِ پردہ اس عہد کی نظم گاری کی تحریک کو بھی خاص محرک کی حیثیت حاصل تھی۔ ان کے یہاں مبالغہ آرائی نہیں ہے لیکن بہت جلد نظم گوئی کی طرف توجہ کی اور نظمیں کہنے لگے۔ غزل اور نظم کے علاوہ انہوں نے مراثی، سلام، گیت، رباعیاں اور قطعے بھی کہے۔ جوشؔ کے والدِ محترم کے دنیا سے کوچ کرنے کے بعد ان کی جائیداد تین حصوں میں بٹ گئی۔ جوشؔ فطرتاً لا اُبالی تھے۔ اپنی جائیداد کی دیکھ بھال ذمے داری سے نہیں کیا کرتے تھے اس لئے ان کے بڑے بھائی نے دستاویزوں پر جوشؔ کے دستخط کرا لیے جس کی وجہ سے جوشؔ اپنی جائیداد کے ایک بہت بڑے حصے سے محروم ہو گئے۔ جوشؔ کو بچپن سے ہی انگریزوں سے نفرت تھی۔ اس لئے والدِ محترم کے انتقال کے بعد اتر پردیش کے گورنر سر ہارکوٹ بٹلر نے بلا کر ڈپٹی کلکٹر یا اسپیشل کورٹ آف وارڈ کی ملازمت پیش کی تو انہوں نے یہ پیشکش ٹھکرا دی۔

﴿۳﴾ **ملازمت:** ۱۹۲۲ء کا واقعہ ہے کہ جوشؔ کو خیال آیا کہ ان کی جائیداد کا کام کرنے والے تھوڑی تھوڑی کر کے ساری جائیداد ختم کر چکے ہیں اور اب بیوی بچوں کے لئے ان کے پاس کچھ زیادہ رقم نہیں بچی۔ اس لئے انہوں نے فیصلہ کیا کہ وہ حیدرآباد جا کر ملازمت کے لئے کوشش کریں۔ جوشؔ نے عثمانیہ یونی ورسٹی کے پروفیسر وحیدالدین سلیم سے خط و کتابت کی اور حیدرآباد کے مہاراجہ کرشن پرساد کے نام علامہ اقبالؔ، اکبرالہ آبادی، عبدالماجد دریابادی اور سید سلیمان ندوی جیسی اہم شخصیتوں کے سفارشی خطوط لے کر ۱۹۲۴ء کے آغاز میں وہ حیدرآباد پہنچ گئے۔ وہاں کئی مہینے تک ملازمت کی تلاش میں سرگرداں رہے لیکن کوئی سبیل نہیں نکل سکی۔

ایک دن نواب میر علی عثمان خاں حیدرآباد نے انہیں بلایا اور دورانِ گفتگو جوشؔ سے کلام سنانے کی فرمائش کی۔ جب جوشؔ نے اپنا کلام سنایا تو نواب صاحب بے حد متاثر ہوئے۔ ایک ہفتے بعد حیدرآباد عثمانیہ یونی ورسٹی کے دارالترجمہ میں انگریزی ادب کے مترجم کے طور پر ان کا تقرّر ہو گیا۔ جوشؔ کی زندگی آرام سے گزرنے لگی لیکن وقت نے کروٹ بدلی تو خود مختار ریاست حیدرآباد میں افواہوں اور سازشوں کا بازار گرم رہنے لگا۔ جب بھی کوئی شخص حضور نظام سے قریب ہوتا تو اس کے خلاف سازشوں کا جال بچھ جاتا۔ کچھ ایسا ہی جوشؔ کے ساتھ ہوا۔ کسی مشاعرے میں جوشؔ نے ایک ایسی نظم پڑھی جس میں اشارتاً نواب صاحب کے بارے میں کچھ نازیبا باتیں کہی گئی تھیں۔ کسی نے اس نظم کے اشعار حضور نظام کو سنائے تو وہ ناراض ہو گئے اور یہ معاملہ اس حد تک بگڑا کہ حضور نظام نے انہیں حیدرآباد سے نکلنے کا حکم صادر فرما دیا۔ جوشؔ یہاں سے نکل کر پہلے دیتا ریاست گئے پھر وہاں سے دھول پور گئے لیکن کہیں مناسب انتظام نہ ہو سکا بالآخر دہلی آئے۔

مسز سروجنی نائیڈو جوشؔ کی شاعری کی بڑی تعریف کرتی تھیں۔ دہلی میں مسز نائیڈو سے ملاقات کے دوران انہوں نے جوشؔ کو ایک تجویز پیش کی کہ آپ دہلی سے ایک رسالہ نکالیے۔ رسالہ نکالنے کے لئے رقم کی دست یابی کے لئے جوشؔ پریشان تھے۔ مسز نائیڈو نے کہا کہ جایئے میرے کمرے میں ایک لفافہ رکھا ہے وہ خاموشی سے اُٹھا کر چلے جایئے اور رسالے کی تیاری کیجیے۔ جوشؔ نے کمرے سے وہ لفافہ لیا اور پھر دہلی سے ایک ''کلیم'' نامی رسالہ جاری کر دیا۔ شروع میں اس رسالے کی حالت اچھی رہی لیکن رفتہ رفتہ جوشؔ کے شاعرانہ مزاج کی وجہ سے ''کلیم'' کی مالی حالت خراب ہونی شروع ہوگئی۔ کئی منزلوں سے گزرنے کے بعد بالآخر یہ رسالہ بند کر دیا۔

﴿۴﴾ **ہجرت:** جوشؔ ایک مشاعرے کے سلسلے میں ۱۹۵۵ء میں پاکستان گئے تو ایک پرانے دوست سید ابو طالب نقوی کراچی کے چیف کمشنر تھے۔ وہ جوشؔ کو پہلے بھی کراچی آنے کی دعوت دے چکے تھے اور اس دفعہ انہوں نے اتنا اصرار کیا اور ایسے خواب دکھائے کہ جوشؔ ترکِ وطن کر کے کراچی جانے کے لئے راضی ہوگئے۔ ایک عام خیال ہے کہ جوشؔ کی یہ وہ غلطی تھی جس کی قیمت آخری ایام تک چکانی پڑی۔ جب جوشؔ پاکستان پہنچے تو مخالفتوں کا ایک طوفان کھڑا ہوگیا۔ وجہ یہ ہے کہ یہاں کے شاعر اور ادیب یہ سمجھنے لگے کہ جوشؔ کے سامنے ان کا چراغ نہیں جلے گا۔ جوشؔ نے اپنی خودنوشت سوانح ''یادوں کی بارات'' میں پاکستان میں اپنی ناکامیوں کی تفصیل اختصار کے ساتھ بیان کی ہے۔

08.04 شبیر حسن خاں جوشؔ ملیح آبادی کی نظم نگاری

جوشؔ ملیح آبادی کی رگوں میں شاعری خون کی طرح سرایت کیے ہوئے تھی کیوں کہ شعر کہنے کا سلسلہ ان کے خاندان میں چار پشتوں سے جاری تھا۔ ان کے باپ، دادا اور پردادا تینوں شاعر تھے۔ نو سال کی عمر سے یہ بھی شعر کہنے لگے لیکن ملک گیر شہرت انہیں اس وقت حاصل ہوئی جب انہوں نے تحریکِ آزادی کی حمایت میں نظمیں کہنی شروع کیں۔ جلد ہی ان کی پرجوش سیاسی نظمیں نعرۂ انقلاب کی طرح ملک کے گلی کوچوں میں گونجنے لگیں۔ جوشؔ کو شاعرِ انقلاب، شاعرِ شباب اور شاعرِ فطرت بھی کہا جاتا ہے۔

ان کی شاعری کا ایک اہم پہلو انقلابی فکر ہے۔ برطانوی حکومت کے ظلم و استبداد نے ان میں بغاوت کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھر دیا تھا۔ ان میں انگریزوں کی غلامی سے آزاد کرانے کا جذبہ اتنا شدید تھا کہ وہ اس مقصد کے لئے اپنی زندگی قربان کرنے کو تیار تھے۔ برطانوی سامراج اور جنگِ آزادی کے موضوع پر اردو میں بے شمار نظمیں کہی گئی ہیں لیکن اس موضوع پر جوشؔ کی نظموں کا معیار جتنا بلند ہے اور آزادی حاصل کرنے کی شدّت جتنی جوشؔ کی نظموں میں ہے اتنی شاذ و نادر ہی کسی شاعر کے یہاں ملے گی۔

جوشؔ جنگِ آزادی کے سب سے قد آور شاعر ہیں ان کی شاعری سے لاکھوں مجاہدین نے آزادی حاصل کرنے کا آہنی عزم پیدا کیا۔ سر پر کفن باندھ کر میدانِ جنگ میں لڑنے کے لئے ولولہ، ہمت اور حوصلہ پیدا کیا۔ جوشؔ نے جنگِ آزادی کے سلسلے میں ''ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزندوں سے'' کے عنوان سے جو نظم لکھی تھی اسے جنگِ آزادی کے مجاہدین اور محبِ وطن ہندوستانیوں میں جو غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی وہ کسی زمانے میں اردو کی کسی نظم کو حاصل نہ ہوئی۔ یہ نظم لاکھوں کی تعداد میں چھاپ کر تقسیم کی گئی۔ یہ چھپی ہوئی نظم نئی دہلی کے نیشنل آرکائیوز میں جنگِ آزادی کے دوارن ضبط ہونے والے ادب کے ذخیرے میں موجود ہے۔

کسی سرکاری افسر نے اس نظم پر ایک نوٹ لکھا ہے جس میں یہ کہا گیا ہے کہ ''یہ نظم لاکھوں کی تعداد میں چھاپ کر ہندوستان اور خاص طور سے یوپی، بنگال اور پنجاب میں تقسیم کی گئی ہے''۔ اس نظم کی مقبولیت کا یہ حال تھا کہ مجاہدینِ آزادی جلوس کی شکل میں شہر کا چکر لگاتے تھے اور سب مل کر یہ نظم پڑھتے تھے برطانوی حکومت نے یہ نظم ضبط کر لی تھی۔

اس نظم کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

کس زباں سے کہہ رہے ہو آج تم سودا گرو؟ دہر میں انسانیت کے نام کو اونچا کرو
جس کو سب کہتے ہیں ہٹلر، بھیڑیا ہے بھیڑیا بھیڑیے کو مار دو گولی پئے امن و بقا
باغِ انسانی میں چلنے ہی پہ ہے بادِ خزاں آدمیّت لے رہی ہے ہچکیوں پر ہچکیاں
پوچھ لو اس سے تمہارا نام کیوں تابندہ ہے ڈائرِ گرگِ دہن آلود اب بھی زندہ ہے
وہ بھگت سنگھ اب بھی جس کے غم میں دل ناشاد ہے اس کی گردن میں جو ڈالا تھا وہ پھندا یاد ہے؟
اک کہانی وقت لکھے گا نئے مضمون کی جس کی سرخی کو ضرورت ہے تمہارے خون کی
وقت کا فرمان اپنا رُخ بدل سکتا نہیں موت ٹل سکتی ہے اب فرمان ٹل سکتا نہیں

جنگِ آزادی کے اس زمانے کا تصوّر بھی نہیں کر سکتے جب دنیا کی سب سے بڑی طاقت یعنی برطانوی حکومت سے نہتے ہندوستانی صرف اپنی ہمت اور حوصلے کے بَل پر وطنِ عزیز کی آزادی کے لئے ظالم سامراجیوں سے لوہا لے رہے تھے۔ اس وقت ہزاروں کی تعداد میں مجاہدینِ آزادی دار و رَسن کی آزمائش سے گزر رہے تھے۔ جوش نے ''بغاوت'' کے عنوان سے ایک طویل نظم لکھی تھی۔ یہ نظم ایک جاں باز مجاہد ہی لکھ سکتا تھا جسے موت کا خوف نہ ہو۔ اس نظم کے چند اشعار درج ذیل ہیں:

ہاں بغاوت، آگ، بجلی، موت، آندھی میرا نام میرے گرد و پیش اجل، میرے جلو میں قتلِ عام
زرد ہو جاتا ہے میرے سامنے روے حیات کانپ اُٹھتی ہے مری چینِ جبیں سے کائنات
الحذر، میری کڑک کا زور، ہنگامِ مصاف صاف پڑ جاتا ہے ایوانِ حکومت میں شگاف
اللہ اللہ بزمِ ہستی میں مری گل باریاں ٹکڑے ٹکڑے دست و بازو، ریزہ ریزہ استخواں
الامان و الحذر، میری کڑک، میرا جلال خون، سفاکی، گرج، طوفان، بربادی، قتال
برچھیاں، بھالے، کمانیں، تیر، تلواریں، کٹار بیرقیں، پرچم، علم، گھوڑے، پیادے، شہ سوار
آندھیوں سے میری اُڑ جاتا ہے دنیا کا نظام رحم کا احساس ہے میری شریعت میں حرام

جوشؔ کی ایک نظم ہے جس میں انقلاب کا نعرہ اس طرح بلند کیا گیا ہے جیسے آندھی اور طوفان کی طرح مجاہدوں کی فوج دشمن پر حملہ کر رہی ہے۔ وطن کی محبت اور اس پر قربان ہونے کے جذبے نے اس فوج کے ہر سپاہی میں شہادت کا جذبہ پیدا کر دیا ہے جو انسان کو دنیا کے ہر خطرے سے بے نیاز کر دیتا ہے اور حد تو یہ ہے کہ موت سے بھی بے خوف کر دیتا ہے۔ اس نظم کے چند اشعار پیش ہیں۔

کام ہے میرا تغیر، نام ہے میرا شباب میرا نعرہ انقلاب و انقلاب و انقلاب
کوئی قوّت راہ سے مجھ کو ہٹا سکتی نہیں کوئی ضربت میری گردن کو جھکا سکتی نہیں
پھر اُٹھوں گا اَبر کے مانند بَل کھاتا ہوا گھومتا، گھرتا، گرجتا، گونجتا، گاتا ہوا
خون میں لتھڑی، بساطِ کفر و دیں اُلٹے ہوئے فخر سے سینے کو تانے آستیں اُلٹے ہوئے
ولولوں سے برق کی مانند لہراتا ہوا موت کے سائے میں رہ کر موت پر چھاتا ہوا

جنگِ آزادی کے عنوان پر جوشؔ ملیح آبادی کی بہت سی نظمیں ایسی ہیں جو اردو کی ادبی تاریخ کا اہم حصہ ہیں اور جنگِ آزادی کی تاریخ بھی ہیں۔اس موضوع پر جوشؔ کی بعض نظمیں ہمیشہ جنگِ آزادی کا حصہ رہیں گی۔ یہ نظمیں ''بیدار ہو بیدار، غدّار سے خطاب، شکستِ زنداں کا خواب، بھوکا ہندوستان، حیف اے ہندوستان، زنداں کا گیت، دردِ مشترک، ترانۂ آزادیِ ہند، دعوتِ انقلاب، اُٹھ اے ندیم اور کسان وغیرہ''۔ان کے علاوہ اس موضوع پر خاصی تعداد میں نظمیں ہیں۔

﴿۱﴾شاعرِ انقلاب: جوشؔ کا نام آتے ہی ''شاعرِ انقلاب'' اور ''یادوں کی بارات'' یہ دونوں چیزیں اُبھر کر ہمارے سامنے آتی ہیں۔ چوں کہ ان کی شعری کائنات میں جوش وولولے اور شوکت وطنطنہ ہے۔اس لئے انہیں شاعرِ انقلاب کہا گیا اور ''یادوں کی بارات'' کی اہمیت اس لئے ہے کہ اس کتاب میں جوش کی زندگی کے نشیب فراز اور سچ، جھوٹ کا کچّا چٹھّا ہے۔''یادوں کی بارات'' سے دو اقتباسات پیشِ خدمت ہیں۔

> ''شخصیت شناسی بھی بڑی جان لیوا چیز ہوتی ہے اور سالہا سال کی بے تکلّف ہم نشینی کے بعد بھی اس کا شرمیلا پن کم نہیں ہوتا.....مجھ سے اگر آپ یہ پوچھیں کہ تو اپنے آپ کو بھی جاننے کی طرح جانتا ہے؟ تو میں یہ جواب دوں گا کہ ہر چند بچپن سے لے کر پیرانہ سالی تک میں علی الاتصال و بہ ہر دقیقہ اپنے ساتھ رہا ہوں لیکن قطعیت کے ساتھ یہ نہیں کہہ سکتا کہ درحقیقت میں ہوں کیا۔''

دوسرا اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

> ''جی ہاں میں نے عیاشی کی ہے، جی بھر کر، لیکن عشق بازی کی ہے جی سے گزر کر۔عیاشی نے میرے جسم کی کھیتیاں لہلہائیں۔عاشقی نے میرے ذہن کی کلیاں چٹکائیں، عیاشی نے لذتِ حواس سے دوچار کیا۔ عاشقی نے نشاطِ شعور سے سرشار کیا۔عیاشی نے گردن کو نقرئی بانہوں سے اُجالا۔عاشقی نے گردن میں قوسِ قزح کا زرّیں ہار ڈالا۔''

پہلے اقتباس کی روشنی میں یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ جوشؔ جب خود کو سمجھنے سے قاصر ہیں تو دوسرا انہیں سمجھنے کا کیسے دعویٰ کرسکتا ہے جب کہ فارسی میں کہا جاتا ہے: ''من آنم کہ من دانم''۔دوسرے اقتباس کو پڑھ کر جوشؔ کی اخلاقی جرأت کا پتہ چلتا ہے مگر ایسے جذبوں کا اظہار مشرقی تہذیب اور معاشرے کی اعلیٰ اقدار کے منافی ہے۔جوشؔ نے اپنی شاعری سے انقلاب کا پرچار کیا اور لاکھوں دلوں کو گرمایا لیکن ان کا تصوّرِ انقلاب سراسر رومانی ہے۔وہ انقلاب کے مفہوم سے پوری طرح خود بھی واقف نہیں۔ان کی اس کمزوری پر خلیل الرحمٰن اعظمی نے سخت تنقید کی ہے۔ان کے نزدیک اس خامی کا سبب جوشؔ کے مزاج کی سیمابیت، علمی تہی مائیگی اور وہ جاگیردارانہ ماحول ہے جس میں ان کا بچپن گزرا۔

''روحِ ادب'' کے دیباچے میں انہوں نے خود لکھا ہے:

> ''میرا محبوب ترین مشغلہ تھا کہ اونچی سی میز پر بیٹھ کر اپنے ہم عمر بچوں کو جو جی میں آتا اناپ شناپ درس دیا کرتا تھا۔''

غلط نہ ہوگا اگر کہا جائے کہ نشیب وفراز پر غور کیے بغیر جو جی میں آیا اناپ شناپ وہ انقلاب کا درس دیتے رہے۔انہوں نے نہ تو بچپن میں تعلیم حاصل کی، نہ ہوش سنبھالنے کے بعد انقلاباتِ عالم کے اسباب ونتائج کا مطالعہ کیا۔انقلاب کے بارے میں ان کی نثری تحریریں بھی موجود ہیں جو گواہ ہیں کہ ان کے ذہن میں کوئی واضح نظامِ فکر نہیں، کوئی معین نقطۂ نظر نہیں اور کوئی قطعی لائحہ عمل نہیں۔وہ بہت جلد جذبات کی رَو میں بہہ جاتے ہیں۔

کلیم الدین احمد نے جوشؔ کی بعض مقبول ترین نظموں کو اقبالؔ کی صدائے بازگشت کہا ہے۔یہ الزام بے بنیاد نہیں ہے کہ جب اقبالؔ کی نظم ''ازخوابِ گراں، خوابِ گراں، خوابِ گراں خیز'' شائع ہوئی تو جوشؔ نے ''بیدار ہو، بیدار ہو، بیدار، ہاں پیرِ مغاں، پیرِ مغاں، پیرِ مغاں، دیکھ اور برسات ہے، برسات ہے، برسات ہے، برسات'' جیسی نظموں کی بارات لگادی۔اقبالؔ کی خضرِ راہ مقبول ہوئی تو جوشؔ کو بھی مزدوروں اور کسانوں کا خیال آنے لگا مگر بقول اعظمی صاحب اقبالؔ اور جوشؔ جیسے شعرا میں وہی فرق ہے جو ایک مفکّر اور ڈھنڈورچی میں ہوتا ہے۔جوشؔ بغیر کسی فلسفیانہ بصیرت کے اپنے زمانے کے بعض میلانات کا ساتھ دیتے ہیں۔تحریکِ آزادی نے زور پکڑا اور انگریز دشمنی جوش پر آئی تو انہوں نے ہٹلر کی خدمت میں سلامِ عقیدت پیش کیا:

سلام اے تاج دارِ جرمنی ، اے ہٹلرِ اعظم
فدائے قوم، شیدائے وطن، اے نیّرِ اعظم

پھر اس پر لے دے ہوئی کہ ایک ظالم سے نجات ملی نہیں اور آپ دوسرے ظالم کو دعوت دے رہے ہیں تو انہوں نے اس نظم کو اپنا ماننے سے انکار کر دیا۔انگریز حکومت کی مخالفت میں وہ اس حد تک بڑھ گئے کہ انگریزی زبان کی مخالفت پر کمر بستہ ہو گئے۔مثلاً یہ شعر دیکھیے :

جسمِ ہندی میں جان انگریزی
منہ کے اندر زبان انگریزی
یوں تمہارے منہ کے اندر ہے فرنگی کی زباں
خوف ہے گونگا نہ ہوجائے کہیں ہندوستاں

کیا یہ اکبرالہ آبادی کی ہم نوائی نہیں؟ سرور صاحب نے درست فرمایا:

''مغرب سے اس قدر بے زاری اکبرؔ کے زمانے میں معاف کی جاسکتی تھی آج نہیں۔''

ماضی سے بغاوت کا حق اسی کو ہے جس کے ذہن میں حال واستقبال کے لئے کوئی واضح منصوبہ ہو۔جوشؔ کا رویہ ہر معاملے میں جذباتی ہے۔ڈاکٹر عبدالعلیم کی رائے ہے کہ جوشؔ کی شاعری میں رقیب کی جگہ سرمایہ دار نے، معشوق کی جگہ مزدور نے اور وصل کی جگہ انقلاب نے لے لی ہے۔یہ انقلابی شاعری نہیں، انقلاب کا محض رومانی تصوّر ہے۔جوشؔ نے لکھا ہے:

''میں لڑکپن میں بلا کا شعلہ خو تھا۔غیظ وغضب کا یہ عالم تھا کہ ذرا سی خلافِ مزاج بات پر میرے ہر بنِ موسے چنگاریاں نکلنے لگتی تھیں۔جانتا اور خوب اچھی طرح جانتا ہوں کہ جس شخص میں جتنی زیادہ مقدار غیظ وغضب کی ہوتی ہے اسی نسبت سے اس کی ذات میں حکمت وبصیرت کی کمی ہوتی ہے۔''

جوشؔ نے بالکل سچی بات کہہ دی۔ان کے یہاں حکمت وبصیرت کی کمی اورغیظ وغضب کی زیادتی ہے۔جب اُنہیں احساس ہوتا ہے کہ ان کے مخاطبین ان کے اشاروں پرنہیں چل رہے ہیں تو وہ اُن پر بے تحاشا برس پڑتے ہیں۔مثلاً:

اے ہند کے ذلیل غلامانِ روسیاہ! شاعر سے تو ملاؤ خدا کے لئے نگاہ
اے سیہ رو ، بے حیا ، وحشی ، کمینے ، بدگماں اے جبینِ ارض کے داغ ، اے دنیٰ ہندوستاں

حکمت وگدازِ قلب کی اس کمی کے سبب جوشؔ کا تصوّرِ انقلاب انتہائی تخریبی اور ہول ناک ہے۔ان کے نزدیک انقلاب کیا ہے خود ان کی زبان سے سنیے:

الامان و الحذر ، میری کڑک ، میرا جلال خون ، سفاکی ، گرج ، طوفان، بربادی ، قتال
برچھیاں ، بھالے ، کمانیں ، تیر ، تلواریں ، کٹار بیرقیں ، پرچم ، علَم ، گھوڑے ، پیادے ، شہ سوار
آندھیوں سے میری اُڑجاتا ہے دنیا کا نظام رحم کا احساس ہے میری شریعت میں حرام

دیکھیے ہرلفظ ایک دہکتا ہوا انگارہ ہے۔حرارت سے لبریز مگر روشنی سے محروم!ان شعروں میں گھَن گرج خوب ہے مگر قائل کرنے کی صلاحیت نہیں۔تحریکِ آزادی ہندوستان کے فرزندوں سے عملی جدوجہد کا مطالبہ کرتی تھی۔جوشؔ کو جب اندازہ ہوتا ہے کہ اب ان سے کارزار میں حصہ لینے کو کہا جانے والا ہے تو بقولِ اعظمی وہ پیغمبرانہ جلال میں آجاتے ہیں:

ترتیبِ سپاہ اور تنظیمِ عوام دونوں سے بلند تر ہے شاعر کا مقام
تالیف ، مزاج پرسی و چارہ گری میرا نہیں میرے پیرووں کا ہے کام
شاعر کو پکارو نہ مشقت کی طرف بھینسے کا جو کام ہے وہ گھوڑے سے نہ لو
اس منطقِ بے ہودہ کے کیا معنی ہیں گھوڑوں کا جو ہم درد ہو گھوڑا بن جائے

جوش کی تلخ نوائی مسلسل ہدفِ ملامت بنتی رہی ہے۔

پروفیسر مسعود حسین خاں اس کمزوری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ان کا زخمی دل شروع میں چیختا ہے۔پھر منہ کی کڑواہٹ شعر کے سانچوں میں ڈھل جاتی ہے۔دل کا غبار ایک تلخ اور ناتمام حسرت کی شکل اختیار کرلیتا ہے۔روحِ ادب کی ابتدائی نظمیں کھجائے ہوئے زخم، بپھرے ہوئے جذبات اور اشتعال انگیز خیالات کے نقوش ہیں۔چوں کہ یہ نقش عام طور سے ناپختہ اور خام ہیں اس لئے شاعرانہ اعتبار سے زیادہ لائقِ اعتنا نہیں۔یہ بغاوت کی بَڑ ہیں۔جذبہ اس قدر بلاواسطہ ہے کہ ان سے کوئی حسین نقش نہیں بنتا۔''

ملک راج آنند نے ایک بار کہا تھا کہ جوشؔ اردو میں بہت چنگھاڑتے ہیں لیکن انگریزی میں ان نظموں کا ترجمہ کیا جائے تو گھانس پھونس معلوم ہوتی ہیں۔ان کی نظم کا خیال ایک سطر میں آسکتا ہے باقی سارا کھیل لفظوں کا ہے۔دراصل جوشؔ کے پاس کوئی مربوط نظامِ فکر نہیں۔اس لئے ان کے یہاں استقامت ناپید ہے ابھی کچھ کہہ رہے تھے ابھی کچھ الگ کہنے لگتے ہیں۔ستم یہ کہ اس پر فخر بھی ہے۔مثال:

دریا ہوں اک مقام پہ رہتا نہیں کبھی اک خطِ مستقیم پہ بہتا نہیں کبھی

ایک جگہ خود لکھتے ہیں:

''شاعر کی ایک بڑی خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ کسی ایک موضوع، کسی ایک مقصد، کسی ایک تعلیم، کسی ایک فلسفۂ حیات کے اندر قید ہو کر نہیں رہ سکتا۔ قرآن کی زبان میں وہ نئی وادیوں کی سیر کرتا ہے۔ وہ ہواؤں کی طرح آوارہ، ابر کی طرح بے پرواخرام، تصوّرات کی طرح بے قید و بند اور ایتھر کی طرح آزاد ہوتا ہے۔''

کتنا واضح اعتراف ہے ملاحظہ کیجیے:

جھکتا ہوں کبھی ریگِ رواں کی جانب　　بڑھتا ہوں کبھی کاہ کشاں کی جانب
میرے دو دل ہیں، ایک مائل بہ زمیں　　اور ایک کا رُخ ہے آسماں کی جانب

حالات کا رُخ دیکھ کر جوشؔ بھی باغیوں کے ہم نوا ہو گئے بلکہ بغاوت کا پرچم خود ہاتھ میں لے لیا۔ اس کا یہ فائدہ ہوا کہ ان کی شہرت بغاوت کی آگ کی طرح ملک میں ہر طرف پھیل گئی ورنہ اصلیت یہ ہے کہ انہیں شاعرِ انقلاب کہنا درست نہیں۔ وہ شاعرِ فطرت ہیں، شاعرِ شباب ہیں اور یہاں ان کا کوئی ہم سر نہیں۔

﴿۲﴾ **شاعرِ فطرت:** جوشؔ کو مختلف ناموں سے یاد کیا جاتا ہے۔ انہیں شاعرِ فطرت بھی کہا جاتا ہے۔ اردو میں فطرت نگاری کی روایت بہت قدیم ہے۔ اس کے بہت ہی اچھے نمونے ہمیں اردو مثنویوں میں مل جاتے ہیں مگر جوشؔ نے فطرت نگاری کے فن کو عروج پر پہنچا دیا ہے۔ جوشؔ کو فطری مناظر سے بہت لگاؤ تھا۔ وہ مناظرِ فطرت کے زبردست عاشق تھے۔ ان کو صبح کے وقت پَو پھٹنے کا منظر بہت ہی عزیز تھا۔ اس لئے وہ صبح چار بجے اُٹھ کر باغوں کی سیر کو چلے جاتے تھے۔ صبح کے حسین مناظر سے بہت متاثر ہوتے تھے۔ صبح کے مناظر انہیں اتنے دل کش لگتے تھے کہ کہا کرتے تھے کہ ان میں انہیں قدرتِ حق کا جلوہ دکھائی دیتا ہے:

ہم ایسے اہلِ نظر کو ثبوت حق کے لئے
اگر رسول نہ ہوتے تو صبح کافی تھی

جوشؔ کی ایک نظم ''پیغمبرِ فطرت'' ہے اس کے شروع میں جوشؔ نے صبح کا منظر انتہائی خوب صورت اور دل کش انداز میں پیش کیا ہے:

تاروں نے جھلملا کے جو چھیڑا ستارِ صبح　　گانے لگی چمن میں نسیمِ بہارِ صبح
غنچوں میں چشمِ ناز سے ٹپکا خمارِ صبح　　اُبھرا افق سے جامِ زمرد نگارِ صبح
شاعر کی روح عشق کی ہم راز ہوگئی　　دنیا تمام جلوہ گہِ ناز ہوگئی

جوشؔ فطرت کی منظر کشی میں خوب صورت استعاروں، نادر تشبیہوں، اچھوتے تخیل اور معنی آفرینی سے کام لیتے ہیں۔ وہ جزئیات نگاری سے کام لے کر منظر کی پوری تصویر اس طرح کھینچ دیتے ہیں کہ تصویر کا ایک ایک پہلو دل و دماغ پر نقش ہو جاتا ہے۔ فطرت کے دل کش مناظر ہمیشہ جوشؔ کو لبھاتے رہے ہیں۔ ان کا پہلا مجموعۂ کلام ''روحِ ادب'' شائع ہوا تو اس میں بھی مناظرِ فطرت سے متعلق کئی نظمیں شامل تھیں۔ کئی نقادوں نے تسلیم کیا ہے کہ جوشؔ نے مختلف نظموں میں صبح اور شام کی ایسی حسین تصویریں کھینچی ہیں کہ ان پر انیسؔ کی مصوّری کا دھوکا ہوتا ہے۔ وہی صاف ستھری نکھری ہوئی زبان، لفظوں کا دل کش ترنّم اور وہی استعارات و تشبیہات کی لطافت۔ اس کے علاوہ یہ بات کیا کچھ کم اہم ہے کہ صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ صبح میرے اپنے دیس کی صبح ہے، یہ شام میرے اپنے دیس کی شام ہے۔ صبح کی مثال:

یہ صحنِ گلستاں میں ہری دوب کی صدا یہ وادیوں کی اوس میں ڈوبی ہوئی ہوا
یہ کوئلوں کی کوک ، پپیہے کی یہ صدا رخسارِ گل پہ رنگ یہ ہلکا سا دھوپ کا
رنگینیاں یہ سلسلۂ کوہسار کی یہ تنگ گھاٹیوں میں صدا آبشار کی

اب برسات کی ایک شام کی تصویر ملاحظہ کیجیے:

شفق ، ہلال ، ندی ، رنگ ، ابر ، سبزہ ، ہوا ہوا میں مور کی آواز ، جھینگروں کی صدا
خفیف زمزمہ امواج کی روانی میں فلک پہ رنگ درختوں کے سائے پانی میں
فضا شگفتہ ، گھٹا لال گوں، شفق چونچال ہوا لطیف ، زمیں نرم ، آسماں سیال

ڈاکٹر خلیل الرّحمٰن اعظمی جوشؔ کی شاعری کے کچھ زیادہ قائل نہیں۔ جوشؔ کی شاعری کے فکری عنصر پر انہوں نے بہت سخت تنقید کی ہے لیکن مناظرِ فطرت کی کامیاب پیش کش کا انہوں نے بھی اعتراف کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

''جوش نے مناظرِ فطرت پر جس کثرت سے نظمیں لکھی ہیں اس کی مثال پوری اردو شاعری میں نہیں ملے گی۔ صبح و شام، برسات کی بہار، گھٹا، بدلی کا چاند، ساون کے مہینے، پچھلا پہر، گنگا کا گھاٹ۔ یہ تمام مناظر جوش کی نظموں میں رقصاں و جولاں ہیں۔''

جوشؔ کی کچھ نظمیں خالص فطرت پرستی کی مظہر ہیں لیکن زیادہ تر یہ ایک پس منظر کا کام دیتی ہیں اور کسی حسینہ کی یاد دلاتی ہیں جن سے دل میں ایک میٹھا میٹھا درد پیدا ہوتا ہے۔ ایک نظم میں کہتے ہیں:

جب موجِ ہوا میں نفسِ شام کی بو ہو حسرت ہے کہ اس وقت مرے سامنے تو ہو

پروفیسر مسعود حسین خاں کی رائے ہے کہ:

''جس طرح جوشؔ انقلاب کے صحیح مفہوم سے ہمیشہ نا آشنا رہے ہیں اسی طرح نبضِ فطرت کو بھی دل کی دھڑکنوں سے ہر بار ہم آہنگ نہ کر سکے۔ مشاہدے کی باریکی اور تشبیہ و استعارے کی ندرت کی وجہ سے وہ منظر نگار تو بن گئے، پیغمبرِ فطرت نہ بن سکے۔ چنانچہ ان کے یہاں فطرت نہ دخترِ دہقاں بن کر جلوہ گر ہے نہ کانن بالا کے روپ میں دکھائی دیتی ہے۔''

تاج دارِ صبح، البیلی صبح، بدلی کا چاند، آبشار، نغمۂ سحر، برسات کی چاندنی اور لیلیِ شب وہ لازوال نظمیں ہیں جو شاعرِ فطرت کی حیثیت سے جوشؔ کی حیاتِ دوام کی ضامن ہیں۔

﴿۳﴾ **شاعرِ شباب:** جوشؔ بنیادی طور پر شبابیات کے شاعر ہیں۔ مناظرِ فطرت سے متعلق ان کی بہت سی نظمیں صرف پس منظر کا کام کرتی ہیں اور یادوں کو بیدار کرتی ہیں، ان یادوں کو جب شاعر کو حسینوں کا وصال میسر تھا۔ جوش کا تصوّرِ عشق افلاطونی نہیں۔ افلاطونی محبت اسے کہتے ہیں جو جنسی آلائش سے پاک اور جسمانی وصال سے بے نیاز ہو۔ ان کا عشق کھلا ہوا مجازی عشق ہے جو وصلِ محبوب کا طلب گار ہے۔

ایک رباعی میں جوشؔ اپنے نظریۂ عشق کی وضاحت کھلے الفاظ میں کرتے ہیں:

اک جنس کا میلان ہے اور کچھ بھی نہیں اک جسم کا ہیجان ہے اور کچھ بھی نہیں
اے مردِ خدا رونے سے کیا عشق کو کام یہ خون کا ارمان ہے اور کچھ بھی نہیں

گویا جوشؔ کا عشق خالص ارضی ہے جس کا تعلق خون کی حرارت سے ہے۔اس لئے جوشؔ کے یہاں تصنع، بناوٹ اور ریاکاری نہیں۔ سیدھا سادھا دنیاوی عشق ہے جو ہر اچھی صورت سے ہو جاتا ہے اور دائمی نہیں رہتا۔

سچ تو یہ ہے کہ یہی عشق دنیا کی ریت ہے۔اور وہ جو مشہور کہاوت ہے کہ ''عشق نہ جانے جات کُجات'' جوشؔ اس پر پوری طرح کار بند نظر آتے ہیں۔ان کی نظمیں مالَن، جامن والیاں، کوہستانِ دکن کی عورتیں اس کی گواہ ہیں۔اور جو بن تو وہ چیز ہے کہ مہترانی پر آئے تو اسے رانی بنا دیتا ہے۔اپنی نظم ''مہترانی'' میں جوش صاف کہہ دیتے ہیں:

سچ ہے طوفانِ جوانی کو دَبا سکتا ہے کون سر شبابِ شعلہ پرور کا جھکا سکتا ہے کون

نسوانی حُسن سے متعلق ان کی دوسری اہم نظمیں ہیں ''اٹھتی جوانی، جوانی کی آمد آمد، نوجوانی کا تقاضا، جوانی کے دن، جوانی کی رات، جوانی کے ساز و برگ، چاند کے انتظار میں تارے، پہلی مفارقت، زرد کلیاں، جفائے وفا اور فتنۂ خانقاہ'' وغیرہ بہت سی نظمیں ہیں۔

جوشؔ کی آواز میں ایک نیا پن بھی ہے کہ اردو شاعری کا روایتی معشوق ظالم، بے وفا اور سنگ دل ہے۔لیکن جوشؔ کا معشوق بہت دل نواز ہے اور عاشق کے دامن کو وصال کی خوشیوں سے بھر دینے کا خواہش مند ہے۔تغافُل و سرد مہری کی جگہ معشوق کی الطاف و عنایات اُردو شاعری کے قاری کو ایک نیا تجربہ معلوم ہوتی ہیں۔محبوب کا سراپا بیان کرنے کا جوشؔ کو بھی شوق ہے کہ اس سے انہیں لطف حاصل ہوتا ہے اور اس میں انہیں مہارت بھی حاصل ہے۔مختلف شعری وسائل کے استعمال سے وہ محبوب کے سراپا کو نہایت دل کش بنا دیتے ہیں:

ہوا طبیعت کی رُخ بدل کر بھٹک رہی ہے نئی فضا میں کلی لڑکپن کی مسکرا کر نئے شگوفے کھلا رہی ہے
جھلکتی چاندی پہ کمسنی کی چڑھا رہا ہے شباب سونا سفید ہلکی سی چاندنی کو سحر گلابی بنا رہی ہے

یہاں جوشؔ حُسن کا ایسا نقشہ کھینچتے ہیں اور پوری شعری آداب کے ساتھ لیکن جوشؔ کی عشقیہ شاعری میں ایسے عریاں مضامین بھی شامل ہو جاتے ہیں جنہیں اخلاقی نقطۂ نظر سے قابل اعتراض کہا جا سکتا ہے مگر بقولِ اثر لکھنوی:

''یہ نظمیں آرٹ کے مکمل نمونے ہیں اور آرٹ اخلاق سے مکمل بے نیاز رہتا ہے اور رہے گا۔''

﴿۴﴾ عظیم فن کار: جوشؔ اردو زبان کے بہت بڑے شاعر اور عظیم فن کار ہیں۔ان کی شاعری کا کینوس بہت وسیع ہے۔ملک کو درپیش مسائل، تحریکِ آزادی، معاملاتِ حسن و عشق سبھی کچھ ان کی شاعری میں نظر آ جاتا ہے۔زبان و بیان کے اعتبار سے تو ان کی شاعری کا رتبہ اور بھی بلند ہے۔زبان پر اُنہیں حاکمانہ قدرت حاصل ہے۔بے پناہ الفاظ کا ذخیرہ اس طرح ان کے زیرِ فرمان ہے کہ اسے جس طرح چاہیں کام میں لاتے ہیں۔جس طرح سپاہی صفیں باندھے اپنے کمانڈر کے سامنے کھڑے رہتے ہیں اور بلا تأمّل اس کے ہر حکم کی تعمیل کرتے ہیں اسی طرح الفاظ جوشؔ کے آگے پَرا باندھے حاضر رہتے ہیں اور نظم میں اُنہیں جو منصب دیا جاتا ہے اسے بلا چون و چرا تسلیم کر لیتے ہیں۔اگر وہ کہیں صرف اسما کا استعمال کرنا چاہتے ہیں تو اسما، اور افعال کا استعمال کرنا چاہتے ہیں تو افعال بڑی تعداد میں ان کے سامنے حاضر ہو جاتے ہیں۔

اسی سلسلے میں شراب خانے کی ایک تصویر ملاحظہ ہو:

لات ، گھونسا ، چھڑی ، چھری ، چاقو لِب لباہٹ ، لعاب ، کف ، بدبو
شور ، ہوحق ، ابے تبے ، ہے ہے اوکھیاں ، گالیاں ، دھماکے ، قے
مسمساہٹ ، غشی ، تپش ، چکّر سوز ، سیلاب ، سنسنی ، صرصر
چل چخے ، چخ ، چناں چنیں ، چنگھاڑ چخ چخے ، چاؤں چاؤں ، چیل چلھاڑ
کھلبلی ، کاؤں کاؤں ، کھٹ منڈل ہونک ، ہنگامہ ، ہم ہمہ ، ہلچل

جوشؔ کی منظر نگاری بہت ہی دل آویز ہے۔ جوش کا مشاہدہ بہت گہرا اور وسیع ہے۔ وہ جب بھی کوئی منظر پیش کرتے ہیں تو اس کی تمام جزئیات ایسے بیان کرتے ہیں جیسے وہ کسی مقام پر کھڑے ہو کر اس منظر کو خود اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ اسی کی عکاسی کرتی ہوئی ان کی ایک نظم ہے جس کا عنوان ہے ''گرمی اور دیہاتی بازار''۔ شاعر تو کیا کسی نثر نگار نے بھی دیہاتی بازار کی ایسی منظر کشی نہیں کی ہوگی جیسی کہ جوشؔ کی اس نظم میں ہے۔ دیہاتی زندگی کا بہت قریب سے اور بہت گہرا مشاہدہ کیا اور نظم لکھتے ہوئے ان کے ذہن میں دیہاتی بازار کا پورا منظر اپنی پوری جزئیات کے ساتھ محفوظ تھا۔ اس نظم کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیے جن میں دیہاتی بازار کی مکمل عکاسی کی گئی ہے:

شور ، ہلچل ، غلغلہ ، ہیجان ، لو ، گرمی ، بخار بیل ، گھوڑے ، بکریاں ، بھیڑیں ، قطار اندر قطار
مکھیوں کی بھنبھناہٹ ، گُڑ کی بو ، مرچوں کی دھانس خربزے ، آلو ، کھلی ، گیہوں ، کدو ، تربوز ، گھانس
دھوپ کی شدّت ، ہوا کی یورشیں ، گرمی کی رَو کملیوں پر سرخ چاول ، ٹاٹ کے ٹکڑوں پہ جَو
گرم ذرّوں کے شدائد ، جھکڑوں کی سختیاں جھکڑوں میں کھانستے بوڑھوں کی چلموں کا دھواں

جوشؔ کی ایک نظم ہے جس کا عنوان ہے ''غریب الوطن کا پیام''۔ اس نظم میں ایک ایسے شخص کے جذبات بیان کیے گئے ہیں جو فطری مناظر سے دور شہر کے ہنگاموں کے درمیان اپنی زندگی گزارنے پر مجبور ہے۔ نظم کے آخری حصے کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

اے چاند جب ستارے گردوں پہ جھلملائیں جب قدرتی مناظر صحرا میں مسکرائیں
تاروں کی کشمکش میں جب چاندنی ہو پھیکی چادر سرک گئی ہو ماتھے سے جب کسی کی
بے داغ جب زمیں ہو اور آسمان کورا جب سینۂ اُفق پر غلطاں ہو سرخ ڈورا
مغموم جھاڑیوں سے میرا سلام کہنا آنکھوں میں اشک بھر کر پھر یہ پیام کہنا

جوشؔ فطرت اور اس کے مختلف مظاہر کے پرستار ہیں۔ چڑیوں کی چہچہاہٹ ہو یا آسمان پر چھائی ہوئی گھٹا، برسات کی رم جھم ہو یا شفق کا منظر، دیہاتی بہار ہو یا زمین پر موتی بکھیرتی ہوئی آبشار وغیرہ جوشؔ کے لئے فقط بے جان چیزیں نہیں بلکہ زندہ وجود کی مانند ہیں۔ جوشؔ کا عقیدہ ہے کہ جنگل، گلشن اور فطرت سے جو محبت اور خلوص انسان کو ملتا ہے وہ انسانوں سے نہیں ملتا۔ دوست بے وفا ہو سکتے ہیں لیکن فطرت کبھی بے وفائی نہیں کرتی۔ انسان سے فطرت کی دوستی ہمیشہ قائم رہتی ہے۔

جوشؔ کو پیکر تراشی میں بھی بڑی مہارت حاصل ہے۔ ماقبل میں آپ شراب خانے کی تصویر ملاحظہ کر چکے ہیں کیسی جیتی جاگتی اور حقیقی تصویر ہے۔ تشبیہ واستعارے کے جوشؔ بادشاہ ہیں۔ اوران فنی تدابیر سے پیکر تراشی میں بہت مدد ملتی ہے۔ مثال ملاحظہ ہو:

دن ہے فولاد ، سنگ ، تیغ ، علم رات کم خواب ، پنکھڑی ، شبنم

دن بہادر کا بان ، بیر کا رتھ رات چمپا کلی ، انگوٹھی ، نتھ

ایک ایک چیز کو دس دس چیزوں سے تشبیہ دینا جوشؔ کا ہی خاصہ ہے۔ شعری وسائل کے فن کارانہ استعمال سے جوشؔ نے اپنے کلام میں کیسی دل کشی ورعنائی پیدا کردی ہے۔ ان کے ناقدوں کا یہ الزام درست ہے کہ ان کا تصوّرِ انقلاب ناقص اوران کا فلسفہ کھوکھلا ہے لیکن شاعری میں فلسفۂ فکر کی اہمیت ثانوی ہے۔ اصل چیز یہ ہے کہ شاعر نے شعری آداب کا کس حد تک لحاظ کیا ہے۔ جوشؔ کے سخت سے سخت مخالف بھی یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہیں کہ انہوں نے فنی تقاضوں کو نظر انداز نہیں کیا۔ اسی لئے عہدِ حاضر کے نظم گو شعرا میں جوشؔ کو ایک بلند مقام اور آفاقی حیثیت حاصل ہے۔

08.05 نظم ''بدلی کا چاند'' متن

خورشید وہ دیکھو ڈوب گیا ظلمت کا نشاں لہرانے لگا مہتاب وہ ہلکے بادل سے چاندی کے ورق برسانے لگا

وہ سانولے پن پر میداں کے ہلکی سی صباحت دوڑ چلی تھوڑا سا اُبھر کر بادل سے وہ چاند جبیں جھلکانے لگا

لو ڈوب گیا پھر بادل میں ، بادل میں وہ خط سے دوڑ گئے لو پھر وہ گھٹائیں چاک ہوئیں ،ظلمت کا قدم تھرّانے لگا

بادل میں چھپا تو کھول دیے بادل میں دریچے ہیرے کے گردوں پہ جو آیا تو گردوں ، دریا کی طرح لہرانے لگا

سمٹی جو گھٹا تاریکی میں ، چاندی کے سفینے لے کے چلا سنکی جو ہوا تو بادل کے گرداب میں غوطے کھانے لگا

غرفوں سے جو جھانکا گردوں کے،امواج کی نبضیں تیز ہوئیں حلقوں سے جو دَوڑا بادل کے ،کہسار کا سر چکرانے لگا

پردہ جو اُٹھایا بادل کا ، دریا پہ تبسم دوڑ گیا چلمن جو گرائی بدلی کی ، میدان کا دل گھبرانے لگا

اُبھرا تو تجلّی دوڑ گئی ، ڈوبا تو فلک بے نور ہوا اُلجھا تو سیاہی دوڑا دی ، سلجھا تو ضیا برسانے لگا

کیا کاوشِ نور وظلمت ہے؟ کیا قید ہے؟ کیا آزادی ہے؟ انساں کی تڑپتی فطرت کا مفہوم سمجھ میں آنے لگا

08.06 نظم ''بدلی کا چاند'' تجزیہ

جوشؔ ملیح آبادی کو منظر نگاری پر ایسی قدرت حاصل ہے کہ جس کی نظیر اردو میں مشکل سے ہی ملے گی۔ اس نظم میں جوشؔ سورج ڈوبنے کا منظر پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ دیکھو سورج ڈوب گیا ہے اور دنیا تاریکی میں ڈوب گئی ہے اور چاند بادلوں کی اوٹ سے اس طرح سے اپنی شعائیں زمین سے بکھیر رہا ہے جیسے چاند بادلوں سے چاندی کے ورق برسا رہا ہے۔ جوشؔ نے اپنے خاص لہجے میں شام کے وقت کی بڑی خوب صورت تصویر پیش کی ہے۔ آگے کہتے ہیں کہ شام کا وقت ہے، میدانوں کا رنگ سانولا ہے اور شام ہونے کی وجہ سے میدان پر ہلکی سی سیاہی کی چادر بچھ گئی ہے۔ اس فضا میں چاند بادلوں سے ایسے جھانک رہا ہے جیسے کالی چادر میں کسی حسین مہ جبین کا ماتھا دکھائی دے رہا ہو۔ اب کہتے ہیں کہ چاند کی روشنی کے خطوط نظر آنے لگے ہیں اور پھر گھٹائیں چاک ہونے لگی ہیں۔ چاند اس طرح باہر آ گیا کہ اندھیرے کے قدم

ڈگمگانے لگے اور جب بادل کے بیچ گھر جاتا ہے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے بادل کے اندر ہیرے چمک رہے ہیں اور گردوں میں جب آیا تو دریا کی طرح لہرانے لگا۔ گھٹا، تاریکی میں سمٹنے لگی، چاندی کے سفینے لے کر چلنے لگا اور ہوا جو سنکی تو بادل گرداب میں پھنس کر غوطے کھانے لگا۔ اور جب گردوں کے دریچوں سے جھانکا تو موجوں کی نظریں تیز ہوئیں۔ جب بادلوں کے حلقوں سے دوڑا تو پہاڑیوں کا سر چکرانے لگا۔ بادل نے جب پردہ اُٹھایا تو دریا مسکرانے لگے اور بدلی کی جب چلمن گرائی تو میدانوں کا دل گھبرانے لگا اور نکلا تو روشنی سے دنیا منور ہوگئی اور ڈوبا تو آسمان بے نور ہوگیا یعنی بادلوں میں اُلجھا تو اندھیرا ہوگیا اور سلجھا تو روشنی برسانے لگا۔ آخر میں جوشؔ کہتے ہیں کہ روشنی اور تاریکی کی کیا کاوشیں ہیں؟ کیا قید ہے؟ اور کیا آزادی ہے؟ اب انسان کی تڑپتی ہوئی فطرت کا مفہوم میری سمجھ میں آنے لگا ہے۔

08.07 نظم ''شکستِ زنداں کا خواب''، متن

کیا ہند کا زنداں کانپ رہا ہے، گونج رہی ہیں تکبیریں — اُکتائے ہیں شاید کچھ قیدی اور توڑ رہے ہیں زنجیریں
دیواروں کے نیچے آ آ کر یوں جمع ہوئے ہیں زندانی — سینوں میں تلاطم بجلی کا، آنکھوں میں جھلکتی شمشیریں
بھوکوں کی نظر میں بجلی ہے، توپوں کے دہانے ٹھنڈے ہیں — تقدیر کے لب کو جنبش ہے، دَم توڑ رہی ہیں تدبیریں
آنکھوں میں گدا کی سرخی ہے، بے نور ہے چہرہ سلطاں کا — تخریب نے پرچم کھولا ہے، سجدے میں پڑی ہیں تعمیریں
کیا ان کو خبر تھی؟ زیر و زبر رکھتے تھے جو رُوحِ ملت کو — اُبلیں گے زمیں سے مارِ سیہ، برسیں گی فلک سے شمشیریں
کیا ان کو خبر تھی؟ سینوں سے جو خون چرایا کرتے تھے — اک روز اسی بے رنگی سے جھلکیں گی ہزاروں تصویریں
کیا ان کو خبر تھی؟ ہونٹوں پر جو قفل لگایا کرتے تھے — اک روز اُسی خاموشی سے ٹپکیں گی دہکتی تقریریں
سنبھلو! کہ وہ زنداں گونج اٹھا، جھپٹو! کہ وہ قیدی چھوٹ گئے — اُٹھو! کہ وہ بیٹھیں دیواریں، دوڑو! کہ وہ ٹوٹیں زنجیریں

08.08 نظم ''شکستِ زنداں کا خواب''، تجزیہ

جوشؔ کی اِس نظم ''شکستِ زنداں کا خواب'' کا شمار اردو کی بہترین نظموں میں ہوتا ہے۔ نظم میں انقلاب کی گھن گرج صاف سنائی دیتی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ہندوستانی، برطانوی حکومت کے خلاف شعلے برسا رہے ہیں۔ جوشؔ کہتے ہیں کہ ہندوستان کے قید خانے کانپ رہے ہیں اور نعروں سے زندان کے در و دیوار گونج رہے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ کچھ قیدی اپنی قید سے اُکتا کر اپنی زنجیریں توڑ رہے ہیں اور دیواروں کی نیچے آ آ کر جمع ہو رہے ہیں۔ ان کے سینوں میں بجلی کا سا تلاطم برپا ہے اور آنکھوں میں شمشیریں دکھائی دے رہی ہیں۔ بھوکوں کی نظر میں بجلی ہے اور توپوں کے دہانے ٹھنڈے پڑے ہیں۔ آج تقدیر کے لبوں کو بھی جنبش ہے تبھی تو تدبیریں بھی دَم توڑ رہی ہیں اور آج گداؤں کی آنکھوں میں سرخی ہے اور بادشاہوں کا چہرہ بھی بے نور ہوگیا ہے۔ تخریب نے پرچم کھول دیا ہے اور تعمیرات گر کر سجدہ کر رہی ہیں۔ جو ملّت کو زیر و زبر رکھتے تھے ان کو شاید خبر نہیں تھی کہ یوں بھی طوفان آ سکتا ہے اور ایک دن زمین سے مارِ سیہ نکلیں گے اور فلک سے شمشیریں برس جائیں گی۔ برطانوی حکومت جو ہندوستانیوں کے سینے سے خون چرایا کرتی تھی یعنی اتنا ظلم کرتی تھی کہ وہ حکومت کے خلاف کوئی قدم اُٹھانے کے قابل نہ رہیں، ان کو خبر نہیں تھی کہ جب ظلم کی انتہا ہو جاتی ہے تو مظلوم موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ظلم کے خلاف ہتھیار اٹھا لیتے ہیں۔ ہندوستانیوں کے سینوں سے سارا خون چرا لیا تھا اب اسی بے رنگی سے ہزاروں تصویریں اُبھر رہی ہیں۔ برطانوی سامراج نے اپنے

طاقت کے بَل بوتے پر مظلوم ہندوستانیوں کے منہ پر تالے ڈال رکھے تھے اور وہ حکومت کے مظالم برداشت کر رہے تھے۔اب ہر طرف عوام میں حکومت کے خلاف ایسی تقریریں ہو رہی ہیں جن سے شعلے برس رہے ہیں۔آخری شعر میں جوشؔ انقلاب کی وہ تصویر کھینچتے ہیں جس میں قیدی اپنا حق لینے کے لئے موت سے بھی ٹکر لینے کو تیار ہیں۔جوشؔ برطانوی حکومت سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ تم نے جس قید خانے میں غلاموں کو ڈال رکھا تھا اب وہ انقلاب کی صداؤں سے گونج رہا ہے۔اگر سنبھل سکتے ہو تو سنبھل جاؤ اب قیدی قید خانے کی دیواریں توڑ کر باہر آ رہے ہیں۔تم نے جو غلاموں کے پیروں میں زنجیریں ڈالی تھیں وہ ٹوٹ رہی ہیں۔خلاصہ یہ ہے کہ جنگِ آزادی کے مجاہد ظلم وستم کے خلاف کھڑے ہو گئے ہیں اور اب تمہاری غیر معمولی طاقت بھی انہیں آزاد ہونے سے نہیں روک سکتی۔جوشؔ کی یہ نظم انقلاب کے موضوع پر بے مثال ہے۔

08.09 خلاصہ

درّۂ خیبر میں یار بیگ خاں نام کے ایک سردار تھے جن کے دو بیٹے محمد نام دار خاں اور محمد بلند خاں تھے۔محمد بلند خاں کے دو بیٹے محمد عوض خاں اور فقیر محمد خاں تھے۔محمد بلند خاں اپنے دونوں بیٹوں کے ہم راہ ہندوستان آ گئے اور ضلع فرخ آباد کے قائم گنج میں رہائش پذیر ہوئے۔کچھ عرصے کے بعد محمد بلند خاں اودھ کے نواب غازی الدین حیدر کے پاس چلے گئے۔نواب نے انہیں اپنی فوج میں تین سو روپے ماہ وار پر ملازم رکھ لیا۔محمد بلند خاں کے دوسرے بیٹے فقیر محمد خاں بڑے بہادر اور عالم وفاضل تھے یہ شاعر تھے اور جوشؔ کے پردادا تھے۔ان کے بیٹے کا نام محمد احمد خاں بہادر تھا یہ جوشؔ کے دادا ہیں۔انہیں اپنے باپ سے وراثت میں بے انتہا دولت ملی تھی۔یہ بھی بہت اچھے شاعر تھے ان کے دیوان کا نام ''دیوانِ احمد'' تھا جو کہ پانچ سو صفحات پر مشتمل تھا۔جوشؔ کے والدِ محترم نواب بشیر احمد خاں تھے یہ بھی شاعر تھے اور بشیرؔ تخلص کرتے تھے۔انہوں نے زندگی بھر ملازمت نہیں کی۔اردو ان کی مادری زبان تھی اور فارسی پر انہیں بہت قدرت حاصل تھی۔سعدیؔ، حافظؔ اور فردوسیؔ کا پورا کلام اُنہیں یاد تھا۔نواب بشیر احمد خاں کے بیٹے شبیر حسن خاں ہیں جن کا تخلص جوشؔ ہے۔

جوشؔ ۵؍دسمبر ۱۸۹۸ء کو ملیح آباد میں پیدا ہوئے گھر پر ابتدائی تعلیم مکمل ہونے کے بعد انہیں مزید تعلیم کے لئے سیتا پور بھیج دیا جہاں انہیں فرنچ ایچ اسکول میں داخل کر دیا گیا۔ڈیڑھ سال بعد جوشؔ کو سیتا پور سے بلا کر لکھنؤ کے جوبلی اسکول میں داخل کر دیا گیا پھر انہوں نے لکھنؤ کے چرچ مشن اسکول اور ریڈ کرسچین اسکول میں تعلیم پائی۔اس کے بعد مزید تعلیم کے لئے علی گڑھ گئے۔شرارتوں کی وجہ سے اُنہیں نکال دیا گیا اور آگرہ آ گئے جہاں انہوں نے پیٹرز کالج میں سینئر کالج تک تعلیم پائی۔نو برس کی عمر میں جوشؔ نے شاعری کا آغاز غزل گوئی سے کیا۔

جوشؔ کے والدِ محترم نہیں چاہتے تھے کہ جوشؔ شاعری کریں اس لئے جوشؔ چوری چھپے شعر کہتے تھے مگر کچھ واقعات ایسے ہوئے کہ ان کے والدِ محترم نے جوشؔ کو شعر گوئی کی اجازت دے دی۔والدِ محترم کے انتقال کے بعد جوشؔ شعر وشاعری میں ایسے مصروف ہوئے کہ ان کے ملازمین نے جائیداد کا بہت بڑا حصہ غصب کر لیا۔جب جوشؔ کو ہوش آیا تو ان کے پاس کچھ باقی نہیں تھا۔مجبوراً انہیں ملازمت کی تلاش میں حیدر آباد جانا پڑا جہاں عثمانیہ یونی ورسٹی کے دارالترجمہ میں مترجم کے طور پر ان کا تقرّر ہو گیا۔تقریباً سات آٹھ سال حیدر آباد میں رہے۔جوشؔ کی ایک نظم سے حیدر آباد کے نواب ایسے کبیدہ خاطر ہوئے کہ جوشؔ کو حیدر آباد چھوڑنے کا فرمان صادر کر دیا۔اس کے بعد فلموں اور ماہ نامہ ''آج کل'' میں کام کیا۔اس کے بعد پاکستان چلے گئے، جہاں ان کی وہ پذیرائی نہیں ہوئی جس کے وہ مستحق تھے۔

۲۲ر فروری ۱۹۸۲ء میں ان کا اسلام آباد میں انتقال ہوگیا۔ انقلابی شاعری کے تعلق سے کہا جاتا ہے کہ جنگِ آزادی کی جدوجہد میں جوشؔ سے زیادہ کسی نے فکر انگیز اور شعلہ انگیز نظمیں نہیں کہیں۔ جوشؔ نے انقلابی شاعری میں برطانوی حکومت کے خلاف بغاوت کے شعلے اُگلے ہیں۔ ان کی نظموں سے مجاہدوں کی ہمت بڑھتی تھی اور برطانوی حکومت سے ٹکر لینے کا حوصلہ ملتا تھا۔

جوشؔ کا دوسرا موضوع فطرت نگاری تھا۔ جوشؔ کو فطری مناظر بہت پسند تھے۔ اردو میں فطرت نگاری کی روایت بہت قدیم ہے۔ جوشؔ کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ انہوں نے فطرت نگاری کے فن کو عروج پر پہنچا دیا ہے۔ جوشؔ کا مشاہدۂ فطرت بہت وسیع اور گہرا تھا۔ وہ فطرت کے مناظر سے لطف اندوز ہوتے تھے اور فطرت کی ہر شے میں ایسا حُسن دیکھتے تھے اور ایسی لطافت پاتے تھے جس سے دل و دماغ کو فرحت و سُرور حاصل ہوتا ہے۔ میر انیسؔ کے بعد جوش وہ واحد شاعر ہیں جنہیں زبان پر غیر معمولی قدرت حاصل تھی۔

وہ منظر کشی میں خوب صورت استعاروں، نادر تشبیہوں اور اچھوتے تخیل سے کام لے کر کسی بھی منظر کو زندہ و جاوید کر دیا کرتے تھے اس اکائی میں جوشؔ کی فطرت نگاری سے متعلق نظم ''بدلی کا چاند'' اور انقلابی شاعری سے متعلق نظم ''شکستِ زنداں کا خواب'' پیش کی گئی ہیں جو کہ نہایت لاجواب ہیں۔ پروفیسر آل احمد سرور نے جوشؔ کی نظم نگاری پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا: جوشؔ کی حُسن کاری میں کلام نہیں۔ ان کی تشبیہات جان دار، دل کش اور معنی خیز ہوتی ہیں۔ ان کا تخیّل لالہ کار ہے مگر دور رَس نہیں۔ انسانیت سے اس قدر گہری محبت اور اس کے روشن مستقبل پر یقینِ محکم نے ان کے کلام میں بڑی آب و تاب پیدا کر دی ہے۔ جوشؔ کسی بھی موضوع پر نظم کہتے ہیں تو الفاظ و بیان پر اپنی پوری قدرت کا استعمال کرتے ہیں۔ تشبیہات و استعارات اور نئے نئے الفاظ کے استعمال میں اردو کا کوئی بھی شاعر ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ جوشؔ کے پاس الفاظ کا اتھاہ سمندر ہے۔ جوشؔ شاعرِ فطرت، شاعرِ انقلاب اور شاعرِ شباب بھی ہیں اور انہیں منظر نگاری میں بھی کمال حاصل ہے۔

08.10 فرہنگ

آبشار	: جھرنا	شگاف	: رخنہ، دراڑ
آہنی عزم	: پختہ ارادہ	شگوفے	: کلیاں
اصرار	: ضد	طنطنہ	: کرّ وفر، نقارہ کی آواز
بیش بہا	: قیمتی	غرفوں	: کمروں، غرفہ کی جمع
جوبن	: جوانی	کہسار	: پہاڑی علاقہ
دائمی	: ہمیشہ	مربوط	: بندھا ہوا
زمزمہ	: گیت، نغمہ	مفارقت	: جدائی
سبک	: ہلکا	ہجرت	: ترکِ وطن، ایک جگہ سے دوسری جگہ جانا
سرد مہری	: محبت کے بغیر	ہیجان	: جوش و خروش، بھڑک

08.11 سوالات

مختصر سوالات

سوال نمبر ۱ : جوشؔ شاعرِ فطرت ہیں اس پر تبصرہ کیجیے؟

سوال نمبر ۲ : جوشؔ کی تعلیم وملازمت کے بارے میں بتایئے؟

سوال نمبر ۳ : جوشؔ کی نظم ''بدلی کا چاند'' پر اپنی معلومات کا اظہار کیجیے؟

سوال نمبر ۴ : جوشؔ کے والدِ گرامی کے بارے میں ایک مضمون لکھیے؟

تفصیلی سوالات

سوال نمبر ۱ : جوشؔ کی نظم نگاری پر ایک تفصیلی مضمون لکھیے؟

سوال نمبر ۲ : جوشؔ کے حالاتِ زندگی پر ایک مفصل مضمون لکھیے؟

سوال نمبر ۳ : جوشؔ کی انقلابی شاعری سے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیجیے؟

سوال نمبر ۴ : نظم ''شکستِ زنداں کا خواب'' کا خلاصہ اپنے الفاظ میں تحریر کیجیے؟

معروضی سوالات

سوال نمبر ۱ ''دیوانِ احمد'' کس کا دیوان ہے؟

(الف) محمد نامدار خاں (ب) بلند خاں (ج) فقیر محمد خاں (د) محمد احمد خاں

سوال نمبر ۲ گویاؔ کس کا تخلص تھا؟

(الف) بلند خاں (ب) فقیر محمد خاں (ج) محمد احمد خاں (د) محمد نامدار خاں

سوال نمبر ۳ جوشؔ کی ولادت کب ہوئی؟

(الف) ۱۸۹۴ء (ب) ۱۸۹۶ء (ج) ۱۸۹۸ء (د) ۱۹۰۰ء

سوال نمبر ۴ جوشؔ نے کس عمر میں شعر کہنا شروع کیا؟

(الف) ۸ر برس (ب) ۹ر برس (ج) ۱۱ر برس (د) ۱۲ر برس

سوال نمبر ۵ جوشؔ کا انتقال کس شہر میں ہوا؟

(الف) اسلام آباد (ب) کراچی (ج) راول پنڈی (د) کوئی نہیں

سوال نمبر ۶ جوشؔ تقریباً کتنے برس حیدرآباد میں رہے؟

(الف) پانچ۔چھ (ب) چھ۔سات (ج) سات۔آٹھ (د) آٹھ۔نو

معروضی سوالات کے جوابات

جواب نمبر۱ : (د) محمد احمد خاں
جواب نمبر۲ : (ب) فقیر محمد خاں
جواب نمبر۳ : (ج) ۱۸۹۸ء
جواب نمبر۴ : (ب) ۹/برس
جواب نمبر۵ : (الف) اسلام آباد
جواب نمبر۶ : (ج) سات۔آٹھ

08.12 حوالہ جاتی کتب

۱۔ یادوں کی بارات از جوشؔ ملیح آبادی
۲۔ جوشؔ ملیح آبادی خصوصی مطالعہ از مرتب: قمر رئیس
۳۔ جوشؔ ملیح آبادی تنقیدی جائزہ از مرتب: خلیق انجم
۴۔ اردو شاعری کا تنقیدی مطالعہ از سنبل نگار
۵۔ جدید شاعری از عبادت بریلوی

اُتراکھنڈ اوپن یونی ورسٹی، ہلدوانی (نینی تال)

SCHOOL OF HUMANITIES

UTTARAKHAND OPEN UNIVERSITY

Teenpani Bypass Road, Behind Transport Nagar

Haldwani - 263 139, Nainital (Uttrakhand)

Phone: 05946-261122, 261123 Fax No.: 05946-264232

www.uou.ac.in email: info@uou.ac.in

Toll Free No: 1800 180 4025

MAUL-502-1(003895)